بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مدیراعلیٰ ـــــ منزہ سہام

گروپ ایڈیٹر ـــــ ناصر رضا

ایڈورٹائزنگ منیجر ـــــ زین شمسی

انکم ٹیکس ایڈوائزر ـــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

ستمبر 2017ء
جلد:45 ☆ شمارہ:09
قیمت:60 روپے

خط وکتابت کا پتا

II 88-C ـ فرسٹ فلور ـ خیابان
جامی کمرشل ـ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ـ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

منیجر سرکولیشن: آفتاب عالم ...... رابطہ: 03343193174

عیدالاضحیٰ مبارک

افسانے

ناولٹ

دوشیزہ میگزین

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

ہاں میں پاکستانی ہوں

میں نے پوچھا ہجرت کیوں کی؟

کہا قائداعظم کا حکم تھا۔

میں نے پوچھا اپنی زمین چھوڑ دی؟

کہا اپنی زمین پر ہی تو آئے تھے۔

میں نے پھر پوچھا گھربار زمین' اجداد کی قبریں کچھ یاد نہیں آتا؟

اپنی چھت ہے' پیروں کے نیچے اپنی زمین ہے اور اولاد کی صورت تم لوگوں نے کبھی ماضی کو یاد کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔

میں نے پھر پوچھا علاج کے لیے باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔

کہا مجھے اپنے اسپتالوں' اپنے ڈاکٹروں پر بھروسہ ہے اور اب ایک اور ہجرت کی ہمت نہیں۔

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئے تھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جائیں گے......اور بیٹی حالات کیسے بھی ہوں مشکلات کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہوں سامنا کرنا۔ حالات کا رخ بدلنا...مگر اپنا وطن کبھی مت چھوڑنا......تم پاکستانی ہو یہ ثابت کرنے میں اگر جان بھی چلی جائے تو سودا مہنگا نہیں......نم آنکھوں اور لہولہو جگر کے ساتھ میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میری جان چلی گئی مگر میں نے یہ زمین نہ چھوڑی کیونکہ میں پاکستانی ہوں۔

(اُن بے شمار پاکستانیوں کے نام جو علاج معالجے کی سہولیات نہ ہونے کے باعث دنیا سے چلے گئے کیونکہ اُن کے پاس لندن جانے کے وسائل نہیں ہوتے)

منزہ سہام

زادِراہ

ام ایمان (غزالہ عزیز)

غلام جو سردار بنے

حضرت عمّار بن یاسرؓ

حضرت عمار بن یاسرؓ وہ صحابیٔ رسول ہیں جن کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، محبوبِ خداؐ نے ''طیب المطیب'' (پاکیزہ مصفا انسان) کے لقب سے نوازا۔

جن کے لیے سرورِ کائناتؐ نے فرمایا۔ ''جو عمار کو برا کہتا ہے اللہ اس کو برا کہتا ہے۔ جو عمار کو مبغوض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہوتا ہے اور جو عمار کی تحقیر کرتا ہے اللہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔''

اللہ اللہ یہ الفاظ ان کے لیے تھے جو اسلام لانے سے قبل مکہ میں کسی بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے نہ کوئی اہم اور نمایاں شخصیت تھے۔ بلکہ ان کی والدہؓ ابو جہل کی لونڈی تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں پورا خاندان غلامی کی حالت میں لرزہ خیز مظالم برداشت کررہا تھا۔

بلاذری نے ام ہانیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن جب چار افراد کا یہ کنبہ کفار کے ہاتھوں اذیتیں جھیل رہا تھا تو رسول اللہؐ کا گزر ادھر سے ہوا۔ ان کو اتنی تکلیف میں دیکھ کر آپ کو سخت رنج ہوا۔

آپؐ نے فرمایا:

''صبر کرو اے آلِ یاسر! تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔''

حضرت عمارؓ کے والد یاسرؓ اور والدہ سمیہؓ دونوں ہی بہت ضعیف اور بوڑھے ہوگئے تھے لیکن مشرکین مکہ جو اپنے قریبی عزیزوں کا لحاظ نہ کرتے تھے، وہ اس غریب الوطن بے یارومددگار کنبہ کو کیسے چھوڑ دیتے۔

وہ ظالم ان مظلوموں کو لوہے کی بھاری زرہیں پہنا کر مکہ کی جلتی دھوپ میں کھڑا کردیتے۔ ان کو دھوپ میں لٹا کر اوپر بھاری پتھر کی سل رکھ دیتے، کبھی کبھی انگاروں کو دہکا کر اس پر ان کو لٹا دیا جاتا یہاں تک کہ انگارے انہی کی چربی سے ٹھنڈے ہوجاتے۔ یہ سارے مظالم کفار مکہ کے روز کے معمولات میں شامل تھے۔

لیکن ان تمام مظالم کے باوجود یہ سعادت مند خاندان اسلام سے پھرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ

کے ساتھ اس مقام سے گزرا جہاں اس خاندان کو اذیت دی جا رہی تھی حضور اکرمؐ نے فرمایا "صبر کرو۔" ......"اے اللہ آلِ یاسرؓ کی مغفرت فرما اور تو نے ان کی مغفرت کر ہی دی۔"

مظالم سہتے سہتے اس خاندان کے سربراہ حضرت یاسرؓ جو حضرت عمارؓ کے والد تھے ایک دن جاں سے گزر گئے اور کامیابی پا کر اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ ان کی والدہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے اتنی اذیت کا نشانہ بنائے رکھا۔ ایک دن غصے میں اس نے حضرت سمیہؓ کے نازک مقام پر اپنا برچھا کھینچ مارا جس کی ضرب سے آپؓ شہید ہو گئیں۔ یہ عہد رسالتؐ کی پہلی شہادت تھی جو راہِ حق میں واقع ہوئی۔ خواتین کے لیے قابل فخر ہے یہ بات کہ اسلام کی پہلی شہید ایک خاتون تھیں۔

والد حضرت یاسر پہلے ہی مظالم سہتے سہتے گزر چکے تھے والدہ نے ایسی بیکسی کے عالم میں شہادت پائی۔ اب ایک بھائی عبداللہؓ رہ گئے تھے انہیں بھی ظالم ابوجہل نے تیر مار کر شہید کر دیا۔

اب حضرت عمارؓ تنہا رہ گئے تھے آپؓ اپنے خاندان کی ایسی بے کسی کی موت پر بہت غمگین تھے۔ روتے ہوئے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضور اکرمؐ نے دلاسا دیا اور فرمایا "یا اللہ آلِ یاسرؓ کو دوزخ سے بچا۔"

کنبہ کے تمام افراد کی شہادت کے بعد اب عمارؓ تنہا رہ گئے تھے جنہیں کفار بدستور ظلم و جبر کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ مشرکین نے ان کو پانی میں اس قدر غوطے دیئے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ کفار نے ان سے کچھ نازیبا کہلوا لیے جن میں حضورؐ کا انکار اور بتوں کی تعریف تھی۔

جب کفار نے ان کو چھوڑا تو سیدھے بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ زار و قطار رو رہے تھے۔ حضورؐ نے وجہ دریافت کی تو عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! بہت بڑی برائی! مجھے ان ظالموں نے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک آپؐ کے حق میں نازیبا کلمات نہ کہلوا لیے۔"

حضور اکرمؐ نے پوچھا "تم اپنے دل کی کیا کیفیت پاتے ہو؟"

عرض کیا "یا رسول اللہؐ میرا دل ایمان باللہ اور بالرسولؐ پر راضی اور خوش ہے۔" حضورؐ نے محبت سے ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور فرمایا۔

"کوئی حرج نہیں اگر آئندہ بھی ایسا موقع ہو اور وہ تم سے اس طرح کا مطالبہ کریں تو جان بچانے کے لیے ایسا کر لینا۔"

چنانچہ بعد میں سورہ نحل میں اس بات کی تائید کی گئی جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے گا مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے (اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔)

مدینہ ہجرت سے ایک ماہ پہلے تک کفار کے مظالم برداشت کرتے رہے اور پھر بالآخر ہجرت نبویؐ سے کچھ پہلے مدینہ ہجرت کر گئے۔ حضرت یاسرؓ نے کچھ عرصہ پہلے اصحابِ صفہ کے ساتھ ان کے چبوترے پر گزارا پھر رسول اللہؐ نے ان کو ایک قطعہ زمین مستقل رہائش کے لیے عنایت کر دیا۔

مسجد قبا کی تعمیر میں حضرت یاسرؓ نے بڑے ذوق وشوق اور تندہی سے حصہ لیا۔ پتھروں کو جمع کرنا اور ان کو ڈھانا، پھر اینٹوں کے گارے کا انتظام آپؓ ہی نے کیا۔ حضرت عمار دین حق کے سچا جاں نثار اور محبوبِ خداؐ کے جاں سوز عاشق تھے۔ وہ بدر سے لے کر تبوک تک ہر جنگ میں اپنے آقاؐ کے ساتھ ساتھ رہے اور ہر غزوہ میں بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ آپ غزوات کے علاوہ چھوٹی موٹی مہمات میں بھی شرکت کرتے رہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی امارت میں ایک مہم بھیجی اس مہم میں حضرت عمارؓ

بھی شریک تھے۔ جب لشکر روانہ ہوا۔ اس قبیلہ کے پاس پہنچا جس سے جنگ کرنی تھی تو رات ہوگئی تھی لہذا وہیں پڑاؤ ڈال دیا گیا۔

صبح ہوئی تو تمام قبیلہ مسلمانوں کے لشکر کی آمد کا سن کر بھاگ گیا البتہ ایک آدمی وہیں ٹھہرا رہا۔ کیونکہ وہ اور اس کے گھر والے اسلام لا چکے تھے۔

اس آدمی نے اس خیال سے اپنے اہل خانہ کو اور سامان کو بھی اپنی سواریوں پر لا دلیا اور پھر اپنے گھر والوں سے کہا کہ ذرا ٹھہرو میری واپسی کا انتظار کرو۔

اس کے بعد وہ مسلمانوں کے پڑاؤ میں آیا اور آ کر حضرت عمارؓ سے ملا اور ان سے کہا میں اور میرے گھر والے اسلام لا چکے ہیں۔ کیا یہ بات مجھے نفع پہنچائے گی؟ میری قوم تو تم لوگوں کی آمد کا سن کر بھاگ گئی ہے۔

حضرت عمارؓ نے اس سے کہا کہ تو ٹھہر جا تجھے امن ہے۔ چنانچہ وہ آدمی اور اس کے گھر والے اپنے گھر میں ٹھہر گئے۔ علی الصبح جب حضرت خالدؓ نے اپنے سواروں کے ساتھ بستی کا گھیراؤ کیا تو دیکھا کہ سب لوگ بھاگ چکے ہیں بس ایک آدمی اپنے گھر والوں کے ساتھ موجود ہے انہوں نے اس آدمی کو اس کے گھر والوں کے ساتھ پکڑ لیا۔

حضرت عمارؓ نے حضرت خالدؓ کو روکا اور کہا کہ تمہیں اس آدمی کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ یہ اسلام لا چکا ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا کہ تمہیں اس آدمی سے کیا واسطہ ہے؟ کیا تم اسے پناہ دو گے حالانکہ امیر لشکر میں ہوں۔

حضرت عمارؓ نے کہا ہاں میں پناہ دوں گا خواہ تم امیر ہو یہ آدمی ایمان لا چکا ہے اور اگر یہ چاہتا تو اور لوگوں کی طرح بھاگ جاتا لیکن میں نے اس کو اس کے اسلام کی وجہ سے ٹھہر جانے کا مشورہ دیا۔

معاملہ کچھ الجھ گیا۔ جب حضرت خالدؓ اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ پہنچے تو دونوں نے بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہو کر سارا معاملہ بیان کیا۔ آپؐ نے حضرت عمارؓ کی پناہ برقرار رکھی البتہ آئندہ کے لیے ہدایت فرمائی کہ کوئی امیر کے مشورہ اور اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہ دے۔

لیکن معاملہ ٹھنڈا نہ ہوا اور آپؐ کے سامنے بھی دونوں میں کچھ تیزی ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے غصہ کے عالم میں کہا ”یا رسول اللہ آپ کے سامنے یہ غلام مجھے سخت سست کہہ رہا ہے خدا کی قسم آپؐ نہ ہوتے تو اس میں یہ جرات نہ ہوتی۔“

حضور اکرمؐ نے فرمایا ”خالد عمار سے رک جاؤ جو عمار کو برا کہتا ہے اور جو عمار پر غصہ ہوتا ہے اللہ اس پر غصہ ہوتا ہے اور جو عمار کی تحقیر کرتا ہے اللہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔“

اس کے بعد عمارؓ وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔ حضرت خالدؓ پریشانی کے عالم میں ان کے پیچھے لپکے ان کے کپڑوں کو پکڑ کر ان کو منانے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت عمارؓ ان سے راضی ہوگئے۔

ایک غلام کا اپنی بات کو منوانے کے لیے جب کہ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو یہ وہ جرات تھی جو اسلام نے اس کو عطا کی۔ پھر ان کے لیے اللہ کے محبوب نے ایسے جملے ادا کیے جس کے سامنے دنیا کی ساری دولت ہیچ ہے۔ واہ سبحان اللہ کیا قدر افزائی اور کیا عزت افزائی ہے!!

حضرت خالدؓ بن ولید کہتے ہیں کہ یہ دن میرے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ اس کے لیے میں نے حضور اکرمؐ سے درخواست کی کہ میرے لیے استغفار کی دعا کیجیے اور حضرت عمارؓ سے بھی معافی مانگی۔

حضرت عمارؓ نے حضور اکرمؐ کی زندگی میں بھی تمام غزوات میں آپؐ کے شانہ بشانہ حصہ لیا اور آپؐ کی رحلت کے بعد جب مرتدین کے فتنے نے سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو حضرت عمارؓ نے ان کے خلاف ہونے والے تمام معرکوں میں

حصہ لیا اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔

مرتدین کے خلاف سب سے بڑا معرکہ یمامہ میں ہوا تھا اس جنگ کے وقت حضرت عمارؓ کی عمر ۶۵ برس تھی۔ اس جنگ میں ایک موقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اس وقت حضرت عمارؓ ایک چٹان پر کھڑے ہو گئے اور للکار کر بولے ''مسلمانو کیا تم جنت سے بھاگتے ہو؟' دیکھو میں عمار بن یاسرؓ ہوں آؤ میری طرف آؤ!''

ان کی آواز سن کر مسلمان پلٹ آئے اور ان کے اکھڑتے قدم جم گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں حضرت عمارؓ کا ایک کان کٹ کر پاس ہی گرا اور پھڑ کنے لگا لیکن وہ بے پرواہی کے ساتھ جنگ میں مصروف رہے۔

وہ جس طرف کا رخ کرتے دشمنوں کی صف میں شگاف ہو جاتا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر شروع ہوئی تو تمام صحابہؓ نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ خود سرور کونینؐ بھی اینٹیں اٹھاتے اور گارا بنانے میں ساتھ تھے۔ اس موقع پر حضرت عمارؓ گارا اور پتھر ڈھو کر لا کر دیتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ رجز بھی پڑھتے جاتے تھے۔ نحن المسلمون ...... (ہم مسلمان ہیں، ہم مسجد بناتے ہیں)

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک ایک اینٹ اٹھاتے اور عمار دو دو۔ رسول اللہؐ نے ان کو دیکھا تو بدن کی مٹی جھاڑی، صاف کی اور فرمایا ''ہائے عمارؓ تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں مملکت میں فتنوں نے سر اٹھا لیا اور ان ہی فتنوں کے نتیجے میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی مظلومانہ شہادت ہوئی۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلاف کے حقدار ٹھہرے۔ حضرت عمارؓ نے ان کی پر جوش حمایت کی۔

جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ انہیں حضرت علیؓ کے حق پر ہونے کا پورا یقین تھا لہٰذا پورے یقین، ثابت قدمی اور شجاعت کے ساتھ لڑے یہاں تک کہ حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافات بہت شدت اختیار کر گئے یہاں تک کہ جنگ صفین چھڑ گئی۔

اس جنگ کے وقت حضرت عمارؓ نوے برس کے تھے لیکن اس قدر کبر سنی کے باوجود بے انتہا بہادری اور شجاعت کے ساتھ لڑے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور لڑائی پوری شدت کے ساتھ جاری تھی حضرت عمارؓ نے دودھ کے چند گھونٹ لیے اور فرمایا ''رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ آخری گھونٹ جو تم پیو گے وہ دودھ کے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر سینہ سپر ہو گئے ایسی بے جگری سے لڑے کہ شامی فوج کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ بالآخر شامی فوج کے ایک سپاہی نے انہیں اپنے نیزے سے مجروح کر دیا اور دوسرے نے جب وہ زخمی ہو کر گرے تو تلوار سے سرتن سے جدا کر دیا۔

اس وقت حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے عبداللہؓ نے حضرت معاویہؓ اور اپنے والد کو رسول اللہ کا ارشاد یاد دلایا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ ''عمار تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''

بعض واقعات اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد بعض غیر جانبدار صحابہ کرامؓ بھی حضرت علیؓ کے طرفدار ہو گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود اپنے جاں نثار ساتھی کی نماز جنازہ پڑھائی اور ارض کوفہ میں سپرد خاک کر دیا۔ اسلام لانے والوں میں حضرت عمارؓ کا نمبر شروع کے دس صحابہؓ میں آٹھواں ہے۔ ان سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ دو خواتین اور چار غلام مسلمان ہو چکے تھے۔

آپؓ نے براہ راست حضور رسول کریمؐ کی

سرپرستی میں دین کی تعلیم حاصل کی۔ علم وفضل کے لحاظ سے آپ کا مقام بہت اونچا ہے۔ آپؓ نے استقامت اور صبر کے ساتھ حق کی راہ میں وہ مظالم برداشت کیے جن کو پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

غزوۂ بدر میں جب ابوجہل قتل ہوا تو رسول اللہؐ نے خاص طور پر حضرت عمارؓ کو بلایا اور فرمایا ''اللہ نے تمہاری ماں کے قاتل کو قتل کر دیا۔'' (یعنی اس سے اس کی بے رحمی اور ظلم کا بدلہ لے لیا)

عبادت اور خدا سے لو اور شغف میں آپ کا نام مثالی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ حرام تو دور کی بات ہے متشابہات تک سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے تھے۔

رسول اللہؐ فرماتے تھے ''عمار کی ہڈیوں کے اندر بھی ایمان بھرا ہوا ہے۔'' ایک دفعہ فرمایا ''عمار سر سے پاؤں تک ایمان سے لبریز ہیں۔''

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں میں نے رسول اللہؐ سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ ''جنت تین آدمیوں کی مشتاق ہے عمار، سلمان اور مقداد کے لیے۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جن کو ترجمان القرآن کا لقب ملا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں یہ آیت حضرت عمارؓ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

''بھلا (مشرک اچھا ہے یا) وہ جو رات کے وقت زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا اور آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے (سورہ زمر ۹)

نماز کے اس قدر پابند تھے کہ معذوری کی حالت میں بھی نماز کو قضا کرنا ہرگز پسند نہیں تھا۔ ایک دفعہ کہیں سفر پر جا رہے تھے غسل کی ضرورت تھی لیکن دور دور تک پانی میسر نہ تھا۔ بڑے پریشان ہوئے پھر تیمم کی طرح سارے جسم میں خاک مل لی اور نماز ادا کر لی۔

جب مدینے سے واپس آئے تو ساری بات رسول اللہؐ کے سامنے رکھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسی صورت حال میں صرف تیمم کافی تھا چنانچہ آپؓ کے وسیلے سے مسلمانوں کو ایک بڑے مسئلہ کا حل نصیب ہوا۔

حضرت عمارؓ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں کوفہ کے امیر مقرر ہوئے اور ایک سال اور نو ماہ تک امارت کے فرائض انجام دیئے۔ امیر ہونے کے باوجود ضرورت کی ساری چیزیں خود بازار سے جا کر خریدتے اور کندھے پر اٹھا کر لاتے تھے۔ اسی طرح گھر کا دوسرا کام بھی خود اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ پرانے ہونے کے باعث پھٹ جاتا تو پیوند لگانے میں شرم نہ کرتے۔

بہت متحمل مزاج تھے ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو کن کٹے کہہ کر مخاطب کیا اس وقت آپ کوفہ کی امارت پر فائز تھے لیکن آپ نے اس شخص کی بات کا بڑی نرمی سے جواب دیا اور اس سے بولے کہ او عمدہ کان والے مجھے میرے اس کان کے بارے میں شرم نہ دلاؤ میرا یہ کان تو اللہ کی راہ میں کاٹا گیا ہے۔

جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ میدان جنگ کی طرف جاتے ہوئے بار بار کہتے تھے کہ اے اللہ اگر میں جانتا کہ پہاڑ سے کود کر پانی میں ڈوب کر یا آگ میں جل کر جان دینا تیری خوشنودی کا باعث ہوگا تو میں ہر طریقے سے تجھے خوش کرتا اور یہ جو میں لڑنے جا رہا ہوں تو اس میں بھی تیری رضا جوئی مقصود ہے امید ہے کہ تو اس مقصد میں مجھے ناکام نہ کرے گا۔

اس وقت آپ کی عمر نوّے برس تھی لیکن قویٰ مضبوط تھے اور جوش وجذبے سے سرشار تھے جس طرف کا رخ کرتے صفیں درہم برہم ہو جاتیں اور پرے کے پرے صاف ہو جاتے۔

بالآخر ایک شامی سپاہی نے اپنے نیزے سے زخمی کر کے زمین پر گرا دیا اور دوسرے نے سر تن سے جدا کر دیا اور یوں یہ بطلِ جلیل اللہ کی رضا جوئی حاصل کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملا۔ ☆☆

ڈاکٹر رُتھ فائو

انسان کے روپ میں فرشتہ

منزہ سہام

بحیثیت قوم ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم اچھے اور سچے لوگوں کو اُن کی زندگی میں کچھ نہیں دیتے ہاں مگر دنیا سے جانے کے بعد بہت زیادہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں میں اپنی اس خامی کا ببانگ دہل اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ڈاکٹر رُتھ فاؤ کی زندگی میں اُن کا انٹرویو لینے کی کبھی کوشش نہ کی نہ اُن کے بارے میں کچھ لکھا۔ آج قلم شرمندہ ہے اور ندامت کے آنسو تحریر کو مزید دھندلا رہے ہیں......

کاش میرے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ میں اس عظیم ہستی کی شخصیت کا احاطہ کرسکوں۔

مسیحائی کا ناقابل فراموش نام

ڈاکٹر رُتھ فاؤ ''Dr.Ruth Pfau'' جرمن

خاتون
جن کا تعلق نن سوسائٹی آف ڈائرز آف ہارٹ
سے تھا۔
زندگی کے 50 سال جذام کے مریضوں کو
دیے۔ اپنا وطن چھوڑا اور انتہائی نامساعد
حالات کا پاکستان میں مقابلہ کیا۔
نوستمبر 1929ء کو جرمنی میں پیدا ہوئیں
۔10 اگست 2017 کو آغا خان اسپتال
کراچی میں انتقال ہوا۔ 4 کتابیں لکھیں۔
دا لاسٹ ورڈ اس لو ایڈونچر' میڈیسن وار
اینڈ گاڈ
ادارے کا نام میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر
حکومت پاکستان نے نوازا......
1) ستارہ قائداعظم
2) ہلال امتیاز
3) ہلال پاکستان
4) نشان قائداعظم
ڈاکٹر رُتھ فاؤ کے 5 بہن بھائی
تھے اور وہ سب بھی میڈیسن کے
شعبے سے ہی وابستہ ہیں۔
دوسرے جنگ عظیم میں
بمباری میں گھر تباہ ہوگیا۔ اپنے
گھر والوں کے ساتھ ایسٹ جرمنی
سے ویسٹ جرمنی چلی گئیں اور
میڈیسن کی تعلیم حاصل کی۔
1960ء میں انڈیا چلی
آئیں اور پھر وہاں سے
پاکستان...... یہاں آکر انہوں
نے دیکھا کہ جذام کی بیماری
میں مبتلا لوگوں کو ان کے
اپنے گھر والے قبول نہیں
کرتے۔ یہ صورتحال بہت تکلیف دہ تھی لہٰذا انہوں
نے ان دھتکارے ہوئے
لوگوں کے
لیے

اپنی زندگی وقف کردی۔ جن کی زندگی کی ان کے اپنوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی۔

31 سال کی عمر میں انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب تاحیات پاکستان میں ہی رہیں گی اور اپنے فیصلے پر قائم بھی رہیں اور یہیں کراچی میں مدفون ہیں۔

کراچی میں اس وقت میکلوروڈ اور اب چندریگر روڈ پر واقع اس کالونی کا معائنہ کرنے کے بعد جہاں جذام کے مریض رکھے جاتے تھے انہوں نے ان مریضوں کی دیکھ بھال کا فیصلہ کیا۔

جذام ایک ایسا مرض ہے جو 20 سال تک جسم کے اندر پنپتا ہے اور اس وقت آثار نظر آتے ہیں جب وہ تقریباً ناقابل علاج ہو چکا ہوتا ہے۔

انہوں نے کبھی ڈاکٹر والا رویہ نہیں رکھا وہ اپنے مریضوں کی رشتہ دار بن جایا کرتی تھیں۔

38 سال کی ناقابل فراموش خدمات......

ابتداء میں اسپتال صرف ایک کمرے کی ڈسپنسری تھا جو اُن کی توجہ اور محنت سے 8 منزلہ عمارت میں تبدیل ہوا۔

وزیراعظم پاکستان نے State Furenal کا اعلان کیا۔ اور پاک فوج نے پورے احترام کے ساتھ اُن کا جسد خاکی قبرستان تک پہنچایا۔ انتقال کے وقت عمر 87 سال تھی۔

3 سال سے بستر پر تھیں۔

کس نے پوچھا؟ کسی مارننگ شو میں بلایا گیا؟ کتنے شوز اُن پر کیے گئے؟

ہم لوگ اُن کے مقروض ہیں مگر ہمارا بھی المیہ ہے ہم زندگی میں کسی کو کچھ نہیں دیتے وہ عزت اور وہ مقام بھی نہیں جس کا وہ شخص حقدار ہوتا ہے۔

یقیناً ڈاکٹر رتھ کو کسی تمغے یا کسی مداح سرائی کی ضرورت نہیں وہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی جن سے ان کے اپنوں نے ہی زندہ رہنے کا حق چھین لیا تھا' اُن کی بیماری کی وجہ سے عضو معطل جانا مگر ڈاکٹر رتھ نے ایسے مریضوں کو اپنے سینے سے لگایا۔

انہیں زندگی کی طرف لے کر آئیں...... ہمارا دین کہتا ہے جس نے ایک انسان کو بچایا اُس نے ساری انسانیت کو بچایا اور ڈاکٹر رتھ فاؤ نے تو ہزاروں جانوں کو بچایا۔

ہم اس عظیم ڈاکٹر کو اپنے ان صفحات کے ذریعے خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ہم تصویر ہیں اس شعر کی......

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے......

☆☆......☆☆☆

دوشیزہ کی محفل پڑھنے والے تمام لوگوں کو میرا محبت اور خلوص بھرا اسلام کوشش تو تھی کہ عیدالاضحیٰ سے قبل شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہو مگر عادل بھائی ہمارے کاغذ والے اُن کی محبت کی وجہ سے کاغذ بروقت پریس نہیں پہنچ سکا اور یوں دوشیزہ تاخیر کا شکار ہوا۔ امید کرتی ہوں کہ آئندہ عادل بھائی آپ ایسا نہیں کریں گے۔ شاید شاعر نے میرے لیے کہا تھا ''دیر کر دیتا ہوں'' فرزانہ رحمان صاحبہ بھی زمین کا رزق ہوئیں اور مجھے دیر سے پتہ چلا...... فردوس حیدر صاحبہ بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے میری زندگی کا سب سے حسین دور یعنی بچپن جڑا ہوا تھا۔ بے فکری کے دن خوش رنگ اور خوش لباس شخصیات...... آہ سب ایک ایک کر کے چلتے چلے جا رہے ہیں۔ بس میں یہی کہوں گی کہ اللہ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ایک خوشی کی خبر بھی ہے اللہ دنیا والوں سے مایوس نہیں اس لیے ننھے فرشتے پیدا ہوتے ہیں ہماری پیاری لکھاری اُمِ مریم 11 اگست کو خیر خیریت سے بیٹے کی اماں بن گئیں...... ام مریم اللہ تمہیں تمہاری اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ آخر میں ان تمام محبت کرنے والوں کا شکریہ جنہیں بہت مان سے آواز دیتی ہوں اور وہ فوراً لبیک کہتے ہیں اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر میرا مان بڑھاتے ہیں۔ ایک ضروری بات جو ان لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں جو دو دو یا 3 صفحے کے افسانے بھیج رہے ہیں برائے مہربانی اتنے مختصر افسانے کو تکنیکی بنیادوں پر نا قابل اشاعت سمجھا کریں۔ چلیے اب چلتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب......

✉: فرحت صدیقی فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ سہام مرزا السلام علیکم! بہت عرصہ ہوا آپ کی آواز نہیں سنی...... آپ کو میں نے بہت یاد کیا ہے۔ عرصے سے کچھ لکھ نہیں سکی تھی۔ کل کوشش کر کے ایک کہانی لکھی ہے۔ مختصر سہی...... پورا پیج ہے۔ لکھنا بھول گئی ہوں۔ پڑھتی رہتی ہوں۔ منزہ بھولے بسرے لوگ ہیں ہم نجانے کب کوچ کا نقارہ بج جائے۔ کبھی یاد ہی کر لیا کرو۔ دوشیزہ کے ساتھ گزرا ہوا وقت بہت یاد آتا ہے۔ سچی کہانیاں کا بھی مجھے اپنا سنہرا دور یاد آتا ہے۔

✍: فرحت آپ کے خط نے مجھے میری کوتاہی کا احساس دلایا میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ جیسے

محبت کرنے والے لوگوں سے رابطہ استوار نہیں رکھ پائی۔ لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا پکا وعدہ...... ویسے میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ آپ لکھنا بھول گئی ہیں قلمکار کبھی لکھنا نہیں بھول سکتا بھلا سانس لیے بنا کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھیے امبر کو میری طرف سے بہت پوچھیے گا اور نواسی کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے مجھے یہ خوشی کی خبر ضرور دیجیے گا مٹھائی کے ساتھ‘ آپ کا افسانہ انشاء اللہ اکتوبر میں لگاؤں گی۔

✉ :صبیحہ شاہ کراچی سے لکھتی ہیں‘ اسلام علیکم منزہ‘ اس بار پوسٹ آفس والوں کی مہربانی سے دوشیزہ جلدی مل گیا۔ صحیح کہا تم نے ہم کو گمشدہ پاکستانی کو تلاش کرنا ہوگا قدرت شاید دوبارہ موقع نہ دے۔ اس مرتبہ ہم نے صحیح حکمران کا انتخاب نہ کیا تو ہمارا ذکر بھی نہ ہوگا داستانوں میں‘ نئے ناول میں پیراگراف غیر ضروری لگے۔ رقص جنوں میں سیاق وسباق ضروری تھا۔ بیگم صاحبہ کون ہیں؟ قلمکار کا اُن سے رشتہ واضح نہیں ہوا گو کہ اندازِ بیان اچھا ہے۔ مثلث پرانی مگر اچھی کہانی اور کہانیاں تو ساری پرانی ہی ہوتی ہیں انداز تحریر انہیں نیا بناتا ہے۔ حضرت بلال ایم ایمان کی اچھی تحقیق ہے۔ تحسین انجم نیا نام نہیں لیکن اس مرتبہ اُن کی کہانی میرے چارہ گر کو میں بہت سے جھول نظر آئے۔ جینا کون سے کورٹ گئیں جو شام کو کھلا تھا وہاں سے واپس آ کر اُس نے کینڈل لائٹ ڈنر کیا؟ ندی کا ذکر تند خوئی کے حوالے سے ہے جبکہ ندی تندرو ہوتی ہے تندخو تو نہیں۔ انٹرنیشنل موبائل کا ذکر ہے یہ کون سا موبائل ہوتا ہے؟ دل دا حال نہ جانے کوئی نفیسہ سعید کی دل اداس کر دینے والی کاوش ایسا بھی ہوتا ہے ماریہ یاسر کی ہلکی پھلکی تحریر حبیبہ عمیر نے دو سو جگہ سر ہلانے کے لیے سر مارنا لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں بال عجب چہار سو بکھرے ہوئے تھے جیسے جینے کی امنگ نے دم توڑ دیا ہو۔ اگر یہ کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں تو کمپوزر قابل گردن زدنی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں قلمکار کو بہت مطالعہ کی ضرورت ہے۔ تصویر کے پار نجیب عمر کی خوبصورت تحریر تھی۔

ﷺ :اچھی سی صبیحہ! آپ کا سیر حاصل تبصرہ یقیناً قلمکاروں کی بہت رہنمائی کرے گا میرے لیے تو یہ تبصرہ بہت اہم ہے اور میں چاہوں گی کہ آپ ہر ماہ وقت نکال کر محفل میں ضرور شرکت کریں۔ سینئر قلمکار کی رائے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

✉ :غزالہ رشید لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ سہام‘ امید ہے میرا خط تمہیں خیریت سے پائے گا‘ تم یاد کر لیتی ہو اس کے لیے شکریہ‘ ورنہ جہان رنگ بو میں ہر صبح نئے پھول کھل کے خوشبو پھیلا رہے ہیں۔ نئی فضاؤں کی تحریریں‘ بڑی تیزی سے جگہ بنا رہی ہیں۔ محفل میں بھی رونق نظر آتی ہے‘ لکھنے سے زیادہ اب پڑھنے میں دل لگنے لگا ہے۔ یہ ہی مجھے ایک اچھی علامت نظر آتی ہے پہلے بھی بہت زیادہ لکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کے لیے ایک خاموش پیغام ضرور چھپا ہو۔ درد کو مسیحا مل جائے‘ اور مسافر کو راستہ‘ ورنہ گھر میں رہ کے جب خواتین سے ملاقات ہوتی ہے تو محسوس یہ ہونے لگا ہے کہ اب ہم اپنے حق کی بات کرتے کرتے فرائض سے جان چھڑانا چاہتے ہیں اور بس یہ ہی کہنا چاہتی ہوں اپنے سارے پیارے لوگوں سے محبت کرنے والے بنیں‘ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دل میں آپ کی محبت بن مانگے ڈال دے گا...... باقی سب تو چلتا رہتا ہے۔ سلسلے وار کالم بہت خوبصورتی سے دل میں جگہ بنا رہے ہیں۔

میرا اسلام سب تک پہنچے...... جو لوگ بچھڑ گئے ہیں اُن کی مغفرت کے لیے دعا ہے اور جو ہمارے ساتھی پریشانی یا صحت کے مسائل کا شکار ہیں۔ ان کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو آسانیاں دے آمین۔ آفس میں سب کو سلام، زین شمسی اور دانیال شمسی کے لیے دعائیں ناصر رضا صاحب کو ادب سے آداب۔

ج: بہت ہی پیاری غزالہ! ادب سے آپ کا آداب ناصر بھائی تک پہنچا دیا ہے اور جواباً انہوں نے نہایت محبت سے جینے کی دعا دی۔ زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ دعاؤں اور دل میں رہتے ہیں آپ کا شمار بھی اُن چند لوگوں میں ہوتا ہے۔ دوشیزہ آپ کا رسالہ ہے اور ہمیشہ رہے گا لہٰذا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... دانیال زین بھی آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔

✉: روحیلہ کراچی سے لکھتی ہیں۔ جون کا دوشیزہ ملا اچھا لگا کہ آپ نے تحریر کے ساتھ خط بھی چھاپا یہ آپ کی محبت ہے کہ شکایت کو محبت سے لپیٹ دیتی ہیں کہ آگے سے بندے کے پاس کچھ کہنے کو نہیں بچتا۔ بہرحال آپ اپنے ڈائجسٹ کو خواتین اور مردوں میں یکساں طور پر مقبول کرنے کے لیے محنت کر رہی ہیں گو نام تو دوشیزہ ہی ہے لیکن اس خالص زنانہ نام کے ساتھ معاشرے کی تلخ کہانیاں بھی چھپی ہیں یہ بھی درست ہے کہ رومانویت کا اپنا ایک چارم ہے لیکن حقیقت اپنے پورے لوازمات کے ساتھ زبان کو کڑوا کر دیتی ہیں۔ اور یہ کوشش جاری رکھیے گا کیونکہ لوگوں نے تعلیم کی طرح ادب اور اس سے جڑی اصناف کو بھی کمرشلزم کی مار لگائی ہے حال ہی میں ایک کھانا پکانے کی تراکیبوں کا رنگین رسالہ دیکھا بڑی بڑی تصاویر اور تراکیب محض چند سطروں تک محدود بہرحال ہر ایک کو حق ہے کہ اپنے دل کی کہے پر کچھ سچائی بھی شامل کرلیں تو بہتر رہتا ہے۔

لکھنے کا سلسلہ جو کچھ عرصے پہلے منقطع ہو چکا تھا اب شروع ہوا ہے خدا کا شکر ہے کہ پسند کرنے والے دل رکھ لیتے ہیں۔ آتے ہیں آپ کے شمارے کی جانب تو بڑے بڑے نام رفعت سراج اور زمر نعیم، سنبل کے ہمراہ نئے لکھاری بھی خوب کوشش میں لگے ہیں۔ حبیبہ عمیر اور ام ایمان قاضی اپنے ناول اور ناولٹ کے ساتھ براجمان تھیں لیکن حبیبہ نے اس سے آگے کیا لکھا وہ جاری ہے کے ساتھ میں جاری نہ رکھ سکی کیونکہ شمارہ جو نہیں ملا تھا۔ ممتاز مفتی کاش اور شر خوب رہا بھیگا موسم آخر میں تھوڑا کسی ڈرامہ چینل کی طرح پُراسرار ہو گیا تھا۔ ذیشان سرفراز نے سرمد کھوسٹ کا انٹرویو خوب لیا لیکن بہت سی باتوں کے جوابات ادھورے محسوس ہوئے اس میں ذیشان کا کوئی قصور نہیں تھا بقول ہمارے ایک سینئر جرنلسٹ کے جب لوگ زیادہ پڑھ لکھ جاتے ہیں تو کچھ اس طرح کے ہی ہو جاتے ہیں ویسے کھوسٹ فیملی بھی خوب ہے پہلے دادا نے اسٹیج پر اس زمانے میں رنگ جما کر نام پیدا کیا جب ٹی وی نہ تھا پھر بیٹے عرفان کھوسٹ نے اور اب سرمد نے ثنا عسکری بس ٹھیک ہی ہیں اور شاید صوفی نے اُن کا تعارف ہی لکھا تھا ویسے آپس کی بات ہے آپ کی طرح میں بھی خطوط توجہ سے پڑھتی ہوں۔ دلچسپ لگتا ہے سب کی رائے دیکھنا پڑھنا کہ لوگ کیا سوچتے ہیں کس طرح دیکھتے ہیں اور ہاں فروری کے حوالے سے بھی کچھ مل گیا ہے اور یہی بات ہے کہ بہت اچھا لگا کہ اب بھی بچوں کی طرح چیٹ کے ساتھ اپنا بینک بیلنس بڑھتا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے محنت وصول ہو گئی۔ اپنا آپ ضائع ہوتا محسوس نہیں ہوتا بقول ہمارے ایک ساتھی کہ ہم نے بھی بچپن میں بہت ایسے کام کیے کہ

پسینہ پسینہ ہوجاتے اور ملتا کیا...... پر کرے چلے جاتے کرتے چلے جاتے...... خیر نجانے کیا کچھ لکھ ڈالا کہ خط لکھنے میں سمجھ نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور ہاں اگر آپ کو اشاعت کے قابل نہ محسوس ہو تو فٹ سے پھاڑ ڈالیے گا۔اے دشمن جاں ناولٹ ہے دادی اور پوتی کی عجیب سی محبت جو نظر نہیں اتی پر ہوتی بڑی مضبوط ہے۔امید ہے آپ کو پسند آئے گی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

ﷺ: پیاری روحیلہ! تمہارے خط اور تحریر کا تو مجھے بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ تم اس انتظار کو طویل نہیں ہونے دیتیں دوشیزہ کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں حالانکہ اس بات سے دوشیزہ کا کردار کافی مشکوک ہوجاتا ہے۔اے دشمن جاں جلد شائع کروں گی۔

✉: سنبل کراچی سے لکھتی ہیں۔ڈیئر منزہ' السلام علیکم! الحمدللہ سب خیریت سے ہیں اور آپ سب کی خیریت کے لیے دعا گو ہیں دوشیزہ 18 تاریخ کو ملا ان دنوں ایک شادی چل رہی تھی سو پڑھنے میں ٹائم لگ گیا لہٰذا معذرت...... اداریہ بہت زبردست تھا۔کاش یہ بات ہماری عوام کو سمجھ آجائے۔حضرت بلال حبشیؓ پر تحریر لاجواب تھی۔اللہ کرے زورِ قلم ہو اور زیادہ...... دوشیزہ کی محفل کی مستقل دوشیزائیں غائب رہنے لگی ہیں۔وہ حاضر ہوں۔خولہ' عقیلہ' فصیحہ' آصفہ' زمر اور فریدہ فری کے خطوط لاجواب رہے۔انٹرویو دونوں اچھے تھے باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔تنہائی کا زہر' تیر نیم کش' چارہ گر کو' پر تبصرہ مکمل ہونے تک ادھار رہا ابھی امکان باقی ہے دھیمے دھیمے انداز میں چل رہا ہے۔مثلث ایک بڑی پیاری تحریر تھی مکافات عمل' پر نفیسہ سعید کی تحریر اچھی مگر کچھ ادھوری سی محسوس ہوئی فرحت صدیقی کی یادیں بھی دل دکھا گئیں۔اداب محبت اچھی تحریر تھی کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں' نگین غالباً نئی رائٹر ہیں اس حساب سے تحریر بہتر تھی۔ملال عمر بھر کا بس لڑکیوں سے اتنا کہنا ہے کہ جو آپ کو اپنے گھر عزت سے نہیں لے جاسکتا وہ بعد میں کیا عزت دے گا۔ام مریم کا ایک مخصوص شدت پسند انداز ہے جو تحریر میں موجود تھا بہرحال تحریر اچھی تھی۔ثمینہ کی تحریر ٹھیک تھی۔ماریہ کی تحریریں ہلکی پھلکی ہوتی ہیں یہ تحریر بھی ویسی ہی تھی۔نجیب عمر کا افسانہ اچھا تھا تھوڑا الگ...... علی ارسلان کی بازگشت واقعی میں بازگشت تھی۔لاجواب...... دوشیزہ گلستان زبردست اور کچن کارنر سے استفادہ کیا۔یہ تو تھا تبصرہ اب آپ سناؤ کیسی ہو؟ ماشاءاللہ موسم تو لاجواب ہے اور باقی سب کیسے ہیں دعا ہے سب خیریت ہی ہو۔اب اجازت دیں اپنا بہت خیال رکھیں اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ﷺ: سنبل پیاری! بروقت اتنا جامع تبصرہ بھیجنے کا شکریہ...... میرا خیال ہے دوشیزہ کی محفل سے وہ خواتین غائب ہیں جواب دوشیزہ نہیں رہیں۔ایسا انہوں نے خود سوچ لیا ہے ورنہ ہم تو پکارتے ہی رہتے ہیں۔باقی سنبل اللہ کا احسان ہے سب خیریت ہے۔میں تمہارے سلسلے کی اب منتظر ہوں۔

✉: خولہ عرفان کراچی سے لکھتی ہیں عزیز و محترم منزہ' السلام علیکم! ہر ماہ کی طرح خولہ حاضر محفل ہے ماہ اگست کا دوشیزہ اگست کے خوشگوار موسم کی طرح خوشگوار ثابت ہوا آپ کا اداریہ پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ کرے کہ آپ کے سچے جذبات ہماری قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو جگانے میں کامیاب ہوجائیں۔واقعی آپ نے بجا فرمایا ہے کہ زندگی بار بار موقع نہیں دیتی۔تبصرے میں مزید آگے بڑھی تو ام

ایمان کی صحابہ کرامؓ سے متعلق ایمان افروز باتوں نے ذہن کو منور کیا۔ حضرت بلال حبشیؓ جیسے عاشقانِ رسول ﷺ کو ہی اللہ نے اسلام کو دوام بخشنے کے لیے منتخب کیا۔ اور اِن صحابہ رسول ﷺ نے اللہ، نبی ﷺ اور اسلام سے محبت کی داستانیں رقم کیں جو رہتی دنیا تک ہر ایک مسلمان کا خوں گرماتی رہیں گی۔ اللہ ہمارے اندر بھی وہی دینی حمیت اور فہم وفراست نصیب فرمائے آمین۔ محفل میں قدم رنجا فرماتے ہی زمرٗ عقیلہ اور فصیحہ جیسے پیارے لوگوں سے ملاقات نے ہشاش بشاش کر دیا۔ اللہ انہیں دائمی خوشیاں نصیب فرمائے آمین۔ شفی محبوخاں اور ماہر خان دونوں کا انٹرویوز بردست تھا لیکن ماہرہ کی ڈریسنگ...... اُف...... نسرین اختر نینا کا نیا سلسلہ وار ناول تنہائی کا زہر اچھی ابتدا ہے دعا ہے آگے بھی دلچسپی برقرار رہے۔ البتہ سکینہ فرخ کا مثلث اپنے کمال اندازِ تحریر اور کہانی کے سبب دل میں گھر کر گیا۔ خاص طور پر جب وہ آخر میں اپنے بابا اور نانا کا تقابلی جائزہ لیتی ہے کہانی کا عروج نظر آیا مزہ آ گیا۔ نفیسہ سعید کا دل دا...... کہانی کی شروعات اچھی تھی لیکن اختتام اتنا جاندار نہیں ثابت ہوا۔ رقصِ جنوں فرحت صدیقی کا منظر اور جذبات نگاری کو سموئے امیدیں جگاتا اچھا افسانہ تھا۔ راحت وفا راجپوت نے آدابِ محبت میں بہت خوبصورت انداز سے صنفِ نازک کے جذبات کی مرمت اور اللہ پر یقین کامل کی عکاسی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے لیے الگ اور دوسروں کے لیے الگ اصول واضح کرتا ہے۔ نگین افضل وڑائچ کا متاعِ حیات، بھی محبت کا روایتی رنگ لیے اپنے خوبصورت اسلوب نگارش سے کہانی میں جان ڈالتی تحریر ثابت ہوئی۔ فرح انیس کا ملال عمر...... ماریہ یاسر کا ایسا بھی...... اور نجیب عمر کا تصویر کے پاس متنوع موضوعات کے ساتھ اثر انگیز تحریریں تھیں اور بازگشت میں سید علی ارسلان کی ممی چھا گئیں۔ حبیبہ عمر کا تیر نیم کش گھریلو تنازعات پر مبنی خوبصورت تحریر ہے۔ زمر کا ابھی امکان...... اپنے مخصوص انداز تحریر کے ساتھ ہمیشہ کی طرح گلے مہینہ جلد شروع ہونے کی دعا لبوں پر لے آیا۔ تحسین انجم انصاری کا مرے چارہ گر...... بھی بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دوشیزہ گلستان میں ارم حمید نے پھولوں جیسی تحریروں کو بہت عمدگی سے سجایا البتہ میری نظم کے نیچے میرا نام نہیں تھا کیونکہ خولہ عرفان کی ڈائری سے لگتا ہے کہ انہوں نے کسی اور کی شاعری روانہ کی ہے حالانکہ ہم تو اپنے منہ میاں مٹھو بنے رہتے ہیں۔ کچن کارنر جو کہ خواتین کی کمزوری ہوتا ہے۔ اپنی تمام ریسپیز کے ساتھ مزہ دے گیا۔ شکر ہے منزہ تبصرہ مکمل ہوا میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب کا تبصرہ نہیں لکھا جا سکے گا لیکن ذہن میں اپنی طرح نو وارد مصنفین آ جاتے ہیں۔ جو میری طرح حوصلہ افزائی کے متمنی ہوتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ سب ہی اپنی بہترین کاوشیں ارسال کرتے ہیں اور ہمارے معاشرے اور اپنے ارد گرد کے خدوخال یعنی مزاج اور اندازِ بود و باش واضح کرتے ہیں۔ ہماری تعریف وتنقید یقیناً اُن کو توانائی پہنچانے کے لیے ایندھن کا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ توانا ہو کر مزید خوبصورت تحریریں لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ دعا ہے منزہ کہ یہ پوسٹ ہو کر وقت پر پہنچ جائے آمین، منزہ اور تمام اراکین دوشیزہ کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں۔ اللہ کرے ہر طلوع ہونے والی سحر اپنے دامن میں دوشیزہ اور محبان دوشیزہ کسی صحت وترقی کی نوید سمیٹے ہو آمین۔

ھ: پیاری خولہ! آج 26 تاریخ ہے اور آپ کا خط پورے طمطراق سے آفس میں داخل ہوا اور پھر

دوشیزہ کی محفل میں براجمان ہوگیا' شکریہ......شاعری بہت ہی بہترین ہے الگ سے باکس لگا رہی ہوں۔ باقی مصنفین خود شکریہ ادا کریں گے۔

✉: زمر نعیم لاہور سے لکھتی ہیں۔ اللہ آپ پر ہمیشہ مہربان رہے آمین۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی ادارے اور تمام اراکین و وابستگین کی خیر و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ ہم سبھی کو اور ارضِ پاک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین ثم آمین۔ منزہ جی! ناول ابھی امکان باقی ہے کی قسط نمبر 13 ارسال کر رہی ہوں۔ موصول ہوتے ہی مطلع ضرور کیجیے گا۔ گزشتہ ماہ (جولائی) قسط کے شائع نہ ہونے کا دکھ ابھی تک قائم ہے۔ بے شک اللہ کی رضا نہ تھی۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اُس کی رضا و مصلحت پر صبر و شکر کے ساتھ باعمل ہو جائیں آمین۔ جولائی کا شمارہ بائیس تاریخ کو موصول ہوا۔ عید رنگ سے موسوم شمارہ خوبصورت دوشیزہ کا عکس لیے دل کو بھا گیا۔ اشتہارات سے صرف نظر کیے فہرست پر نگاہ پڑی تو آپ کے نام پر جا ٹھہری۔ دل میں انبساط کی لہر موجزن ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد آپ کی کوئی تحریر شامل اشاعت تھی۔ باقی ساتھی مصنفین نے بھی عید رنگ کو دوبالا کیا۔ لیکن دیس میں پردیس کا اپنا الگ ہی رنگ تھا۔ امید ہے آئندہ بھی آپ اپنی تحریروں سے قارئین کے ذوق کو تسکین بخشتی رہیں گی۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح پُراثر رہا۔ لیکن صرف حساس لوگوں کے لیے...... (عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے) ام ایمان نے حضرت زید بن حارثہ کے بارے میں بہت اعلیٰ اور معلوماتی مضمون تحریر کیا۔ جو کہ رزقِ بصارت محسوس ہوا۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسلامی تاریخی کردار ہی ہمارے اصل ہیرو ہیں۔ اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہونے سے ایمان میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ محفل دوشیزہ کا رنگ حاضرین محفل کی غیر حاضری کے باعث ذرا مدھم محسوس ہوا۔ گو کہ غزالہ رشید کی آمد سے دل شاد ہوا۔ اور خولہ کے برجستہ مکالمے نے بے اختیار داد دے کر واہ واہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ (خولہ اپنی بات کہنے کا فن اللہ نے آپ کو ودیعت کیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایے اور کوئی زبردست سی تحریر لکھ ڈالیے۔) بلال فیاض اور عمران مظہر کے بھرپور تبصرے اُن کی دوشیزہ سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ نگہت غفار کی دکھ بھری کہانی ہر دوسرے قاری کی آپ بیتی ہے۔ محفل دوستاں کو اللہ نظر بد سے بچائے آمین۔ آپ دوستوں کو ایک ساتھ دیکھ کر دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ اور خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ایسی محفل دوستاں کا شریک ہم بھی ہوتے یا ایسی محفلیں یہاں بھی سجتیں محبتیں بٹتیں ہر ایک چہرا بہار ہوتا۔ رفعت سراج کا دام دل خوبصورت اور منطقی انجام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ رفعت سراج کی پہلی تحریروں کی طرح یہ تخلیق بھی ذہن و دل کی گرفت میں لیے رہی۔ اللہ انہیں مزید ہنر کمال عطا کرے آمین۔ باقی سلسلے بھی اپنی روانی سے بڑھ رہے ہیں۔ تحسین انجم انصاری کا منی ناول قابل تحسین ہے۔ سبھی افسانوں میں جھلکتا رمضان کا تقدس اور عید کا مقصد پُراثر بھی تھا اور غور طلب بھی۔ بلال فیاض کا ناولٹ زینی اور زینب احساسات و جذبات کی روانی کو خوبصورتی سے بیان کرتا انداز تحریر بلال کے قلم کی پختگی کا پتہ دیتا ہے۔ بہت اچھا موضوع تھا۔ حبیبہ عمیر' حنا بشریٰ' سکینہ فرخ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ کسی ساتھی لکھاری کی تحریر پر بھرپور تبصرہ نہ دے پاؤں تو یہ مت سمجھیے گا کہ میں نے دلچسپی سے پڑھا نہیں۔ بعض اوقات تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے اور کئی بار موقع نکل چکا ہوتا

ہے۔ سنبل کو دوشیزہ رائٹر ایوارڈ بہت مبارک ہو۔ سنا تھا جلد ہی تقریب دوشیزہ رائٹر ایوارڈ کا انعقاد ہوگا۔ اُس جلد کی توقع کب تک رکھی جائے؟ سمجھا کریں۔ کچھ تیاری شیاری بھی تو کرنی ہوگی۔

سفر ہوا تو وسیلہ ظفر بھی ڈھونڈنا ہوگا
چلے جو ساتھ میرے وہ ہم سفر بھی ڈھونڈنا ہوگا

(زمر نعیم اجر)

منزہ جی خط لکھتے لکھتے اچانک لفظ نمو پا گئے اور آبیاری ہوگئی۔ ہو سکے تو گلستاں دوشیزہ میں جگہ دیجیے گا۔ آنٹی کیسی ہیں۔ میرا سلام دیجیے گا...... گروپ ایڈیٹر میں ناصر رضا صاحب کا نام پڑھا، اچھا لگا۔ کاشی بھائی سچی کہانیاں تک محدود ہو گئے؟ اُن کی آمد دوشیزہ میں مبارک ہو...... باقی اسٹاف کو بھی میرا سلام دیجیے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ زین دانیال کو دعائیں اللہ انہیں کامران و شادمان رکھے آمین ثم آمین۔ خط لکھتے ہوئے کوئی سہو کوئی غلطی ہوگئی ہو تو صرف نگاہ کیجیے گا۔

ھ: انتہائی جامع اور خوبصورت خط ہر لفظ اپنی جگہ ایسا جیسا موتی جڑا ہو...... زمر اللہ آپ کے قلم کو مزید روانی اور طاقت عطا فرمائے۔

✉: صبا نور فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! سب پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے دعائیں دوشیزہ کے لیے ترقی و کامیابی کی دعا (اللہ پاک قبول فرمائے آمین) دوشیزہ کو پڑھتے ہیں اچھا اور معیاری ماہنامہ ہے تو سوچا دوشیزہ میں بھی اپنی تحریر بھیج کے آپ کی محفل میں شامل ہو جاؤں گو کہ دوسرے ماہنامہ میں تو میری تحریریں اور میری بہن کی تحریریں آتی ہیں اور دوشیزہ میں بھی پہلے تحریر بھیج چکی ہوں مگر مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ نہ بھیج پائی اور امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے خوش آمدید کہیں گے اور میری تحریر کو دوشیزہ میں جگہ دیں گے۔

ھ: جی صبا میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں محفل میں ضرور شرکت کیا کریں۔ اپنی تحریریں مجھے ضرور ارسال کرتی رہا کریں۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

✉: فائزہ مشتاق کراچی سے لکھتی ہیں۔ عزیزم منزہ! السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپ کی سلامتی‘ صحت اور تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔ میرا یہ پہلا رابطہ ہے آپ سے‘ اور آپ کے ادارے سے جڑنا چاہتی ہوں۔ ایک کہانی ’خواب ہوئے ادھورے‘ ارسال کر رہی ہوں۔ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تو بہر حال آپ ہی کریں گی۔ لیکن امید ہے اس کی نوک پلک سنوار کر آپ مجھے کثیر الاشاعت رسالے کی قلم کاروں کی فہرست میں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ اور اپنے ادارے سے جوڑ کر مجھے تحریروں میں مزید نکھار کا موقع فراہم کریں گی۔ آپ کے جواب کی منتظر۔

ھ: سوئٹ فائزہ! آپ کی تحریر موصول ہوگئی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی اور آپ ادارے سے جڑ چکی ہیں لہٰذا آئندہ بھی اپنی شرکت کو یقینی بنائیے گا مجھے اچھا لگے گا۔

✉: عمران مظہر ژوب سے لکھتے ہیں۔ اگست کا دوشیزہ ماہ آزادی مبارک کا ٹیگ لیے ہوئے 17 تاریخ کو ملا۔ پچھلے کچھ ماہ سے سرورق بہترین جا رہا ہے۔ اشتہارات پھلانگ کے آپ کے ادارئیے تک

پہنچے۔ کاش پاکستانی عوام میں یہ سمجھ بوجھ ہوتی کہ زندگی بار بار موقع نہیں دیتی' ام ایمان صاحبہ کا غلام جو سردار بنے' بہترین رہا۔ محفل بھی دھیمی رہی۔ ارے نہیں آپی! کہاں کراچی کہاں ژوب یہ تو بس مذاق کی بات تھی۔ سوچا محفل میں کچھ تڑکہ لگ جائے گا لیکن موبائل انٹرنیٹ کے زمانے میں لوگوں کے احساسات بھی شاید اپ ڈیٹ ہوگئے ہیں ہر طرف میں 'میرا' کی افراتفری ہے۔ چلیں جانے دیتے ہیں ہم تو سینئر رائٹرز کو دوشیزہ کے صفحات پر دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ ویسے کئی بار دوشیزہ سچی کہانیاں کے دفتر آ چکے ہیں۔ بلگرامی صاحب' ناصر انکل' کاشی بھائی وغیرہ سے ملاقات رہی ہے۔ ایک بار آپ بھی آفس میں موجود تھیں پر ملاقات نہیں ہو پائی۔ بلال فیاض صاحب کو ایوارڈ کی مبارکباد' مثلث اختتام کو پہنچا' ٹھیک رہا۔ افسانوں میں دل دا حال' رقص جنوں' ملال عمر بھر کا اور تصویر کے پار پسند آئے۔ منی ناول من نہیں لگ رہا جبکہ تیر نیم کش بھاری بھاری سا لگنے لگا ہے۔ بازگشت میں ممی زبردست رہا۔ دوشیزہ گلستان ہمیشہ کی طرح سجا رہا۔ ڈی خان کی خبریں بھی ٹھیک رہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات رہے گی۔ سب اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا سب کے لیے خصوصاً سلام دعائیں۔

ھ: عمران بیٹے! میں کافی سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ جلد ایک اچھی سی چائے پارٹی کا بندوبست کیا جائے جس میں دوشیزہ میں لکھنے والے خواتین وحضرات کو مدعو کیا جائے لہٰذا تیاری رکھنا۔ تم دفتر آئے مگر ملاقات نہیں ہوسکی یہ جان کر مجھے دکھ ہوا چلو آئندہ سہی...... تمہاری تحریر شمارے میں شامل ہے۔

✉: بہت دنوں بعد ہم سب کو عزیز شائستہ عزیز محفل میں قدم رنجہ ہوئی ہیں لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ السلام علیکم! امید ہے خوش باش ہوں گی۔ تقریب کی روداد پیش خدمت ہے امید ہے کہ رواں ماہ میں اسے جگہ مل جائے گی۔ نئے پتہ پر دوشیزہ مل گیا ہے۔ سرورق بہت خوب ہے بلکہ بہت ہی خوب ہے (پتہ نہیں یہ شعبہ کس کے پاس ہے؟) دام دل اختتام پذیر ہوا اب اس کی اقساط اکٹھی کر کے پڑھوں گی۔ رفعت سنا ہے آپ کی طبیعت ناساز ہے فون آپ کا مل نہیں رہا ہے جلد اپنے بارے میں اچھی خبر دیں۔ اس ماہ فرحت صدیقی کو بہت دنوں بعد دوشیزہ میں دیکھ کر خوشی ہوئی امید ہے کہ اور بھی بچھڑے ہوئے قلمکار جلد آن ملیں گے۔ مستقل سلسلے بہت خوب ہیں۔ نقش قدم کا انتظار ہے۔ اس وقت جلدی میں ہوں جلد تفصیلی ملاقات ہوگی سب کو سلام کہیے گا۔

ھ: شائستہ خط پا کر بہت خوشی ہوئی اور آپ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ ٹائٹل کا شعبہ زین کے پاس ہے۔ میں بھی رفعت کو لے کر کافی پریشان ہوں فون پر تو ملتی ہی نہیں ہیں سوچ رہی ہوں خط لکھوں۔ آپ اپنا بھی بہت خیال رکھیں انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور ملاقات ہوگی۔

✉: مہوش طالب لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم، منزہ کیا حال ہیں، امید کرتی ہوں خیریت سے ہونگی، کافی عرصے بعد آدھی ملاقات کا موقع مل رہا ہے، دراصل مواقع اور وقت بھی اپنوں کیلئے انسان خود ہی نکالتا ہے،، تو جناب اس ماہ کا اداریہ پڑھا، زبردست، مگر قابل غور بھی۔ ام ایمان نے حضرت بلال بن رباح حبشیؓ کی متاثر کن حیات پر بہت دلچسپ لکھا۔ پھر دوشیزہ کی محفل کی طرف گامزن ہوئے عقیلہ حق جب بھی آتی ہیں، چھا جاتی ہیں، ان کی دوشیزگی کا احوال سنکر اچھا لگا، خولہ عرفان ہمیشہ عمدہ اور تفصیلی تبصرے

کے ساتھ حاضر ہوتی ہیں، شمارے کی خوبصورتی کیساتھ انصاف کرتی ہیں۔ باقی قارئین و مصنفین نے بھی دلچسپ لکھا۔ ماہرہ خان اور شیف محبوب سے ملاقات اچھی رہی، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ماہرہ خان اسٹائل آئیکون ضرور ہونگی مگر انہیں، ایکٹنگ گرو ماننا، باقی قابل اداکاروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ شمارے کے تخلیقی حصے میں، میں سب سے پہلے، افسانے پڑھتی ہوں، سب ہی افسانے بہت اچھے تھے۔ نجیب عمر کی منظر نگاری اچھی لگی۔ میاں بیوی کے باہمی رشتے اور اس کی نازکی پر ماریہ یاسر نے اچھا لکھا۔ متاع حیات تھے وہ، میں ذرا شدت پسندی محسوس ہوئی، انداز تحریر، بہرحال اچھا تھا۔ زمرنعیم تو خیر جب بھی لکھتی ہیں اچھا لکھتی ہیں۔ حبیبہ عمر کے انداز تحریر میں پختگی ہے۔

✍: پیاری لڑکی...... کہاں ہو تم...... کب سے منتظر ہوں تمہاری تحریر کی اور یہ کیا اپنا فون کیوں نہیں اٹھاتی ہو کتنی بار ٹرائی کیا مگر یہ خوشی ہے کہ تم نے آدھی ملاقات کا فیصلہ تو کیا تمہاری پسندیدگی لکھاریوں تک پہنچادی ہے یقیناً وہ بھی اچھا محسوس کریں گے اور اب اچھے بچوں کی طرح فوراً ایک زبردست سا ناولٹ ارسال کرو۔

✉: عقیلہ حق کراچی سے لکھتی ہیں۔ بہت پیاری سی منزہ! کیسی ہیں؟ الحمدللہ دوشیزہ مل گیا گویا تھوڑی دیر سے ملا مگر مل تو گیا' ویسے خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح بہت اچھی رہی' جب بھی بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں تو بے ساختہ غزالہ رشید یاد آجاتی ہیں کہ میرا پہلا تبصرہ اور پہلا افسانہ اُن کی ادارت میں شائع ہوا تھا' لیکن اُن کو شاید میں یاد نہیں آتی منزہ آپ اکثر و بیشتر میری تصویریں لگاتی رہا کریں تاکہ میں اُن لوگوں کو یاد آتی رہوں جو مجھے بھول جاتے ہیں بھول جاتے ہیں سے یاد آیا کہ یہ تو میں بھول ہی گئی کہ میں رسالہ پر تبصرہ کررہی ہوں تو نقش قدم کے بارے میں پڑھا بہت اچھا رہے گا' میں اپنی سی وی بھیج دوں (ہاہاہا) شیف محبت اپنی بیگم کو کتنے محبوب ہوں گے جب وہ اُن کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتے ہوں گے۔ ماہرہ خان سے ملاقات اچھی رہی ماہرہ ایک خوش شکل اور باصلاحیت اداکارہ ہیں۔ نسرین اختر کے ناول کی قسط اچھی رہی۔ زمرنعیم ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سکینہ فرخ کی تحریر ہمیشہ کی طرح زبردست...... نفیسہ سعید کی تحریر بس مناسب رہی کچھ اُلجھی اُلجھی سی...... فرحت صدیقی صاحبہ زندگی واقعی خوبصورت ہے لیکن کبھی ہم اُس کو بدصورت اور مشکل بنادیتے ہیں کبھی ہمارے آس پاس کے لوگ...... آداب محبت اچھا موضوع تھا گو کہ پرانا تھا متاع حیات تھے وہ...... آئی ایم سوری اِس طرح ایک محبت کے لیے سارے خاندان کی عزت کو پامال کرنے والی لڑکیاں کم از کم مجھے پسند نہیں...... اگر ریا اتنی ہی نڈر تھی تو منع کردیتی سارے خاندان کی عزت کا جنازہ تو نہ نکالتی' میرے نزدیک ایسی لڑکیاں بس لڑکیاں ہوتی ہیں' بیٹیاں اور بہنیں نہیں ہوتیں۔ ماشاءاللہ تحسین انجم صاحبہ ایک خوبصورت تحریر ہے آپ کی۔ ام مریم ہمیشہ کی طرح عمدہ تحریر لے کر آئیں۔ ثمینہ فیاض نے بالکل صحیح لکھا آج اپنی اولاد اور گھر والوں کو آسائشات دینے کی دھن میں ہم اُن ہی کو کھو دیتے ہیں۔ پہلے کے ماں باپ کو یہ بھی یاد ہوتا تھا کہ اُن کی کونسی اولاد نے پہلا جملہ کیا کہا تھا اور پہلا قدم کب اٹھایا تھا مگر آج کل کیا کہوں اور کیا لکھوں؟ ماریا یاسر کی ہلکی پھلکی تحریریں بھی خوب رہیں۔ جتنا پڑھا تبصرہ

حاضر ہے باقی مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بہت اچھے جا رہے ہیں۔ دوشیزہ گلستان بہت خوبصورت گل و بوٹے لے کر جگمگا تا رہتا ہے خولہ عرفان کی ڈائری اچھی رہی۔ میرا تبصرہ خود بخود افسانہ بن جاتا ہے۔ لیکن کیا کروں بہت کچھ لکھنا ہوتا ہے لیکن زندگی کتنی مصروف ہوگئی ہے اس کا تصور محال ہے۔ زندگی کے دوڑتے بھاگتے لمحوں میں سے اپنے پیاروں کے لیے وقت نکالنا ہی محبت ہے اور مجھے آپ سب سے محبت ہے۔

ج: جان دوشیزہ! آپ کے خط کا تو سب کو انتظار رہتا ہے مگر یہ لائن خوب لکھی بھول جانے سے یاد آیا کہ یہ تو میں بھول ہی گئی کہ تبصرہ کرنا تھا...... عقیلہ تو پھر عقیلہ ہیں...... اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہم سے محبت ہے باقی محبت کا ثبوت وہ لوگ دیں گے جن کی تحریر کے بارے میں آپ نے اپنی قیمتی آراء دی ہے۔

✉: حبیبہ عمیر لاہور سے لکھتی ہیں۔ بہت پیاری منزہ جی! سلام! خدائے بزرگ و برتر سے آپ سب کی خیریت مطلوب ہے۔ سب سے پہلے تو معذرت کہ کافی عرصے بعد آئی ہوں لیکن کیا کریں ہم بھی دنیا کے دھندوں میں ایسے الجھتے ہیں کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا اور یاد تب آتا ہے جب وقت گزر جاتا ہے۔ خیر کوئی نہیں مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ اب ذرا کام کی بات ہو جائے ہاتھ میں دوشیزہ ذرا تاخیر سے موصول ہوا جھٹ سے کھولا اور سب سے پہلے اس کی محفل میں پہنچ گئی۔ ان تمام لوگوں کا شکریہ جنھوں نے تیر نیم کش کو پڑھا اور اپنی قیمتی آراء دیں مجھے باقی لوگوں کی بھی رائے کا انتظار رہے گا۔ محفلِ دوستاں کو پڑھ کر یہ احساس شدت سے جاگا کہ آپ سب لاہور کیوں نہیں رہتے تاکہ میں بھی آپ سب سے اسی طرح مل پاؤں جیسے باقی سب۔۔ اس بار کا دوشیزہ بھی اپنے سبھی رنگ لیے تھا جتنا بھی پڑھ پائی وہ بہت خوب تھا۔ سینئر رائٹرز کو پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کی نئے لکھاری اچھا نہیں لکھتے وہ بھی بہت خوب لکھتے ہیں اللہ سب کے قلموں میں اور برکت ڈالے آمین۔ اس بار چونکہ عید رنگ تھا تو سبھی کہانیاں اسی کی مناسبت سے سجائی گئی تھیں جو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ باقی کے سبھی رنگ بھی اچھے تھے۔ چلیں اب اجازت چاہوں گی کیونکہ میرا بیٹا اٹھ گیا ہے۔ آخر میں ملکِ پاکستان کے لیئے دعا کی اللہ اسے ہر بری نظر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

ج: چندا حبیبہ! تمہارا خط بالکل ایسا ہی ہے جیسا ننھے منے بچوں کی اماں کا ہوتا ہے جو خود بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہوتیں مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب میں بڑوں کا ادب کرنے والے بچوں سے مخاطب ہوتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت مصروف رہتی ہو مگر پھر بھی میرے کہنے پر وقت نکالتی ہو جو یقیناً تمہارے میاں اور بیٹے کا ہے۔ خوش رہو بچے تمہارا ناول اس ماہ مکمل ہوا رائے تمہیں مل رہی ہے۔ جو آئندہ تمہارے بہت کام آئے گی۔ اسی طرح لکھتی رہو۔

✉: فرحت صدیقی، فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ بہت پیاری منزہ، السلام علیکم! اگست کا آزادی نمبر دیکھا دل خوش ہوگیا۔ خوبصورت ٹائٹل اور پھر ان پر لکھے ہوئے خوبصورت ہی نام...... زندہ باد منزہ، بہت عرصے بعد یہ خوشی ملی ہے کہ اپنا نام ٹائٹل پر دیکھا۔ 80، 81 میں پاکیزہ کا اشتہار اخبار میں آیا کرتا

تھا۔ کہ نیا شمارہ آ گیا ہے اس میں میرا نام دیکھ کر میرے ابو بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ رقص جنوں میں بھول چکی تھی۔ بہت شکریہ' تقریباً تین سال پہلے یہ کہانی لکھی تھی۔ آپ کے پاس میری دو کہانیاں کینڈی کرش اور 'نتھیا گلی میں گرم کافی کا کپ' ہوں گی آپ سے فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ جیسے مدت کے بعد کسی اپنے سے بات ہوئی ہو۔ اداریہ میرے دل کی آواز تھا۔ زندگی بار بار موقع نہیں دیتی۔ بلکہ زندگی اک بار ہی ملتی ہے اور اس میں موقع بھی قسمت والوں کو ملتا ہے۔ انشاء اللہ بچھڑے ہوئے پاکستانی کو ہم ضرور ڈھونڈ کر ہی اب ووٹ دیں گے۔ حضرت بلال حبشی کا عشق اور اُن کی آواز کو کون مسلمان نہیں جانتا۔ رسول پاک ﷺ کا سچا شیدائی تھا۔ دوشیزہ کی محفل میں سب سے ملاقات ہوگئی بہت اچھا لگا۔ نسرین اختر نینا کا لکھنے کا اسلوب بہت شاندار ہے۔ پہلی قسط ہی دل کو چھوگئی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ...... مثلث حقیقت تلخ حقیقت کا آئینہ' بیٹی کے دکھ سکھ والدین کو کبھی زندہ کر دیتے ہیں اور کبھی مردہ...... بیٹی بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس لیے اُس کے نصیب کی بات لوگ کرتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس کا نصیب اچھا کرے۔ دکھ دینے والے کو دکھ سہنے بھی پڑتے ہیں۔ لیکن اس کا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بے جا سختی ہی بچیوں کو گھر سے باہر جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔ نفیسہ سعید کی کہانی بھی حقیقت ہے۔ تم محبت کے آداب سے واقف نہیں بے حد خوبصورت کہانی' اس کا انجام دکھی کر گیا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ ناول بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ مگر اگلی قسط کے آنے تک جو بے چینی رہتی ہے۔ اس کا کیا کریں؟ ملال عمر بھر کا ہے۔ فرح نے بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ جو عزت اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر جانے مین ہے۔ وہ اس طرح شادی کرنے میں کم ہوتی ہے۔ باقی ساری کہانیاں اچھی ہیں۔ قیمہ بھرا پراٹھا اور چکن پکوڑے' برسات کی سوغات ہیں۔ اب برسات کہاں آتی ہیں؟ بارشیں روٹھ گئی ہیں۔ نجانے کیوں۔

میری طرف سے آپ سب کو بہت بہت سلام' انشاء اللہ پوری کوشش کروں گی۔ کہ ہر ماہ محفل میں شامل ہوسکوں۔ منزہ آپ کے لیے بہت ساری دعائیں خدا آپ کو بہت ساری خوشیاں دیں آمین ثم آمین۔

ٹھ: پیاری خولہ! آج 26 تاریخ ہے اور آپ کا خط پورے طمطرق سے آفس مین داخل ہوا اور پھر دوشیزہ کی محفل میں براجمان ہوگیا' شکریہ...... شاعری بہت ہی بہترین ہے الگ سے باکس لگا رہی ہوں۔ باقی مصنفین خود شکریہ ادا کریں گے۔ فرحت! دوشیزہ آپ کا اپنا ڈائجسٹ ہے آپ کو اپنے درمیان پا کر مجھے بہت اچھا لگا میں اسی طرح تبصرہ ہر ماہ روانہ کیجیے دیکھیے میں نے آپ کے دونوں خط شائع کیے ہیں یہ خط بالکل آخری لمحات میں ملا لیکن کیونکہ سینئر لکھاریوں کی رائے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس لیے میں نے کاپی روک کر آپ کا خط شامل کرلیا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دوشیزہ کے حصول میں اگر کوئی بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے...... خوش رہیے خوش رکھیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

نیا سلسلہ وار ناول

قسط 2

ایک ایسی مضبوط لڑکی کی داستان جو زندگی سے لڑ کر جیتنا چاہتی تھی'
الجھنوں کو سلجھنوں میں تبدیل کرتی خوش رنگ تحریر

سلیم زاریہ کے ساتھ اپنی شادی پر بالکل بھی خوش نہیں تھا۔ ایک تو وہ اسے پسند نہیں تھی۔ چونکہ وہ خود خاصا خوش شکل اور ہینڈسم تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی انتہائی خوبصورت، اسمارٹ اور لمبے قد کی ہو۔ پھر کسی فلمی اداکارہ کی یا ٹی وی ایکٹریس کی طرح شوخ وشنگ اور ماڈرن بھی ہو جو اس کے ساتھ جہاں بھی جائے لوگ بس دیکھتے ہی رہ جائیں جبکہ زاریہ عام شکل وصورت کی تھی۔ اس کے بوٹے سے قد اور سانولی مائل گندمی رنگت کو وہ شدید ناپسند کرتا تھا۔ پھر وہ تھی بھی خاموش طبع اور لیے دیے رہنے والی مگر اس کی زاریہ کو ناپسند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو امریکہ یا انگلینڈ کی شہری ہوتی اور جس کی وساطت سے وہ باہر جا سکتا یا پھر اس کے سسرال والے اس قدر امیر ہوتے کہ اسے نا صرف جہیز میں کار، کوٹھی دیتے بلکہ اتنا بینک بیلنس بھی ہوتا کہ جس سے وہ با آسانی باہر جا سکتا۔ مگر یہاں تو سوائے بیوی کے اسے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ عابدہ چوہدری نے اسے نوکری کا لالچ دے کر کسی طرح اس شادی پر آمادہ کر لیا تھا اور یہ بھی سبز باغ دکھایا تھا کہ ایک ہی بیٹی ہے اس لیے خوب جہیز اور جائیداد ملے گی۔ یہ بھی باور کرایا تھا کہ لڑکی بھی سیدھی سادی ہے، لڑاکا فطرت کی ہے نہ اس سے کوئی ڈیمانڈ کرے گی اس کی ساری تنخواہ اس کے قبضے میں ہوگی اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ زاریہ پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ لا کر سلیم کو دے دیتی تھی کہ وہ اپنی تنخواہ کے ساتھ ملا کر جس طرح مرضی خرچ کرے۔ مکان کا کرایہ اور گھر کے سارے اخراجات با آسانی زاریہ کی تنخواہ سے پورے ہو جاتے تھے بلکہ زاریہ کو اس کی ضروریات کے لیے کچھ رقم دے کر بھی تھوڑے بہت پیسے بچ جاتے تھے۔ تب سستا زمانہ تھا آج کل کی طرح ہوشربا مہنگائی نہیں تھی ہر چیز کی قیمتیں اعتدال پر تھیں اس لیے بخوبی گزارا ہو جاتا تھا۔

سلیم کی اپنی ساری تنخواہ بچ جاتی تھی۔ گھر کے سارے کام کاج زاریہ خود ہی کرتی تھی۔ دو بندوں کے کام ہی کتنے ہوتے تھے۔ مگر اس پر بھی

سلیم مطمئن نہ تھا وہ ہر وقت زارا یہ سے کہتا رہتا کہ وہ اپنے بھائی سے کہہ کر مکان بکوا کر اپنا حصہ لے تا کہ وہ باہر جا سکے اس پر زارا یہ سلیم سے کہتی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی اچھی اور پر سکون زندگی ہے ہماری اور کیا چاہیے آپ کو؟''

''ہوں یہ پر سکون زندگی ہے۔ گندے علاقے میں دو کمروں کا مکان تیسری منزل پہ پورشن معمولی سا کھانا اور سستے کپڑے! معاف کرنا محترمہ میں نے ایسی زندگی گزارنے کا کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا اور آج تو ہم دو ہیں کل ہمارے بچے ہوں گے تو کیا وہ بھی ایسے ہی حالات میں زندگی بسر کریں گے۔ نہ ان کو اچھی خوراک ملے گی، نہ لباس اور نہ ہی ان کی اچھی تعلیم و تربیت ہو سکے گی۔ میں تو یہ سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں کہ ہمارے بچے ایسے ماحول میں پلیں بڑھیں گے، پاکستان میں ہم چاہے ساری زندگی محنت و مشقت کی چکی میں پستے رہیں تب بھی کسی اچھے علاقے میں ایک بہتر گھر بنانے کا نہیں سوچ سکتے۔'' سلیم زہر خند لہجے میں کہتا۔

''مگر سلیم کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے اس ملک میں رہ کر ہی ترقی کی ہے کبھی وہ ہم سے بھی بدتر حالات میں رہتے تھے اور آج پوش ایریاز میں بڑے بڑے بنگلوں میں رہ رہے ہیں اور یہ سب ان کی محنت ہی کا صلہ ہے...... آپ کوشش کر کے اپنی تعلیم مکمل کریں پھر آپ کو کسی اچھے ادارے میں زیادہ بہتر ملازمت مل جائے گی۔ ابھی آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے آپ سرکاری ملازمت کے لیے بھی ٹرائی کر سکتے ہیں۔ انسان کوشش کرے تو کئی راستے کھل سکتے ہیں۔''

''سوری میڈم! میں اس طرح تنکے تنکے جوڑ کر آشیانہ بنانے کا قائل نہیں، مجھے تو فوری طور پر اپنا شاندار مستقبل بنانا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ میں یورپ یا امریکہ جا کر پہلے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اور پھر وہیں رہ کر ڈالرز کماؤں اور چند سالوں ہی میں ہمارے پاس دنیا کی ہر نعمت ہو گی۔ پھر یوں سسک سسک کر زندگی نہیں گزارنی پڑے گی۔ مگر اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم اپنے مکان میں حصہ لے لو دوسرے کالج سے قرضہ۔ بس مجھے تین چار لاکھ روپے چاہئیں جو میں چند سالوں ہی میں تمہیں لوٹا دوں گا۔'' سلیم نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ سلیم! میرے اور آپ کے پیسے دو ہیں جو آپ واپس لوٹانے کی بات کرتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے پاس کچھ ہو تو میں آپ کو دوں نا میری ابھی محض دو سال کی ملازمت ہے اتنی کم ملازمت پر گورنمنٹ قرضہ نہیں دیتی۔ رہی مکان بیچنے کی بات تو اندرون شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں قید میرے مکان کے کتنے پیسے مل جائیں گے، بالفرض مکان مناسب قیمت پر بک بھی جائے تو میرے گھر والے کہاں رہیں گے؟ ابا اس قدر بیمار ہیں کہ ڈاکٹروں نے ان کی صحت سے مایوسی ظاہر کر دی ہے وہ صرف دواؤں اور اچھی خوراک کے سہارے اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گزار رہے ہیں۔ چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے۔ بڑا سارا دن محنت کرتا ہے تب کہیں جا کر اتنے پیسے کما سکتا ہے کہ جس سے گھر کا خرچہ پورا ہو سکے۔ اس کی بیوی ہے آپ نہیں جانتے وہ کس طرح بمشکل زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہے۔ اس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ مجھے تو اپنے بھائی کو یوں کولہو کے بیل کی طرح مشقت کرتے دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ ایک تو ابا نے اتنی چھوٹی عمر میں اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا ہے بیوی بھی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے کہ وہ کہیں ملازمت کر کے اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ عجیب سے حالات ہیں ہمارے بھی۔''

زارا یہ ایک سرد آہ بھر کر کہتی۔

''ہاں اپنے والدین اور بھائی کی بہت فکر ہے تمہیں اور میرا خیال نہیں، پتہ نہیں عابدہ آپا نے بھی بغیر سوچے سمجھے کیسے کنگلے لوگوں میں پھنسا دیا ہے مجھے۔'' سلیم بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر بالآخر ایک روز زارا یہ نے اپنے کالج کی پرنسپل سے قرضے کے لیے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا، وہ کالج پہنچی اور اپنی کلاس لے کر اس نے دیکھا کہ پرنسپل سامنے لان میں اکیلی دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہیں تو وہ جھجکتے ہوئے ان کے پاس گئی۔

''السلام علیکم! میڈم......''

''وعلیکم السلام! زارا یہ بیٹی، کیسی ہو آؤ بیٹھو یہاں، فارغ ہونا؟'' ادھیڑ عمر کی پرنسپل نے شفیق لہجے میں کہا۔

''جی میڈم!'' زارا یہ نے ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیسی جا رہی ہیں تمہاری کلاسز، کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' میڈم نے پوچھا

''نہیں میڈم کلاسز تو ٹھیک جا رہی ہیں، اب تو تقریباً کورس سارا مکمل ہوگیا اور Revision چل رہی ہے۔ اکثر ٹیسٹ لیتی ہوں ساتھ ساتھ پریکٹیکلز بھی ہو رہے ہیں۔ اسٹوڈنٹس خاصی محنتی ہیں۔ خاص کر FSc کی رمشا بہت ذہین اور محنتی ہے۔ انشاء اللہ وہ بورڈ میں ضرور ٹاپ کرے گی۔'' زارا یہ نے اپنی ایک اسٹوڈنٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں رمشا بہت لائق فائق بچی ہے۔ اس کی میٹرک میں بھی بہت اچھی پوزیشن تھی۔ تمہیں پتہ ہے زارا یہ وہ کالج کے غریب چوکیدار عزیز بابا کی بیٹی ہے اگر اس نے پوزیشن لے لی تو کالج کا نام روشن کرے گی۔ انشاء اللہ اس کے میڈیکل کالج کے تمام اخراجات کالج فنڈ سے ادا کیے جائیں گے کیونکہ ایسے محنتی بچوں کی حوصلہ افزائی ضرور کرنی چاہیے۔'' پرنسپل نے کہا

''اچھا......؟ میڈم مجھے علم نہیں تھا کہ رمشاء عزیز بابا کی بیٹی ہے۔ عزیز بابا خود بھی بہت اچھے، شفیق اور غیور انسان ہیں انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔'' زارا یہ نے ستائشی انداز میں کہا۔

''ہاں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ذہانت کسی کی میراث نہیں۔ ایک غریب کے گھر میں بھی ایسے ذہین بچے جنم لے سکتے ہیں اصل بات صرف یہ ہے کہ ان کی ذہانت اور محنت کی حوصلہ افزائی کی جائے ورنہ تو بے چارے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بچپن سے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کاموں میں جت جاتے ہیں۔ مگر عزیز بابا کی یہ بات ہے کہ وہ دو جگہ ملازمتیں کر رہا ہے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے۔ رمشاء کے علاوہ اس کی دوسری دو بہنیں اور بھائی بھی اسی کی طرح ذہین اور محنتی ہیں اور یہ سارے بچے ایک روز ضرور کامیاب ہوں گے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''انشاء اللہ!'' زارا یہ نے کہا اور پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی ''میڈم مجھے آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنی تھی۔''

''ہاں......ہاں بولو!''

''وہ دراصل مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے کیا مجھے قرضہ مل سکتا ہے۔ میں ساتھ ساتھ اپنی تنخواہ سے کٹواتی رہوں گی۔'' بالآخر زارا یہ نے جھجکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''ہاں! کیوں نہیں، ...... کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''یہی...... دو لاکھ تک۔''

''ٹھیک ہے۔ تم درخواست دے دو۔ میں

تمہاری اپلیکیشن فارورڈ کردوں گی۔ کچھ عرصے بعد منظوری ہو جائے گی لیکن اس بات کا انحصار اس پر ہے کہ پہلے لسٹ میں کتنے لوگ ہیں کیونکہ بہت سے لوگ قرضے کے لیے درخواستیں دیتے ہیں اور پھر باری آنے پر منظوری ہوتی ہے۔''

''تھینک یو میڈم! میں کل ہی اپلیکیشن دے دوں گی' اچھا میڈم اب میں چلتی ہوں۔ میں نے فرسٹ ائیر پری انجینئرنگ کو پریکٹکل کروانا ہے۔''

''ٹھیک ہے زاریہ جاؤ تم۔ قرضے کے بارے میں فکر نہ کرنا انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور ہاں مجھے تم سے ایک اور بات کرنی تھی۔'' یہ کہہ کر پرنسپل ایک لمحے کے لیے رک گئیں۔

''جی میڈم کہیے۔'' زاریہ کرسی سے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئی۔

''وہ......دراصل دیکھو تم میری بہنوں جیسی ہو۔اس کے علاوہ تم بہت اچھی اسٹاف ممبر ہو۔ بہت محنت سے بچوں کو پڑھاتی ہو تمہاری اسٹوڈنٹس تم سے بہت خوش ہیں اور تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہیں مگر تمہاری کولیگز تم سے خوش نہیں ہیں۔''

''مگر کیوں......؟ میں نے تو کبھی کسی کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح بات کرتی ہوں۔ ویسے بھی میرا زیادہ تر وقت تو کلاسز لینے اور پریکٹیکل کرانے میں گزر جاتا ہے باقی سارا وقت تو میں لیب ہی میں گزارتی ہوں۔ میں تو بہت کم اسٹاف روم میں جاتی ہوں پھر میری کولیگز کو مجھ سے کیوں شکایتیں ہیں؟'' زاریہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی تو انہیں شکایت ہے کہ تم الگ تھلگ رہتی ہو کسی سے گھل مل کر بات نہیں کرتی ہو، وہ لوگ سمجھتی ہیں کہ تم خود کو ان سے برتر سمجھتی ہو اس لیے ان کی کمپنی پسند نہیں کرتی ہو' پرنسپل نے ٹیچرز کی شکایتیں من وعن زاریہ کے گوش گزار کر دیں۔

''دراصل میڈم میری شروع ہی سے الگ تھلگ رہنے اور کم بولنے کی عادت ہے۔ اسٹاف روم میں جا کر بیٹھوں بھی تو میں زیادہ بات چیت نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے ورنہ میں کیا ہوں اور میری بساط کیا ہے خدا نہ کرے کہ میں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنا شروع کردوں۔''

''ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ایک مہذب، بااخلاق اور لیے دیئے رہنے والی لڑکی ہو، نہ کسی کی اچھائی میں نہ کسی کی برائی میں پڑتی ہو مگر پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے اسٹاف روم میں جا کر بیٹھا کرو۔ دوسری اسٹاف ممبر سے بات چیت کیا کرو تاکہ لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں کرنے کا موقع نہ ملے۔''

''ٹھیک ہے میڈم میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔'' زاریہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔ زاریہ تم جاؤ اپنا کام کرو میں نے تمہارا کافی ٹائم لے لیا۔'' پرنسپل نے اپنے سامنے پڑے ایک انگلش اخبار کو اٹھا کر کہا

''نہیں، نہیں میڈم بلکہ میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اتنے اچھے طریقے سے گائیڈ کیا۔'' یہ کہہ کر زاریہ لیب کی جانب چلی گئی۔

اس کے بعد زاریہ کی کوشش ہوتی کہ زیادہ نہیں تو کم از کم بریک کے وقت اسٹاف روم میں ضرور بیٹھا کرے۔ اس نے ٹی کلب بھی جوائن کر لیا تھا پہلے وہ لیب میں ٹی بیگ والی چائے چپراسی سے بنوا لیتی تھی اور کھانے کے لیے کبھی گھر سے سینڈوچ وغیرہ لے آتی تھی یا پھر کالج کینٹین سے سموسے، بسکٹ یا پیٹیز وغیرہ منگوا لیتی تھی مگر ٹی کلب جوائن کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ چائے اور سموسے وغیرہ ٹی کلب کی طرف سے ہی سرو کیے جاتے تھے اس مقصد کے لیے کچھ رقم ہر ماہ جمع کرانی پڑتی تھی اگرچہ زاریہ

اپنی عادت کے مطابق اسٹاف روم میں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی کوئی ٹیچر اسے مخاطب کرتی اور کوئی بات پوچھتی تو وہ نہایت اخلاق سے جواب دے دیتی تھی۔ زیادہ تر خواتین تو اپنی ذاتی باتیں ہی مگن رہتی، کسی کو اپنے شوہر سے شکایتیں ہوتیں تو کوئی ساس' نند کے روایتی اختلافات کے متعلق باتیں کرتیں، کچھ اپنے بچوں کے متعلق طرح طرح کی پریشانیاں بیان کرتیں کہ شرارتی بہت ہیں پڑھتے نہیں بلکہ جھگڑتے رہتے ہیں۔ اکثر الم غلم کھانے کی وجہ سے بیمار رہتے ہیں، پر اپر کھانا نہیں کھاتے مگر بازاری چیزوں برگر، پیزا اور فرنچ فرائز کے دیوانے ہیں۔ میٹھی چیزیں کھا کھا کر اپنے دانتوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں کسی کو یہ مسئلہ تھا کہ اس کے بچے فروٹ اور سبزیاں اور روٹی کھانے کے بجائے بس ہر وقت چپس اور برگر ہی مانگتے رہتے ہیں، غرضیکہ اِن خواتین کی باتوں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں ہر ایک سے بس شکایتیں ہی شکایتیں ہیں' کسی کو یہ گلہ کہ ان کو صبح صبح کالج آنا پڑتا ہے کہ اس کا فرسٹ پیریڈ لگا دیا گیا ہے۔ نیند ہی پوری نہیں ہوتی۔

زاریہ کو ان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور گزیٹڈ گریڈ کی حامل خواتین کی باتیں سن سن کر حیرت ہوتی تھی۔ دو یا تین پیریڈ پڑھانے پڑتے ہیں، اکثر بریک کے بعد گھروں کو سدھار جاتی تھیں مگر انہیں یہ چند گھنٹے بھی کالج میں گزارنا دوبھر ہوتا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بہانے چھٹیاں لیتی رہتیں۔ غرض سال کی اٹھارہ Casual لیوز ملتی ہیں جو شروع کے مہینوں میں ہی پوری کر لیتی تھیں پھر بھی ہر وقت یہ کہتی رہتیں کہ ابھی تو ہماری بہت سی چھٹیاں باقی ہیں ہم تو چھٹیاں کرتی ہی نہیں حالانکہ پرنسپل ہر میٹنگ کے موقع پر یہ زور دے کر کہتیں کہ اتفاقی چھٹیاں ان کا حق نہیں یہ محض انہیں ایک سہولت ہے مگر مجال ہے کہ کوئی ان کی بات پر کان دھرے تنگ آ کر انہوں نے اسٹاف روم میں حاضری رجسٹر رکھنا شروع کر دیا اس پر بھی سب کے منہ بن گئے کہ وہ گزیٹڈ آفیسرز ہیں حاضری رجسٹر پر سائن کرنا ان کی توہین ہے۔ کچھ محترمائیں یہ کرتی تھیں کہ چھٹی کرنے کے بعد اگلے دن آ کر چھٹی والے دن کی بھی حاضری لگا لیتیں۔ حالانکہ پرنسپل نے اس دن ان کی غیر حاضری لگائی ہوئی ہوتی کیونکہ وہ چھٹی کے وقت رجسٹر آفس میں منگوا کر ساری تحقیق کر کے کہ کون کون محترمہ غیر حاضر ہے اس کے نام کے سامنے ریڈ پینسل سے دائرہ لگا دیتی تھیں۔

زاریہ نے نوٹ کیا کہ زیادہ تر ایسی خواتین کا تعلق اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔ وہ اپنی گاڑیاں ڈرائیو کر کے آتی تھیں ان کے شوہر بھی بڑے عہدوں پر فائز تھے مگر محض شوقیہ اور گھر سے نکلنے کا بہانہ کر کے کالج آتی تھیں۔ انہیں نہ پڑھانے سے دلچسپی تھی نہ ہی اسٹوڈنٹس کے مستقبل سے کوئی غرض' وہ محض کچھ وقت اچھا گزارنے کے لیے آتی تھیں۔ نت نئے فیشن کے کپڑے پہنے، میک اپ کیا، الٹا سیدھا پڑھایا اور پھر اسٹاف روم میں بیٹھ کر گپ شپ لگائی، چائے پی، فیشن، فلموں، ٹی وی ڈراموں کو ڈسکس کیا گھر کے مسائل پر باتیں کیں ساس، نندوں اور دیورانیوں، جٹھانیوں کی برائیاں کیں، دل کا بوجھ ہلکا کر کے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا!۔

مگر ایسی چند ایک خواتین تھیں زیادہ تر محنتی اور اپنے کام سے لگاؤ رکھنے والی محنتی اور ذہین، ملازمت ان کا شوق ہی نہیں ضرورت بھی تھی۔ کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کسی کے والد نہیں تھے اور کسی کا شوہر بیروزگار تھا یا پھر زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے اچھی ملازمت نہیں کر سکتا تھا اور یوں گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بیوی کو بھی ملازمت کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ یہ سب

ٹیچرز نہایت توجہ سے پڑھاتی تھیں۔ بلاضرورت چھٹی کرتی تھیں نہ ہی کالج سے انہیں شکایت ہوتی تھی کہ ان کے پیریڈز زیادہ ہیں یا کلاسز کے اوقات صحیح نہیں۔ زیادہ تر پبلک ٹرانسپورٹ ہی استعمال کرتی تھیں کسی کسی کو اس کے شوہر چھوڑ جاتے تھے مگر واپس اپنے طور پر ہی جاتی تھیں۔ کالج کی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے سارے کام بھی خود ہی کرتی تھیں۔ ایک آدھ کام کے لیے ہی ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ عام سے چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتی تھیں اور مسائل کے انبار تلے دبی ہوئی تھیں مگر پھر بھی کم ہی اپنے ذاتی مسئلے دوسروں سے بیان کرتی تھیں۔ زاریہ کا تعلق بھی اسی طرح کی ٹیچرز کے طبقے سے تھا جو اپنے کام کو مشن سمجھ کر کرتی تھیں اور یہ ملازمت ان کی زندگی کی گاڑی کو باعزت طور پر چلانے کا ذریعہ تھی۔ اس لیے وہ لگن سے کام کرتی تھیں اور اپنا فرض سمجھ کر ملازمت کرتی تھیں۔ کالج اسٹوڈنٹس اور گورنمنٹ پر سو سو احسان نہیں جتاتی تھیں کہ وہ اتنی محنت سے کام کرتی ہیں انہیں دوسرے محکموں کے افراد کی طرح مراعات حاصل نہیں یا ان کی قابلیت کے مقابلے میں معاوضہ کم دیا جاتا ہے۔

......☆......

ایک دن زاریہ کالج سے گھر آئی تو سلیم فیکٹری سے آیا ہوا تھا۔

''خیریت آج جلدی کیسے گھر آ گئے؟''

زاریہ نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو تین بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ جبکہ سلیم کی چھٹی فیکٹری سے پانچ بجے ہوتی تھی اور گھر پہنچتے پہنچتے عموماً ساڑھے چھ یا سات بج جایا کرتے تھے۔ اس لیے زاریہ خلاف توقع سلیم کو بے وقت گھر میں دیکھ کر بولی تھی۔

''وہ دراصل میں گجرات جا رہا ہوں۔ بہت دن ہو گئے ہیں گھر گئے ہوئے۔ عابدہ آپا روز ہی فون کر کے گلہ کرتی ہیں کہ تم آتے نہیں ہو کئی ماہ ہو گئے۔'' سلیم نے اپنا بیگ تیار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں واقعی بہت عرصہ ہوا ہے ہمیں آپا سے ملے ہوئے۔ آپ مجھ پہلے بتا دیتے تا کہ میں بھی چھٹی لے لیتی۔ اکٹھے ہی چلتے۔ عابدہ آپا کے علاوہ میڈم فیروزہ جلیل اور دوسری پرانی ساتھیوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔'' زاریہ نے اپنا ہینڈ بیگ وارڈ روب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''چلو پھر کبھی دوبارہ پروگرام بنائیں گے۔'' سلیم نے اپنے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھالیا آپ نے کیا؟'' زاریہ نے پوچھا۔

''ہاں وہ تو فیکٹری ہی میں لنچ بریک میں کھالیا تھا۔ اب تم مجھے چائے کا ایک کپ بنا دو تا کہ پھر میں نکلوں۔ سردی کا موسم ہے جلد ہی شام ہو جاتی ہے۔'' سلیم نے الماری سے کوٹ نکال کر پہنتے ہوئے کہا۔

چائے پی کر سلیم اور زاریہ اکٹھے گھر سے نکلے سلیم نے موٹر سائیکل پر زاریہ کو اس کے والدین کے گھر چھوڑا پھر اسی موٹر سائیکل پر شہروز سلیم کو لاری اڈے پر چھوڑ آیا جہاں سے اسے گجرات جانے والی ایک کوچ میں سیٹ مل گئی اور وہ شہروز کو خدا حافظ کہہ کر بس میں چڑھ گیا جبکہ شہروز کو بڑے دنوں بعد موٹر سائیکل ہاتھ لگی تھی گھر سے نکلتے ہوئے زاریہ نے اسے پانچ سو روپے بھی دے دیئے تھے اور اب شیروز صاحب کے لیے سلیم کی واپسی تک عیش ہی عیش تھے۔ اسے موٹر بائیک چلانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ پہلے وہ ابا کی پرانی سی پھٹیچر موٹر سائیکل کو تختہ مشق بناتا تھا پھر جب ذیشان نے نئی نکور موٹر سائیکل قسطوں پر لے لی تو کبھی کبھار چھٹی والے دن جب تک ذیشان سویا رہتا وہ اِدھر اُدھر

گھماتا رہتا۔ زاریہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے میٹرک کے امتحان میں اچھی پوزیشن لی تو وہ اسے موٹر سائیکل دے دی گی کیونکہ فی الحال تو وہ سلیم کی موٹر سائیکل کی قسطیں ادا کر رہی تھی اسے فیکٹری جانے آنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی اس لیے پھر زاریہ نے سے قسطوں پر موٹر سائیکل لے دی تھی۔ مگر وہ ادھر ادھر جانے کے لیے موٹر سائیکل فی الحال استعمال کرتا تھا فیکٹری روزانہ اس لیے نہیں لے جاتا تھا کہ وہاں سارا دن دھوپ میں کھڑی رہے گی یا پھر کوئی یار دوست مانگ لے گا پھر وہ اس سے بھی ڈرتا تھا کہ قسطوں کی موٹر سائیکل کو کوئی حادثہ غیرہ نہ ہو جائے یا نئی موٹر سائیکل ہے تو کوئی چوری نہ کر لے اس طرح الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں کہ موٹر سائیکل بھی ہاتھ سے جائے اور قسطیں الگ سے بھرنی پڑیں لیکن اصل مقصد اس کا کچھ اور تھا جو اس نے زاریہ کو نہیں بتایا تھا۔

......☆......

سلیم شام کو گھر پہنچا تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ عابدہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ بچے بھی ماموں، ماموں کہتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو گئے وہ لاری اڈے سے ان کے لیے پھل، مٹھائی اور چاکلیٹ، ٹافیاں وغیرہ لے کر گیا تھا مگر وہ نہ بچوں کو زیادہ لفٹ کرا رہا تھا نہ ہی عابدہ سے سیدھے منہ بات کر رہا تھا

''کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں خراب ہے زاریہ سے لڑائی جھگڑا ہو گیا کیا؟ جو یوں اچانک چلے آئے۔ اسے بھی ساتھ نہیں لے کر آئے؟'' عابدہ نے سلیم کا روکا پھیکا رویہ دیکھ کر استفسار کیا۔

''ہوں، زاریہ......! اس اللہ میاں کی گائے نے مجھ سے کیا لڑنا جھگڑنا ہے۔ وہ اس قابل ہی کب ہے۔ اس نے تو شاید چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے نہ کوئی بات چیت نہ ہی پڑھی لکھی ماڈرن لڑکیوں جیسے انداز واطوار۔ گھنٹوں کے حساب سے اس کے پاس بیٹھے رہو تو اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ بس چپ چاپ بیٹھی کوئی کتاب یا میگزین اخبار وغیرہ پڑھتی رہتی ہے کوئی بات کرو تو ہاں ہوں میں جواب دے کر پھر چپ ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی خاموشی بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے۔ اپنی انگلیاں مروڑتی رہتی ہے۔ مجھے تو دماغی طور پر کچھ کھسکی ہوئی لگتی ہے۔'' سلیم نے قدرے تیز لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔ اور دوبارہ گویا ہوا ''پتہ نہیں آپ نے کیا سوچ کر اس ڈل عورت کو میرے گلے میں ڈالا ہے۔ وہ کسی لحاظ سے میرے قابل نہیں ہے نہ شکل وصورت کے لحاظ سے نہ ہی عادتوں کے مطابق میں نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے کہ کس اچھی فیملی کی خوبصورت لڑکی سے شادی کروں گا جو مجھے امریکہ یا انگلینڈ بھجوا سکیں مگر میرے سارے خواب ہی خاک میں مل گئے۔ ایک غریب گھر کی مسکین سی عورت میرے پلے باندھ کر خود اپنی طرف سے فارغ ہو کر بیٹھ گئیں۔

''مجھے کیا پتہ تھا میرے بھائی کہ وہ ایسی ہوگی میڈم فیروزہ جلیل نے اس کی اتنی تعریفیں کی تھی کہ بہت اچھی ہے بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اکلوتی بیٹی ہے ایک ہی بھائی ہے لاہور کی رہنے والی ہے یہ ہے وہ ہے اور میں نے بھی سوچا کہ چلو ایک تو اچھی پڑھی لکھی برسر روزگار شریف لڑکی ہے اکلوتی بھی ہے اس لیے خوب جہیز اور کیش لائے گی تاکہ تمہارا باہر جانے کا سپنا پورا ہو سکے۔ اور پھر تمہیں اس کے اخراجات کے سلسلے میں کوئی فکر نہیں ہوگی کہ وہ ٹھیک ٹھاک کماتی ہے مجھے کیا پتہ تھا کہ سوائے نوکری اور تعلیم کے باقی سب کچھ جھوٹ کا پلندہ ہوگا'' عابدہ نے بھی متفکر لہجے میں کہا۔

''چلیے اس کی مالی حیثیت کے بارے میں تو آپ زیادہ نہیں جانتی تھیں مگر کم از کم اس کی عادتوں کا تو آپ کو علم ہونا چاہیے تھا دو سال سے وہ آپ کے

ساتھ کالج میں تھی کسی کو جاننے کے لیے تو چند روز ہی کافی ہوتے ہیں'' سلیم نے غصے سے کہا۔

''ہاں اس کی چپ چاپ اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کی وجہ سے سارا اسٹاف ہی اس سے دور رہتا تھا اور وہ خود بھی سوائے میرے اور میڈم فیروزہ کے کسی کو بھی زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی کچھ لوگ اسے مغرور کہتے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ وہ تھوڑی سی سائیکو کیس ہے اس لیے یوں خاموش اور الگ تھلگ رہتی ہے۔ اور کسی سے گھلتی ملتی نہیں ہے مگر میڈم فیروزہ کہتی تھیں کہ اصل میں وہ صرف کم گو ہے کیونکہ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن سے ایسی ہے ورنہ اور اس میں کوئی عیب نہیں حالانکہ کبھی کبھی مجھے بھی اس کی باتیں اور حرکتیں عجیب سی لگتی تھیں پھر وہ اکیلے کمرے میں سوتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ تب میڈم فیروزہ کے کمرے میں چلی جاتی تھی یا پھر مجھے کہتی تھی کہ میں کسی بچے کو اس کے پاس بھیج د یا کروں ایسا تب ہوتا جب اس کی روم میٹ کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاتی تھی تو میں سمجھتی تھی کہ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں اکثر لڑکیاں تنہائی اور اندھیرے سے ڈرتی ہیں مگر مجھے علم نہیں تھا کہ اس کی کنڈیشن اس قدر سیریس ہے۔ خیر جیسے تیسے اس سے جان چھڑاؤ۔ میری ایک دوست کی بہن ہے وہ سعودی عرب میں نرس ہے بڑی خوبصورت ہے روپیہ پیسہ بھی بہت ہے۔ اس کے پاس کیونکہ گزشتہ پانچ سال سے سعودی عرب میں کما رہی ہے' ہے بھی خوش مزاج اور تیز وطرار۔ میں تمہاری اس سے شادی کرادوں گی مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ یہ میں ایسے ہی میڈم فیروزہ کی باتوں میں آ گئی خود تو وہ ٹرانسفر کروا کر راولپنڈی چلی گئیں اور ہمیں زاریہ جیسی عورت کا تحفہ دے گئیں۔'' عابدہ نے بھی سلیم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''خیر اب تو میں آپ کے کہنے میں آ کر اندھا دھند کوئی بھی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ پہلے ہی آپ کے کہنے میں آ کر بھگت رہا ہوں۔ میرے دو قیمتی سال بھی ضائع کروا دیے۔ اگر پہلے ہی میں اچھی طرح چھان بین کر کے شادی کرتا تو آج بیرون ملک عیش کر رہا ہوتا۔'' سلیم نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں ...... اب سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوگا۔ میں تمہیں اپنی دوست فائقہ سے بھی ملوادوں گی اور اس کی بہن نرجس سے بھی مل لینا۔ اس کے بارے میں اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے ہی کوئی فیصلہ کرنا۔ میں اب تمہارے معاملے میں زیادہ دخل نہیں دوں گی۔ پہلے ہی جلد بازی پہ پچھتا رہی ہوں۔ یہ سارا میڈم فیروزہ کا کیا دھرا ہے۔'' عابدہ چوہدری نے سلیم کو باور کراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ ان لوگوں سے کوئی وعدے وعید نہ کیجیے گا جب تک کہ میں اوکے نہ کروں۔'' سلیم نے حتمی لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کی غرض سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور عابدہ چوہدری نے اسی وقت اپنی دوست فائقہ سے فون پر رابطہ کرلیا اس کی بہن نرجس آج کل ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آئی ہوئی تھی۔ اور وہ شدومد سے اس کی شادی کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر رہی تھی اسے سلیم بہت پسند تھا اور اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ نرجس کی شادی سلیم ہی سے ہو مگر جب عابدہ چوہدری نے زاریہ سے جھٹ پٹ بھائی کی شادی کر دی تو فائقہ بہت کبیدہ خاطر ہوئی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس نے کبھی واضح طور پر عابدہ سے اس خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا تھا اس کا خیال تھا کہ شاید عابدہ خود ہی اس کی بہن کے لیے سلیم کا رشتہ لے کر آ جائے گی اسی غلط فہمی کی وجہ سے نہ اس نے خود عابدہ سے بات کی اور نہ ہی عابدہ نے اس سلسلے میں اس سے رابطہ قائم کیا اور یوں دونوں کی بچپن کی گہری دوستی میں

دراڑیں سی پڑ گئی تھیں اور پھر جب فون پر عابدہ نے اسے اپنے بھائی کی بیوی کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتایا اور یہ بھی کہا کہ اس کا بھائی اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے تو فائقہ نے کوئی خاص گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اسے عابدہ سے گلہ تھا کہ جب اس کا بھائی کنوارا تھا تو تب اسے اس کی بہن کا خیال نہیں آیا اور جب پہلی بیوی پسند نہیں آئی تو اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اور وہ جانتی تھی کہ نرجس بھی شاید ایک طلاق یافتہ شخص سے شادی کرنا پسند نہ کرے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب نرجس فوراً ہی مان گئی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ سلیم کو بہت پسند کرتی ہے اور اسی لیے اس نے اب تک شادی بھی نہیں کی حالانکہ فائقہ نے اسے بہت سمجھایا کہ عابدہ اور اس کا بھائی لالچی قسم کے خودغرض لوگ ہیں اور وہ اپنی پہلی بیوی اتنی پڑھی لکھی اور کماؤ عورت کو بھی محض اس لیے طلاق دے رہا ہے کہ وہ اس کے لیے ڈھیروں جہیز لے کر نہیں آئی اور دوسرے اس کی باہر جانے کی خواہش پوری نہیں کر سکی۔

''تو اچھا ہے نا اس طرح اس کی جان تو چھوٹ جائے گی جبکہ میں اسے جہیز بھی من چاہا دے سکتی ہوں...... اور اسے باہر بھجوانے کی حیثیت بھی رکھتی ہوں۔'' نرجس نے خودغرضانہ لہجے میں کہا ''اور پھر باہر جا کر اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری کرنے کے بعد تم بھی اس کے معیار کے مطابق نہیں رہو گی...... اور وہ کسی تیسری کی تلاش شروع کر دے گا'' فائقہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہوں...... ایسا کر کے تو دیکھے میں اسے شوٹ کر دوں گی...... اور ویسے بھی میں اسے اکیلے تھوڑا ہی انگلینڈ جانے دوں گی۔ میں خود بھی اس کے ساتھ جاؤں گی اور میں بھی ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کروں گی۔ میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ اگلے چھ سات سال تک بغیر کوئی جاب کئے میں اپنی اور اس کی تعلیم کا خرچ اٹھا سکوں۔'' نرجس نے پراعتماد لہجے میں کہا تو جواب میں تو فائقہ خاموش ہو گئی اور پھر کچھ دنوں بعد جب عابدہ نے اسے اور نرجس کو اپنے گھر بلایا تو دونوں بہنیں مان گئیں۔ اور فروٹ اور مٹھائی کے ٹوکرے لے کر گھر آ گئیں۔ نرجس سلیم کے ساتھ بہت بے تکلفی سے دیر تک باتیں کرتی رہی اور سلیم بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوا...... اور یوں زاریہ سے علیحدگی کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ نرجس سے ملاقات کے دوسرے دن لاہور آ گیا اس نے پہلے زاریہ کو بتائے بغیر موٹر سائیکل اپنے ایک دوست کے ہاتھ فروخت کر دی۔ زاریہ کے پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ اس کے دوست کو کچھ دنوں کے لیے چاہیے تھی۔ چونکہ موٹر سائیکل قسطوں پر تھی اور ابھی اس کے کاغذات مکمل نہیں ملے تھے مگر اس کے دوست نے اسے کہہ دیا کہ جب قسطیں مکمل ہو جائیں گی تو وہ کاغذات بنوا لے گا۔ پھر سلیم نے بہانے سے زاریہ سے اس کے زیورات بھی لے لیے یہ سارے زیورات زاریہ کے والدین نے اسے دیئے تھے جبکہ عابدہ نے ولیمے کے روز زاریہ کو اپنے زیورات دیئے تھے وہ اس نے اسی شام کو اس سے واپس لے لیے تھے۔ فرنیچر اور دوسرے سامان کے بجائے ایک لاکھ روپے کا چیک ابا نے آفس سے ادھار لے کر زاریہ کو دیا تھا اور یہ چیک بھی سلیم نے اپنے نام سے بینک میں جمع کرا دیا تھا۔ البتہ زاریہ نے جو دو لاکھ روپے کے قرضے کی درخواست دی تھی وہ ابھی تک منظور نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ دو لاکھ بھی سلیم بٹور لیتا اور زاریہ بے چاری برسوں تک اپنی تنخواہ سے کٹواتی رہتی، چنانچہ جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں، بینک سے پیسے بھی اس نے نکلوا لیے۔ موٹر سائیکل کے پیسے بھی وصول ہو گئے تو وہ اپنا سارا ضروری سامان اور زاریہ کے زیورات لے کر ایک دن اس کی غیر موجودگی میں گھر سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ

فیکٹری سے اپنی جاب سے بھی استعفیٰ دے گیا تھا۔

زاریہ کالج سے گھر آئی تو اس کے کمرے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ایک لفافہ پڑا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا تو اندر ایک تہہ شدہ اسٹامپ پیپر تھا اس نے آہستگی سے اسٹامپ پیپر کی تہیں کھولیں اور جوں جوں اس پر تحریر شدہ الفاظ پڑھتی گئی اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا گیا اور پھر پورا کاغذ پڑھنے سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو کر بیڈ پر ڈھے گئی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا اسے یونہی بے ہوش اور بے سدھ پڑے ہوئے۔ وہ تو شہروز شام کو اس سے ملنے آیا تو اس نے دیکھا کہ گھر کا بیرونی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے گھر کی لائٹیں آن کیں اور زاریہ کو پکارتے ہوئے اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنے بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔

زاریہ کو رات گئے ہاسپٹل ہی میں جا کر ہوش آیا تھا۔ ڈاکٹرز نے یہی بتایا کہ انہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ ہوش میں آنے کے باوجود وہ گم سم تھی نہ کسی سے بات کر رہی تھی نہ ہی کچھ کھا پی رہی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر نے اسے ڈرپ لگا دی تھی تاکہ اسے کمزوری نہ ہو۔ دو تین دن وہ ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد گھر آئی تو وہ سرتاپا بدل چکی تھی۔ کھوئی کھوئی سی، زرد چہرے کے ساتھ وہ زندہ لاش سی محسوس ہوتی تھی اور تقریباً ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ کالج میں اس کی ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹرز کا یہی کہنا تھا کہ اسے ہر ممکن خوش رکھا جائے اور ہر قسم کے ذہنی دباؤ اور پریشانی سے بچایا جائے تبھی وہ اپنی سابقہ حالت میں واپس لوٹ کر آسکے گی ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ہمیشہ کے لیے ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔

ایک ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد زاریہ کی حالت اس حد تک سنبھلی کہ وہ کالج جا سکے۔ کم گو تو وہ ہمیشہ سے تھی مگر اب مزید خاموش رہنے لگی تھی بس میکانکی انداز میں روٹین کے کام انجام دیتی تھی۔ کالج وقت پر گئی۔ کلاسز لیں اور پریکٹیکل کروائے پھر گھر آ گئی۔ گھر آ کر بھابھی کے ساتھ مل کر دوپہر کا کھانا بنوایا برتن وغیرہ دھوئے کپڑے اگر دھونے اور استری کرنے ہوئے تو وہ کیے اور پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر بظاہر کتابیں پڑھتی رہتی یا پھر ٹی وی دیکھتی مگر اصل میں تو وہ سوچوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی رہتی تھی اسے اس بات کا دکھ نہیں تھا کہ سلیم نے اسے کیوں چھوڑا وہ اس سے عشق کرتی تھی نہ ہی اسے اس سے قلبی لگاؤ تھا کیونکہ اس قسم کے خود پسند، اکھڑ مزاج اور رعونت زدہ شخص کو خواہ کتنا ہی ہینڈسم ہو کوئی بھی پسند نہیں کرتا بس وہ اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے لیے قابل احترام تھا۔ تو وہ اس کے کام کر کے اور اس کا خیال رکھ کر خوشی محسوس کرتی تھی اس کی اپنی کوئی پسند اور خواہش تھی ہی نہیں نہ ہی وہ اس ٹائپ کی لڑکی تھی کہ آئیڈیلزم پر یقین رکھتی وہ تو شریف اور نیک طینت پڑھی لکھی سلجھی ہوئی انسان تھی اور اس کی بس ایک ہی تمنا تھی کہ اس کا شوہر بھی اس کی عزت کرے اور دونوں ایک پرسکون اور خوشیوں سے بھرپور زندگی گزاریں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا سلیم نے تو شروع ہی میں اپنی لالچی اور خود غرض فطرت کا مظاہرہ کر دیا تھا مگر پھر بھی زاریہ کی یہی کوشش تھی کہ اس کے شوہر کو اس سے کوئی شکایت کا موقع نہ ملے وہ اس کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی اس کے آرام اور کھانے کا خیال رکھتی کبھی اس سے کوئی فرمائش کی نہ ہی نئی نویلی دلہن کی طرح نازنخرے دکھلائے مگر سلیم کی فطرت ہی ایسی نہ تھی اور وہ تھا ہی ناشکرا اور بدنیت انسان۔ وہ تو اس سے چھٹکارا پانے کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا تھا مگر زاریہ اسے کوئی موقع ہی فراہم نہیں کرتی تھی۔ اس کی ہر جلی کٹی بات کو برداشت کرتی رہی اس کے تلخ رویے پر کسی قسم کا گلہ

شکوہ کرتی نہ ہی اپنے گھر والوں کو اس کی الٹی سیدھی شکایتیں لگاتی۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ اس کا گھر بچا رہے۔ گھر کے سارے اخراجات اور مکان کا کرایہ اس کی تنخواہ سے ہی ادا ہوتا۔ اس نے کبھی سلیم سے پلٹ کر نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا کماتا ہے؟ اور اس کی آمدنی کہاں جاتی ہے؟ وہ خود بھی کبھی کھسیانا ہو کر کہہ دیتا تھا کہ وہ باہر جانے کے لیے اپنی تنخواہ جمع کر رہا ہے تو جواب میں زاریہ چپ ہو رہتی تھی تب اتنی ہوشربا مہنگائی بھی نہیں تھی دو افراد کا خرچ ہی کتنا تھا، سادہ سا کھانا کھاتے تھے وہ بلکہ صبح کا ناشتہ گھر میں بنایا جاتا تھا۔ زاریہ عموماً کالج سے واپسی پر اپنی امی کی طرف چلی جاتی تھی دوپہر کا کھانا وہیں کھالیتی تھی۔ سلیم دوپہر کا کھانا فیکٹری میں ہی کھالیتا تھا شام کو فیکٹری سے واپسی پر اسے لیتا آتا تھا اور زاریہ رات کے لیے بھی امی کے یہاں سے سالن وغیرہ لے آتی تھی۔ رات کو دو تین چپاتیاں بنالیتی اور کبھی چاول پکالیتی تھی۔ بہت مرتبہ سلیم رات کا کھانا بھی باہر ہی سے کھا کر آتا تھا۔ اور پھر شام کو زاریہ کو آ کر گھر لے جاتا تھا۔ بس یہ تھی زاریہ کی شادی شدہ زندگی کی روٹین۔ نہ سلیم اسے گھمانے پھرانے لے جاتا نہ گجرات ہی کبھی اسے لے جانے کا کہا نہ کسی دوست کے گھر اس کو دعوت وغیرہ میں یا یونہی ملنے ملانے لے جاتا ایک مرتبہ شادی کے بعد زاریہ نے دبے لفظوں میں جب اسے کبھی اپنی دو تین مخصوص دوستوں کے گھروں پر دعوت میں لے جانے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور اس بے چاری کو الٹے سیدھے بہانے بنا کر اپنی گہری اور بے حد عزیز دوستوں سے معذرت کرنی پڑی مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان دوستوں سے اس نے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا کہاں تک بہانے بناتی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے گھر کے حالات اس کی دوستوں پر ظاہر ہوں نہ ہی وہ یہ جان سکیں کہ اس کا شوہر اسے ناپسند کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں نا کہ گھر بسانا یا اجاڑنا عورت پر منحصر ہوتا ہے اور اسی لیے زاریہ کی پوری کوشش تھی کہ خواہ سلیم کے رویے سے اسے کتنی ہی اذیت کیوں نہ پہنچے پھر بھی وہ برداشت سے کام لے گی اور دنیا والوں کو باتیں بنانے اور اسے موردالزام ٹھہرانے کا موقع نہیں دے گی کہ وہ اپنا گھر نہیں بسا سکی...... مگر گھر اس کا پھر بھی اجڑ ہی گیا اور اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ اس نے تو خلوص نیت سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کی تھیں مگر اس کا جیون ساتھی ہی مخلص نہیں تھا تو پھر بیل منڈھے کیسے چڑھتی؟ زاریہ کے ابا سعید احمد جو پہلے ہی نیم جان تھے اور محض دواؤں اور دیکھ بھال کے سہارے زندگی کے دن گزار رہے تھے مگر بیٹی اور وہ بھی اکلوتی اور لاڈلی اس کی طلاق کا صدمہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اور وہ اس چٹان کی مانند جو اندر ہی اندر بھربھری سی ہو چکی ہوتی ہے اور معمولی سا زلزلہ یا طوفان بھی اس کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا باعث بن جاتا ہے تو بیٹی کی بربادی کا صدمہ ان کے جیون کی ڈور ٹوٹنے کا بہانہ بن گیا۔ یکے بعد دیگرے اس قسم کے دکھوں نے زاریہ کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا مگر پھر بھی وہ بڑی ہمت اور حوصلے سے نہ صرف زندگی کے تمام تقاضے پورے کر رہی تھی بلکہ اپنے گھریلو اور ملازمت کے فرائض بھی احسن طریقے سے انجام دے رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی ہر ممکن طریقے سے کرتی تھی جو کہ بیٹی کے ماتھے پر طلاق کا ٹیکہ لگنے اور شوہر کی وفات سے بکھر کر رہ گئی تھیں ایسے میں زاریہ نے اپنے دکھ اور غم کو پس پشت ڈال کر ہر ممکن طور پر بوڑھی اور غمزدہ ماں کی دلجوئی کی تا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ سکیں کیونکہ چاہنے والے باپ کے بعد ماں کو کھونے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ پھر تو شاید وہ زندگی سے منہ موڑ جاتی۔

......☆......

سلیم نے فیکٹری کی ملازمت سے دو تین دن پہلے ہی استعفیٰ دے دیا تھا فیکٹری سے اپنے واجبات لیے اور پرزاریہ کو طلاق دینے کے لیے اسٹامپ پیپر لیا اس پر طلاق نامہ تیار کروایا اور گھر آ کر طلاق نامہ اپنے اور زاریہ کے مشترکہ کمرے میں ٹیبل پر رکھا اور اپنے پاس موجود چابی سے گھر بند کیا اور چابی گھر کے نیچے رہنے والے مالک مکان کی بیوی کو دے دی اور پھر ایک رکشے پر بیٹھ کر بادامی باغ والے لاری اڈے چلا گیا وہاں گجرات جانے والی کوچ تیار کھڑی تھی وہ جلدی سے کوچ میں بیٹھا اور جب کوچ روانہ ہوگئی تو اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر اس شہر پر الوداعی نگاہیں ڈالیں جہاں وہ زندگی کے کئی سال بسر کر چکا تھا اور پھر سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑے شام کے اخبار کو دیکھنے لگا جو اس نے لاری اڈے پر ایک ہاکر سے خریدا تھا۔ بظاہر تو وہ اخبار پڑھ رہا تھا مگر اس کا ذہن اپنے خوبصورت اور شاندار مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو نرجس سے شادی کے بعد اس کا مقدر بننے والا تھا جب وہ انگلینڈ جا کر اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سپنا حقیقت کا روپ دھارتے دیکھ سکے گا اور پھر آگے زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں اور کامیابیاں ہی کامیابیاں اس کے ہمرکاب ہوں گے۔ ان خوبصورت سوچوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے اس بدقسمت عورت کا خیال نہیں آیا جس کے ساتھ اس نے زندگی کے دو سال گزارے تھے جس کے پیسے پر وہ عیش کرتا رہا جس کی قسطوں پر خریدی گئی موٹر سائیکل بیچ کر پیسے ہڑپ کر لیے تھے اس کے قیمتی زیورات اور جمع پونجی بھی اس کے بریف کیس میں موجود تھی۔ ایک تو اس کو طلاق کا داغ لگایا دوسرے اس کی تمام جمع پونجی اور زیورات ہتھیا لیے اور اپنے اس گھٹیا فعل پر اسے ذرا بھی ندامت محسوس نہیں ہو رہی تھی جیسے اس نے زاریہ سے شادی کر کے اس پر احسان عظیم کیا تھا۔ اور اس کے پیسے اور زیورات اس کے صلے میں لیے تھے کیسا خودغرض شخص تھا وہ جو ماضی کو بھول کر ایک اور عورت کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

......☆......

عابدہ چوہدری کو جب سلیم نے گھر پہنچ کر بتایا کہ وہ زاریہ سے چھٹکارا حاصل کر آیا ہے اور پھر اسے زیورات اور پیسوں کے بارے میں بتایا تو وہ خودغرض عورت بھی بجائے اس کے کہ اپنے بھائی کی اس بات پر سرزنش کرتی الٹا خوش ہو کر بولی ’’چلو اچھا ہوا تمہاری شادی کے اخراجات اس سے پورے ہو جائیں گے۔‘‘ پھر بھرپور طریقے سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور نرجس دلہن بن کر سلیم کے گھر آ گئی۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھی کہ سلیم اتنا گیا گذرا اور غریب نہیں بلکہ اس کے پاس خاصا پیسہ ہے تبھی تو اس نے بری میں اتنے قیمتی زیورات اور ملبوسات دیئے ہیں وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی پہلی بیوی سے چھینے گئے ہیں جان بھی جاتی تو اس نے کیا کہنا تھا۔ وہ تو اس بات پر بیحد خوش تھی کہ سلیم نے اتنی پڑھی لکھی برسرروزگار بیوی کو اس کی خاطر چھوڑ دیا ہے۔ نرجس نے چونکہ پہلے ہی انگلینڈ میں داخلے کی درخواست دے رکھی تھی اور اس کا داخلہ ہو بھی گیا۔ ابتدائی چھ ماہ کے تعلیم کے اخراجات ادا کر کے اس کے پاس محض اتنی رقم بچی تھی جس سے وہ اپنا انگلینڈ جانے کا ٹکٹ خرید سکے۔ سلیم نے اپنا ٹکٹ اپنے پیسوں سے خریدا تھا۔ انگلینڈ جا کر پہلے کچھ ماہ تک وہ دونوں سلیم کے ایک دوست کے فلیٹ میں رہے جو اپنی فیملی کے ہمراہ امریکہ اور کینیڈا سیر و سیاحت کے لیے گیا ہوا تھا۔ نرجس کا داخلہ تو میڈیکل کالج میں ہو چکا تھا اس نے گلاسکو میں اپنی پڑھائی کا آغاز کر دیا تھا۔ رہا سلیم تو اس کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے لیے ہی جا سکے۔ اگرچہ نرجس کے پاس پیسے تھے

مگراس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے اگلے سمسٹر کی فیس ہے اور اس کے وہ سب وعدے ہوا میں اڑ گئے جو اس نے سلیم سے کیے تھے کہ اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ اگلے چار پانچ سال تک وہ لوگ با آسانی اپنی تعلیم مکمل کرسکیں گے۔ اگر چہ اس کے پاس پیسے تھے مگراس نے اپنی بہن فائقہ کے سمجھانے پر وہ رقم پاکستان ہی میں ایک بینک میں فکسڈ ڈپازٹ میں جمع کروادی تھی کیونکہ بہن نے اسے سمجھایا تھا کہ جو شخص اس قدر خودغرض ہے کہ محض پیسے کی خاطر اپنی اچھی خاصی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے تو وہ تم سے پیسہ چھین کر تمہیں بھی چھوڑ سکتا ہے۔ بہن کی بات نرجس کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے انگلینڈ پہنچ کراس نے سلیم سے صاف کہہ دیا تھ کہ اس کے پاس مزید کوئی رقم نہیں ہے۔ اس لیے سلیم کو چاہیے کہ گھر کے اخراجات اور نرجس کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کہیں کوئی ملازمت کرلے پھر جب وہ اپنی پڑھائی سے فارغ ہوجائے گی تو وہ ملازمت کرے گی اور سلیم اپنی پڑھائی کا سلسلہ شروع کردے گا اس بات پر سلیم کو نرجس کی وعدہ خلافی پر غصہ تو ضرور آیا تھا مگراس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا وہ تو اپنی ساری کشتیاں جلا کر آیا تھا مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں ملازمت کیسے حاصل کرے اس کے پاس نہ یہاں کا ورک پرمٹ تھا نہ ہی اس کی کوئی خاص جان پہچان تھی صرف ایک ہی گہرا دوست ارسلان تھا جس کے فلیٹ میں وہ آج کل بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا وہی اس کی کچھ مدد کررہا تھا وہ اسے ورک پرمٹ بھی دلوا سکتا تھا اور اس انجینئرنگ فرم میں اسے ملازمت بھی دلوا سکتا تھا جہاں وہ خود کام کررہا تھا۔ مگراس کا اگلے پانچ ماہ تک واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تب تک سلیم کو مجبوراً اسی گھر میں رہنا تھا اگر چہ اس نے ارسلان کو فون کرکے کہا بھی تھا کہ وہ اپنی فرم کے مالک سے اس کی سفارش کردے مگر ارسلان نے معذرت کی تھی کہ اس کا باس سفارش وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا وہ اپنے اصولوں کا بہت پکا ہے اور جب تک وہ سلیم کو اچھی طرح ٹرائل کی بنیاد پر جانچ پرکھ نہیں لے گا تب تک وہ اسے کسی بھی صورت میں ملازمت نہیں دے گا۔

اس پر سلیم بے حد مایوس ہوا تھا۔ ایک دن وہ شام کے وقت گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ایک پارک میں پریشان سا بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرے کہ ارسلان کے واپس آنے تک اسے عارضی طور پر کوئی بھی معمولی سی ملازمت ہی مل جائے تاکہ اپنے روزمرہ کے گھریلو اور پڑھائی کے لیے ابھی سے رقم جمع کرے تاکہ اس کی تعلیم کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

''ارے سلیم تم یہاں کیسے؟'' اچانک سلیم کی سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی پہلے تو وہ اسے اپنا واہمہ سمجھا کہ یہاں دیار غیر میں بھلا اسے کون جانتا ہے شاید کسی اور کو پکارا جارہا ہے مگر جب اس نے سر اٹھایا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا اس کے سامنے اس کے ایک ٹیچر کھڑے تھے جو گجرات ہی کے رہنے والے تھے وہ ٹیکنالوجی کالج میں اس کے استاد تھے۔ عدنان صاحب کا وہ فیورٹ اسٹوڈنٹ ہوا کرتا تھا پھر جب وہ فائنل ایئر میں تھا تو عدنان صاحب انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنے کے گلاسکو آگئے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے پر انہوں نے واپس پاکستان آنے کا ارادہ ترک کردیا تھا کیونکہ گلاسکو یونیورسٹی کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر شپ مل رہی تھی پھر وہ یہیں بس گئے تھے انہوں نے اپنی کولیگ میری ولسن سے شادی کرلی تھی میری ولسن نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اب وہ فاطمہ عدنان تھی وہ باقاعدہ حجاب کرتی تھی۔ عدنان صاحب بھی بہت مذہبی آدمی تھے میری ولسن سے ان کی شادی کی وجہ بھی اس کی اسلام میں گہری دلچسپی تھی اب ان کے تین چھوٹے چھوٹے بچے پانچ سال کی دو جڑواں بیٹیاں

مریم اور نتاشا اور چار سال کا بیٹا مصطفیٰ عدنان وہ گلاسکو میں ایک خوشحال اور پرسکون زندگی بسر کررہے تھے۔

سلیم کو یوں پریشان پارک میں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوئے تھے وہ تو یونیورسٹی سے واپسی پر سیر کرنے کے لیے پارک میں آ گئے تھے انہیں توقع نہیں تھی کہ سلیم انہیں یہاں مل جائے گا۔

''السلام علیکم! سر آپ کیسے ہیں'' سلیم نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ارے بھئی میں تو ٹھیک ہوں مگر تم نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ آنے سے پہلے مجھے اطلاع تو دے دیتے۔'' عدنان صاحب نے اسے گلے لگا کر کہا ''بس سر اچانک ہی شادی ہوگئی۔ بیوی کا چونکہ پہلے ہی یہاں میڈیکل کالج میں داخلہ ہو چکا تھا اس لیے عجلت میں آنا پڑا کیونکہ اس کی کلاسز شروع ہونے میں چند ہی دن تھے۔''

''اوہ آئی سی! کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟'' عدنان صاحب نے پوچھا

''وہ اپنا ارسلان ہے نا!''

''ہاں ...... ہاں اچھا وہ ارسلان گھامڑ؟'' عدنان صاحب نے ارسلان کا کالج میں معروف نک نام لیا۔

''جی سر! اس کے فلیٹ میں فی الحال تو رہ رہے ہیں کیونکہ وہ آج کل امریکہ گیا ہوا ہے۔ مگر اس کے واپس آنے پر فلیٹ چھوڑنا پڑے گا کیونکہ چھوٹا سا دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ ہے جو بمشکل اس کی فیملی ہی کے لیے ہے وہاں ہماری کہاں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آرہا کہ پھر ہم کہاں رہیں گے؟ ابھی تو میرے پاس کوئی جاب بھی نہیں اور پتہ نہیں جاب ملتی بھی ہے یا نہیں۔'' سلیم نے متفکر لہجے میں کہا۔

''برخوردار فکر کرنے کی ضرورت نہیں' انشاءاللہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا تم میرا یہ کارڈ رکھ لو اور کسی وقت مجھ سے اور میری فیملی سے آ کر ملو کچھ کرتے ہیں تمہارے لیے' فکر نہ کرنا۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''شکریہ سر! بہت مہربانی آپ کی۔'' سلیم نے ان کا کارڈ لے کر جیب میں ڈالتے ہوئے متشکرانہ لہجے میں کہا۔

''نو، نو ڈونٹ وری، او کے اللہ حافظ۔ پھر ملیں گے ٹیک کیئر۔'' یہ کہہ کر وہ پارک کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گئے اور سلیم کچھ دیر تک پارک ہی میں بیٹھ کر دلچسپی سے وہاں کھیلتے ہوئے پیارے پیارے سرخ و سپید صحت مند بچوں کو دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر گھر کی جانب چل پڑا کیونکہ نرجس کے گھر واپس آنے کا وقت ہو چکا تھا۔

......☆......

''اف ڈارلنگ بہت تھک گئی آج یار یہ میڈیکل کی پڑھائی تو بہت ہی ٹف ہے پہلے نرسنگ کی تربیت حاصل کی۔ پھر اتنا عرصہ جاب کی اور اب تو میرا دماغ خراب ہوا تھا جو ڈاکٹر بننے کا شوق چرایا اور یہ گورے تو بندے سے محنت کروا کروا کر مار ڈالتے ہیں پہلے پروفیسر البرٹ نے گھنٹوں کے حساب سے ڈیڈ باڈی کے ایک ایک حصے پر ڈیمانسٹریشن دی اور پھر موصوف نے باری باری سارے گروپ کو کہا کہ وہ انہی کے انداز میں کلاس کو سمجھائیں۔ اور سب سے مشکل کام تو ڈھانچے کے اعضاء کی ڈرائنگز بنانا ہے اور تم جانتے ہو کہ مجھے ڈرائنگ سے ہمیشہ ہی الجھن محسوس ہوتی ہے کبھی بھی میں کوئی فیگر صحیح ڈرا نہیں کر سکتی اسی لیے سائنس اور ڈرائنگ کے ٹیچرز سے ہمیشہ ہی بری تصویریں بنانے پر ڈانٹ کھایا کرتی تھی کبھی کبھار کسی دوست سے منت سماجت کر کے تصاویر بنوا لیتی تو ڈانٹ ڈپٹ سے بچاؤ ہو جاتا تھا مگر اب تو ایسا ممکن ہی نہیں پروفیسر صاحب ڈھانچے کے پاؤں کی ہڈی یا ہاتھ یا

کسی اور عضو کی ہڈی تھما کر فرماتے ہیں کہ چند منٹوں میں اس کو ڈرا کرو ورنہ پھر پریکٹیکل میں فیل ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔'' نرجس نے اپنا اوور آل صوفے پر اچھال دوسرے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو جو بھی ہے کم از کم تمہاری خواہش تو پوری ہوگئی میڈیکل کالج جوائن کرنے کی اور اپنا یہ حال ہے کہ برسوں سے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہوں اس مقصد کے لیے بیوی چھوڑی ملک چھوڑا اور اب جاب کے لیے جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوں...... آج اچانک پارک میں اپنے کالج کے ایک ٹیچر سے ملاقات ہوگئی انہوں نے کل بلایا ہے اپنے آفس میں دیکھو شاید کام بن جائے!'' سلیم نے ایک سرد آہ بھر کر حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے وہ یقیناً تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ جب ارسلان بھائی اور ان کی فیملی واپس آ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے میرے پاس موجود پیسے بھی تیزی سے ختم ہو رہے ہیں بہت مہنگائی ہے یہاں خاص کر رہائش اور اعلیٰ تعلیم بہت مہنگی ہے یہاں تو وہی لوگ سروائیو کر سکتے ہیں جو پونڈز کماتے ہوں، اچھا سلیم میں کمرے میں جا رہی ہوں سر بھاری ہو رہا ہے پلیز چائے بنا کر کمرے ہی میں لے آؤ ساتھ میں سینڈوچز بھی لے آنا بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر نرجس اپنے اور سلیم کے مشترکہ بیڈروم کی جانب بڑھ گئی جو کہ اصل میں ارسلان کا گیسٹ روم تھا جب سے وہ لوگ یہاں آئے تھے اسی گیسٹ روم میں تھے اپنا اور بچوں کا بیڈ روم وہ لاک کر گئے تھے۔ ان لوگوں کے استعمال میں گیسٹ روم کے علاوہ لیونگ روم، کچن اور باتھ روم تو تھا ہی جو سب گھر والوں کے مشترکہ استعمال میں ہوتا تھا۔

''اب یہاں آ کر اضافی ذمہ داریاں بھی سر پر آ پڑی ہیں کہ ملازمت تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ گھر داری بھی کرو۔'' سلیم نے نرجس کا سفید میڈیکل اوور آل صوفے سے اٹھا کر اسٹینڈ پر لٹکاتے ہوئے خود کلامی کی۔ اور پھر کچن میں جا کر الیکٹرک کیٹل میں چائے کے لیے پانی ڈال کر اسے آن کیا، دودھ دانی میں دودھ ڈال کر مائیکرو ویو اوون میں گرم کرنے کے لیے رکھا، اٹھ کر اوون کا سوئچ آن کر دیا پھر فریج میں سے بریڈ نکالی میونیز اور مارملیڈ کا پیسٹ بنا کر سلائز کے کنارے چھری سے کاٹ کر ان پر پیسٹ لگایا ایک پلیٹ میں نیپکن رکھ کر اس میں سینڈوچ رکھے ایک دیواری کیبنٹ کھول کر اس میں سے کوکیز کا جار نکالا اور کچھ کوکیز ایک دوسری پلیٹ میں ڈالے اسی اثنا میں کیٹل میں پانی بوائل ہو گیا تھا جبکہ اوون سے دودھ دان نکالا دو جہازی سائز پیالوں میں ابلا پانی اور دودھ ڈال کر ان میں ٹی بیگز رکھے پہلے ایک بڑی ٹرے میں چائے کے کپ کوکیز اور سینڈوچز کی پلیٹیں چینی دان اور دو چھوٹے چمچ رکھے اور ایک سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون کی طرح ٹرے اٹھا کر بیڈ روم کی جانب چل پڑا۔ اتنے دنوں سے بیکار گھر میں رہ رہ کر وہ امور خانہ داری میں خاصا ماہر ہو چکا تھا جب بھی وہ یوں کچن میں کام کر رہا ہوتا اسے زاریہ بہت یاد آتی جو اسے اٹھ کر پانی بھی نہیں پینے دیتی تھی اور ایک یہ بیوی تھی جو اٹھ کر پانی پینا بھی کسر شان سمجھتی تھی، جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر بھگتو۔ یہی فرق ہوتا ہے ناپسندیدہ اور پسندیدہ بیوی میں ناپسندیدہ نخرے اٹھاتی ہے اور پسندیدہ اٹھواتی ہے، سلیم گھر کے کام کاج کرتے ہوئے اکثر زہر خند مسکراہٹ لبوں پر سجا کر سوچا کرتا تھا۔

......☆......

فیروزہ جلیل نے راولپنڈی میں اپنی ٹرانسفر کروالی تھی کیونکہ ان کے بھائی نے بڑی منتیں کی تھیں کہ اس کے امریکہ جانے کے بعد اس کی بیوی بچے

اکیلے رہ جائیں گے کیونکہ بڑا بھائی تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو اپنے ہمراہ کویت لے جا چکا تھا۔ اور چھوٹا امریکہ چلا گیا تھا کیونکہ ابھی اسے وہاں کی شہریت نہیں ملی تھی اس لیے اپنی فیملی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے کچھ عرصے تک تو مرحوم باپ کی چھوڑی ہوئی کپڑے کی دکان سنبھالی تھی مگر جب دوکان کی آمدنی سے گزارا مشکل ہونے لگا تو باہر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے بڑے بھائی حامد کو تو بڑی بہن بشریٰ نے اپنے پاس کویت بلوالیا تھا وہاں اس کا شوہر مجید ایک غیر ملکی کمپنی میں الیکٹریشن تھا جبکہ حامد نے بھی الیکٹریشن کا کورس کر رکھا تھا یوں بہنوئی کی سفارش کی وجہ سے نہ صرف معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی بلکہ بیوی بچوں کو بھی پاس رکھنے کی سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ اس مقصد کے لیے کمپنی کی طرف سے دو بیڈ روم کا فرنشڈ فلیٹ مل گیا تھا حامد کی بیوی ثریا میٹرک پاس تھی۔ اس نے سلائی کڑھائی کا ڈپلومہ بھی کیا ہوا تھا۔ اسے بھی کویت میں ایک انڈسٹریل ہوم میں ملازمت مل گئی حامد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ چونکہ وہ پاکستان میں ابھی ابتدائی کلاسز ہی میں زیر تعلیم تھے اس لیے انہیں کویت میں اچھے اسکولوں میں داخلہ مل گیا تھا۔ اگرچہ ایک دو کلاسز پیچھے داخل ہوئے تھے مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ داخلہ تو ملا۔ اسکول نہ صرف معیاری تھا بلکہ اس کی فیس بھی زیادہ نہیں تھی یوں حامد اور ثریا مطمئن تھے کہ ان کے بچے اچھی تعلیم حاصل کرسکیں۔

فیروزہ جلیل کے دوسرے بھائی ارشاد علی اگرچہ ایف اے پاس تھے مگر کوئی ہنر نہیں آتا تھا اس لیے کویت میں ان کا چانس نہ بن سکا البتہ اپنے ایک دوست کی مدد سے وہ کسی طرح وزٹ ویزے پر امریکہ چلے گئے وہاں جا کر انہوں نے اسٹڈی ویزے کے لیے اپلائی کیا یوں انہیں ایک تعلیمی ادارے میں داخلہ مل گیا اور ساتھ ساتھ ہفتے میں پانچ دنوں کے لیے پارٹ ٹائم جاب بھی مل گئی۔ یہ جاب ایک پاکستانی شخص شیخ سلمان احمد کے ہوٹل میں تھی، شیخ سلمان احمد ایک نیک اور خدا ترس انسان تھے انہوں نے بڑی محنت سے اور جدوجہد کے بعد امریکہ میں اپنا مقام بنایا تھا اور اب ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ پاکستان سے آنے والے بیروزگار اور بے وسیلہ نوجوانوں کو اپنے ہوٹل میں ملازمت مہیا کریں اگرچہ ارشاد کو ہوٹل میں برتن دھونے کی ملازمت مل سکی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھی پھر رہائش بھی ہوٹل میں ہی تھی وہ دوسرے اپنے جیسے ہوٹل کے پاکستانی ملازمین کے ساتھ ہوٹل کے تہہ خانے میں رہتا تھا جہاں فرش پر میٹرس بچھا کر وہ رات کو اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس کر سوجاتے تھے۔ تین وقت کا کھانا بھی ہوٹل ہی سے مل جاتا تھا ارشاد علی نے اگرچہ ایک ٹیکنیکل ادارے میں فٹر کی تربیت حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے رکھا تھا مگر وہ ادارے میں کبھی کبھار ہی جاتا تھا، نہ ہی امتحانات وغیرہ میں بیٹھتا تھا البتہ فیس باقاعدگی سے جمع کراتا تھا یوں اس کا کالج سے نام بھی نہیں کٹ سکا تھا نہ ہی اس کا اسٹوڈنٹ ویزا کینسل ہوا تھا اس کی کوشش تھی کہ اسی طرح چار پانچ سال گزر جائیں یہاں تک کہ وہ امریکہ کا شہری بن جائے پھر وہ آزاد تھا کہ جہاں چاہے مرضی کی ملازمت کرے پھر وہ اپنی فیملی کو بھی اپنے پاس بلوا سکتا تھا امریکہ کی شہریت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی امریکی لڑکی سے پیپر میرج کرلے مگر اس مقصد کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی کیونکہ پیپر میرج کرنے والی امریکی لڑکیاں بہت زیادہ ڈالرز کی ڈیمانڈ کرتی ہیں جو پوری کرنا فی الحال ارشاد کے بس کی بات نہیں تھی شیخ سلمان احمد نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا کہ وہ پیپر میرج وغیرہ کے چکر میں نہ پڑے بعض اوقات اس میں الٹے لینے کے دینے بھی پڑ جاتے ہیں اور ایسا نہ

ہو کہ امریکی شہریت کے چکر میں کہیں اسے ڈی پورٹ ہی نہ کردیا جائے کہ مطلوبہ رقم نہ ملنے پر اکثر لوگوں کو کائیاں قسم کی امریکی خواتین بلیک میل کرتی رہتی ہیں اور پھر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ان کی شکایت کردیتی ہیں اس طرح یک لخت شہریت ملتی بھی نہیں تھی اور جب تک قانونی طور پر باضابطہ طور پر گرین کارڈ نہ مل جاتا تب تک یہ لالچی خواتین ہر وقت ایسے افراد کو ڈراتی دھمکاتی رہتی تھیں۔

اور ارشاد علی تو ویسے بھی اپنی ساری کشتیاں جلا کر آیا تھا اس مرحلے پر ڈی پورٹ ہونے کی صورت میں وہ پاکستان جا کر کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا وہ تو اپنا مکان بھی بیچ کر آیا تھا اور اب اس کی فیملی کرائے کے فلیٹ میں فیروزہ جلیل کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے بیوی بچوں کے اخراجات بھی فی الحال فیروزہ جلیل ہی پورے کر رہی تھیں ارشاد علی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں بیٹے بڑے تھے۔ ارشاد علی کی بیوی نگہت اگرچہ فیروزہ کی خالہ زاد تھی مگر انتہائی بدمزاج اور لڑاکا فطرت تھی۔ آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ پڑھائی لکھائی اس کے بس کی بات نہیں تھی گھر کے کام کاج سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بس نئے نئے فیشن کرنے ٹی وی اور انڈین فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے کوئی بھی اسے پڑھنے لکھنے یا گھر کے کام کرنے کو نہ کہتا تھا باپ کی کریانے کی دکان تھی بڑے تینوں بھائی دوبئی میں ہوتے تھے جبکہ دونوں بڑی بہنیں بھی بیاہی ہوئی تھیں اور گھر میں نگہت کا راج تھا اماں ابا اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اس کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔ بے جا لاڈ و پیار اور پیسے کی فراوانی سے وہ کافی حد تک آزاد خیال اور بگڑی ہوئی تھی پھر بیس سال کی عمر میں خالہ کے بیٹے سے شادی ہوگئی یہاں بھی جب تک خالہ زندہ رہیں اس کے خوب لاڈ پیار ہوتے رہے مگر پھر خالہ اور خالو کے انتقال کے بعد جب اس پہ گھر کی ذمے داری آن پڑی تو ایک دم ہی بوکھلا گئی۔ بڑا بھائی تو شروع ہی سے اپنے پورشن میں الگ رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنا حصہ مکان سے لے کر اپنا علیحدہ گھر بنالیا تھا دوکان سے بھی اپنا حصہ الگ کرلیا تھا۔ ارشاد علی کی ساری جمع پونجی بھائی کو مکان اور دوکان میں سے اس کا حصہ دینے ہی میں ختم ہوگئی تھی بلکہ وہ مقروض بھی ہوگیا تھا اسی لیے دوکان اور مکان فروخت کر کے قرضہ ادا کیا اور باقی رقم سے امریکہ جانے کے اخراجات پورے کرلیے اور نگہت اور اس کے چار بچے فیروزہ کی ذمہ داری بن گئے۔

فیروزہ جلیل نے اپنا گجرات والا پلاٹ فروخت کردیا تھا اور جو رقم ملی اسے قومی بچت میں رکھوا دیا تھا جس سے دو کمروں کے فلیٹ کا کرایہ اور بل وغیرہ ادا ہوجاتے تھے باقی اخراجات کے لیے ان کی تنخواہ کافی تھی اپنی لے پالک بیٹی نور کے علاوہ بھائی کے چاروں بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی ان پر آن پڑے تھے جنہیں اگرچہ وہ خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھیں مگر پھر بھی نگہت کا منہ بنا رہتا ہر وقت نند کے ساتھ لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی مگر اب اس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ کوئی بھی کام نہ کرے صبح دیر تک سوئی پڑی رہتی۔ فیروزہ ہی علی الصبح بیدار ہو کر نماز، تلاوت کلام پاک کے بعد سارے بچوں کو بیدار کرلیتیں ان کے لیے ناشتہ تیار کرتیں پھر ان سب کو تیار کرتیں ان کے لنچ بکس تیار کر کے خود بھی تیار ہوجاتیں اس دوران بچوں کی اسکول وین آجاتی بچوں کو اسکول بھیج کر خود کالج چلی جاتیں جب واپس آتیں تو گھر کی حالت بے حد ابتر ہوتی نگہت یا سو رہی ہوتی یا پر کسی پڑوسن سے گپ شپ لگا رہی ہوتی۔ فیروزہ لباس تبدیل کر کے پہلے گھر کی صفائی کرتیں رات اور صبح کے جھوٹے برتن دھوتیں پھر بچوں کے آنے سے پہلے دوپہر کا کھانا

تیار کرتیں شام کو خود ہی بچوں کو ہوم ورک کرواتیں پھر رات کا کھانا بنانا۔ بچوں کے اگلے دن کے لیے کپڑے پریس کرنا ان سب کاموں میں رات کے بارہ بج جاتے تب جا کر فیروزہ کو بستر پر لیٹنا نصیب ہوتا اور نگہت یا تو بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہتی یا سردرد کا بہانہ بنا کر آئے وائے کرتی رہتی۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ بچے اس کے بجائے فیروزہ کے پاس منڈلاتے رہیں اس لیے انہیں چپکے چپکے بلا کر دھمکاتی ڈراتی کہ خبردار جو تم لوگوں نے پھوپھو سے یا نور سے کوئی بات کی ورنہ مار ڈالوں گی میں تم لوگوں کو اور ننھے منے معصوم بچے سہم سے جاتے۔ وہ یہ بھی نہیں پسند کرتی تھی کہ بچے فیروزہ کے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں یا اس سے ہوم ورک میں مدد لیں مگر چونکہ نہ وہ خود کھانا بنانا پسند کرتی تھی نہ ہی اتنی پڑھی لکھی تھی کہ بچوں کی مشکل کتابیں انہیں پڑھا سکے اس لیے مجبوراً برداشت کر رہی تھی دراصل وہ یہ چاہتی تھی کہ اپنے میکے جا کر شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے یا پھر اپنے والدین کو اپنے پاس رکھ لے مگر جب ارشاد علی نے امریکہ جانے سے پہلے ہی بہن کو اپنے بیوی بچوں اور گھر کی ذمے داری سونپ دی تو نگہت کو یہ سب بہت ناگوار گزرا وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ گھر میں ہر وقت اس کے والدین شادی شدہ بہنیں ان کے بچے' شوہر اور بھائی وغیرہ آئیں۔ اپنے سسرال والوں سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا اور فیروزہ سے تو ویسے بھی اس کی تعلیم اور ملازمت کی وجہ سے جلتی تھی اس لیے اس کے زیادہ ہی خلاف تھی فیروزہ بھی اس کی جہالت اور کم ظرفی کی وجہ سے اسے زیادہ منہ نہیں لگاتی تھی اس پہ نگہت اور زیادہ سیخ پا ہوتی تھی اور ہر ایک کے آگے فیروزہ کی برائیاں کرتی رہتی تھی۔

☆......

اگلے ویک اینڈ پر سلیم سر عدنان کے فلیٹ میں پہنچا تو انہوں نے نہایت تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا سلیم نے سوچا کہ ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہیں بھی پہنچ جائیں کچھ بھی بن جائیں پھر بھی اپنے پرانے جاننے والوں کو عزت اور وقار دیتے ہیں اور اپنے مزاج اور عادتوں کو وقت کے ساتھ بدلنے کے بجائے اپنی پرانی روش کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور ہر شخص کو ڈیو ریسپیکٹ دیتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی وجہ سے معاشرے میں پرانی روایات اور ادب و اخلاق موجود ہے ورنہ تو اس مادی دور میں بھائی بھائی کو نہیں پہچانتا مدد کرنا تو درکنا سلیم سر عدنان کے لیونگ روم میں آرام دہ صوفے پر تکلف سے بیٹھا یہی سوچ رہا تھا جبکہ سر عدنان نے سلیم سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''سوری مائی ڈیئر بوائے دراصل فاطمہ اور بچے تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ہفتہ وار شاپنگ کے لیے چلے گئے بس دو ویک اینڈ میں خریداری ہو سکتی ہے پورا ہفتہ تو بہت مصروفیات رہتی ہیں۔ میں نے چونکہ تمہیں وقت دیا تھا اس لیے تمہارے لیے گھر میں رک گیا۔ فاطمہ تمہارے لیے چائے کے ساتھ کھانے کے لیے کافی چیزیں بنا کر رکھ گئی ہے اور وہ مجھے کہہ گئی تھی کہ میں اس کی طرف سے معذرت کرلوں کسی دن وہ کھانے پر تمہیں انوائٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تم بیٹھ کر میگزین دیکھو ساتھ ہی ٹی وی سے دل بہلاؤ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''سر پلیز آپ زحمت نہ کریں میں خود بنا لیتا ہوں چائے'' سلیم نے میگزین اور ریموٹ کنٹرول سامنے پڑے ٹیبل پر رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا

''ارے بھئی اولڈ مین (مزاحیہ لہجے میں) میں نے کون سے پاپڑ پکانے ہیں جو مجھے زحمت ہوگی الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈال کر سوئچ ہی تو لگانا ہے باقی برتن اور دیگر لوازمات تو ٹرالی میں رکھ کر گئی ہے۔ مائی ڈیئر وائف'' عدنان صاحب نے سلیم کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

''سر آپ لگی ہیں کہ آپ نے ایک مغربی خاتون کو مشرف بہ اسلام کر کے ان سے شادی کی۔ اور وہ اتنی سگھڑ اور محنتی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے اور جاب کرنے کے باوجود نہ صرف گھر کے کام کاج خود کرتی ہیں بلکہ بچوں کی پرورش بھی کر رہی ہیں ایسی خواتین تو اب مشرقی معاشروں میں بھی کم کم ہی ہیں۔'' سلیم نے متاثر کن لہجے میں کہا۔

''بس یار اللہ کی کرم نوازی ہے کہ اس نے میری کسی نیکی کے صلے میں ایک نیک اور اچھی خاتون سے مجھے وابستہ کر دیا ہے پھر ماں باپ کی دعائیں بھی شامل حال ہیں۔'' عدنان صاحب نے مسرور لہجے میں کہا۔

''واقعی کچھ لوگ قسمت کے دھنی ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں وہ پا لیتے ہیں۔'' سلیم نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ تم بھی اپنی منزل پالو گے۔'' عدنان صاحب نے سلیم کو تسلی دی اور پھر سامنے واقع کچن کی طرف چلے گئے اور سلیم صوفے پر بیٹھ کر چینل سرچ کرنے لگا چائے کے دوران ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا پھر جب سلیم کے موبائل پر بیپ ہوئی اور اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے نرجس نے تلخ لہجے میں کہا ''مسٹر کہاں غائب ہیں اتنی دیر کر دی گھر میں نہ کچھ بنانے کے لیے ہے صبح سے اسنیکس پر گزارا کر رہی ہوں۔ اب تو شاپنگ کا وقت بھی نہیں رہا۔''

''تمہیں بتایا تو تھا کہ سر عدنان کی طرف جا رہا ہوں کیا تم اونچا سننے لگی ہو۔ رہی بات شاپنگ کی تو وہ تم خود بھی کر سکتی ہو تم لندن میں رہ رہی ہو پاکستان کے کسی دور دراز دیہات میں نہیں، ہر وقت چخ چخ کر کے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔'' سلیم نے بھی کڑوے لہجے میں کہا۔

''جہنم میں جاؤ تم اور تمہارے سر عدنان۔'' نرجس نے غصے سے دھاڑ کر کہا اور فون بند کر دیا۔

''اچھا سر! اب اجازت؟ کافی اچھا وقت گزرا آپ کے ساتھ آپ بھی کبھی چکر لگائیے نا'' سلیم نے اٹھتے ہوئے کہا ''ہاں کیوں نہیں...... شکریہ تمہارا کہ تم نے مجھے اتنی اچھی کمپنی دی بڑا اچھا لگا تمہارے ساتھ باتیں کر کے آتے جاتے رہا کرو بلکہ اپنی وائف کو بھی لانا کسی دن۔'' عدنان صاحب نے سلیم کے ساتھ بیرونی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا ''ضرور سر!'' سلیم نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر تیز قدموں سے بلڈنگ کی لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

......☆......

آئے دن کی لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے فیروزہ بہت اپ سیٹ رہنے لگی تھیں۔ اب ویسے بھی ان کی عمر کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ ریٹائرمنٹ میں چند سال ہی رہ گئے تھے ایک طرف کالج کی ذمے داریاں پھر گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پڑھائی اور پرورش کا بوجھ اتنی زیادہ ذمے داریاں اٹھانے کی وہ عادی ہی نہ تھیں عمر کا زیادہ تر حصہ تو انہوں نے تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں ہاسٹلوں میں ہی بسر کیا تھا اس لیے انہوں نے نہ کبھی گھر داری کی تھی نہ ہی شادی نہ ہونے کی وجہ سے بچوں اور دوسرے بکھیڑوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جس سے تقریباً ہر ہاؤس وائف کو نمٹنا پڑتا ہے مگر اب جب دوہری ذمہ داریاں نبھانی پڑیں تو فیروزہ جلیل تو بوکھلا کر رہ گئیں اوپر سے جاہل بھابھی سے روز روز کی تو تکار پھر گھر کے اخراجات کا بوجھ بھی ان کے کندھوں پر آ پڑا تھا بھائی ابھی باہر اچھی طرح سیٹ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ بیوی بچوں کی خبر لیتا۔ وہ انہیں کماؤ بہن کے حوالے کر کے اپنی طرف سے آزاد ہو گیا تھا اور بیچاری فیروزہ جلیل ملازمت اور گھر کے درمیان گھن

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کی طرح پس کر رہ گئیں تھیں پھر گھر آ کر بھی انہیں سکون نہیں ملتا تھا نگہت ہر وقت سر باندھے بیڈ پر پڑی ہائے وائے کرتی رہتی تھی اور چاہتی تھی سارے دن کی تھکی ہاری نند آ کر کھانا پکائے بچوں کی دیکھ بال کرے اور ساتھ ساتھ اس کی بھی ناز برداری کرے فیروزہ جلیل جیسی نیک عورت نہ اس کی عادی تھی نہ وہ برداشت کر سکتی تھی اس لیے ایک دن وہ پھٹ پڑیں ''کیا مصیبت ہے نگہت تم سارا دن گھر میں فارغ پڑی سوتی رہتی ہو یا فون پر گپیں لگاتی ہو یا پھر پاس پڑوسنوں سے باتیں کرتی ہو گھر کی طرف بھی دھیان دے لیا کرو، آخر یہ تمہارا بھی گھر ہے تمہارے بچے ہیں سارا بوجھ مجھ پر ڈال کر آرام سے الگ ہو بیٹھی ہو میں گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملازمت کروں یا گھر داری کروں مجھ سے یہ دوہری ذمے داریاں نہیں نبھائی جاتیں۔ سنبھالو اپنا گھر اور بچے ورنہ پھر میں ہوسٹل شفٹ ہو جاؤں گی۔''

''ہاں ہاں آپ تو ہمیشہ سے آزاد زندگی گزارنے کی عادی ہیں یہ گھر اور اس کی ذمے داریاں آپ کے بھائی آپ پر ڈال کر گئے ہیں ورنہ میں تو آرام سے اپنے والدین کے گھر جا کر رہ سکتی تھی یہ گھر آپ کا ہے اور آپ کو مبارک ہو میرا گھر تو وہ ہو گا جہاں میرا شوہر ہو کبھی کسی سے دو گھڑی بات کر لو یا پھر طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے چند لمحوں کے لیے بستر پر لیٹ جاؤ تو آپ قیامت ڈھا دیتی ہیں میں ایسی پابندیوں کی عادی نہیں ہوں میں جا رہی ہوں اپنے والدین کے گھر میں۔'' نگہت نے چلاتے ہوئے کہا پھر اپنے بھائی کو فون کیا۔ اس دوران اس نے اپنا اور بچوں کا سامان پیک کر لیا تھا اور فیروزہ جلیل کے لاکھ سمجھانے' معذرت کرنے اور منتوں کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور نہ ہی اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ ہوئی۔ بھائی کے آنے تک چیختی چلاتی اور ٹسوے بہاتی رہی۔

نگہت کے جانے کے بعد فیروزہ جلیل نے ارشاد علی کو فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔ ''آپا آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے اتنے عرصے تک اس بدمزاج عورت کو برداشت کیا سچ پوچھیں تو میں بھی اس کے لڑائی جھگڑوں، فرمائشوں اور پھوہڑ پن سے تنگ آ کر ہی یہاں پردیس میں دھکے کھا رہا ہوں۔ اب آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے اسے منانے کی رہنے دیں اسے اس کے ماں باپ کے گھر۔ میں کوشش کر کے کچھ پیسے اسے بھیج دیا کروں گا، مجھے صرف اپنے بچوں کی فکر ہے وہ جاہل عورت ان کی صحیح تربیت کرنے کی اہل ہے نہ ہی ان کی مناسب دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ ایک غلط فیصلہ انسان کے لیے زندگی بھر کا عذاب بن جاتا ہے۔ کاش کہ میری شادی نگہت جیسی بد دماغ عورت سے نہ ہوتی اور نہ آج ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔'' دونوں بہن بھائی کچھ دیر تک اپنے اپنے مسائل اور پریشانیوں پر بات کرتے رہے اور پھر ایک دوسرے کو تسلی دلاسہ دے کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب جبکہ فیروزہ جلیل نگہت کے جانے کے بعد گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں سوائے نور کے اور کوئی بھی نہیں رہا تھا اور وہ بھی ابھی بارہ تیرہ سال کی بچی ہی تھی پھر اکثر وہ اسے گھر میں دوسرے بچوں کے ساتھ چھوڑ کر کسی کام سے گھر سے باہر بھی چلی جاتی تھیں مگر اب اسے گھر میں اکیلی نہیں چھوڑ کر جا سکتی تھیں۔ پہلے انہوں نے سوچا کہ وہ نور کے ساتھ کسی ورکنگ ویمنز کے ہاسٹل میں شفٹ ہو جائیں اس طرح ان کو مکان کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔ کھانا بنانے کے جھنجٹ سے بھی نجات مل جائے گی مگر ساری زندگی کے لیے تو وہ ہاسٹل میں نہیں رہ سکتی تھی اب جبکہ نور بھی بڑی ہو رہی تھی کل کو اس کی شادی بھی کرنی تھی اسے وہ ہاسٹل سے تو رخصت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کوئی

شریف سی ادھیڑ عمر کی بے سہارا عورت کو مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیں اس طرح گھر کا انتظام بھی چلتا رہے گا اور انہیں نور کی طرف سے فکر بھی نہیں ہوگی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ چند دنوں بعد ہی عابدہ چوہدری گجرات سے آئی دو دن تک وہاں رہی اور پھر یہ کہہ کر نور کو اپنے ساتھ لے گئی کہ آج کل اسکولوں میں چھٹیاں ہیں نور کچھ دن تک اپنے بہن بھائیوں کے پاس رہ لے گی وہ اس کے لیے اداس ہو رہے ہیں۔ فیروزہ جلیل نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ پہلے بھی نور اکثر اپنی ماں اور بھائی بہنوں سے ملنے گجرات جاتی رہتی تھی نور کی غیر موجودگی میں اکیلے پن کو دور کرنے کی خاطر فیروزہ جلیل نے اپنے بھانجے اسرار اور بھانجی فروا کو اپنے پاس بلا لیا مگر جب نور کو گئے دو ہفتے ہو گئے اور وہ واپس نہ آئی تو فیروزہ جلیل پریشان ہو گئیں انہیں خیال آیا کہ کہیں نور بیمار نہ ہو گئی ہو مگر فون پر تو اس سے تقریباً روز ہی بات ہوتی رہتی تھی اور ہر بار نور اسے یہی کہتی تھی کہ وہ ان کے لیے اداس ہو رہی ہے مگر امی اسے آنے نہیں دے رہی ہیں کہتی ہیں کچھ دن اور رہ لو حالانکہ پہلے وہ کبھی ایک ہفتے سے زیادہ کبھی وہاں نہیں رہتی تھی اس پر فیروزہ نے جب عابدہ چوہدری کو فون کیا کہ وہ نور کو کیوں نہیں بھیج رہی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا

''سوری آپا اب نور جوان ہو رہی ہے اور میں اپنی جوان بچی کو کسی کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ کل کو میرے سسرال والے اعتراض کریں گے۔''

''مگر جب تم نے نور کو میرے حوالے کیا تھا تب تمہیں سسرال والوں کا خیال نہیں آیا تھا تب تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا شوہر حیات نہیں مگر اس کے والدین اور دیگر بھائی بہن موجود ہیں بہتر ہے کہ تم ان سے مشورہ کر لو ایسا نہ ہو کہ کل کلاں وہ کوئی مسئلہ کھڑا کریں تو تب تم نے بڑے وثوق سے کہا تھا ''دیکھیں میڈم نور میری بیٹی ہے اس کے باپ کے انتقال کے بعد میرے سسرال والوں نے نہ مجھے پوچھا نہ میرے بچوں کو وہ کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے۔ میری مرضی میں اپنے بچوں کو جس کے حوالے کروں، آپ فکر نہ کریں میں اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی بچی آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ آج سے آپ میری بڑی بہن ہیں اور میں آپ کو میڈم کے بجائے آپا کہا کروں گی مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کی پرورش کی ذمہ داری آپ احسن طریقے سے پوری کریں گی' اور آج کیا قیامت آ گئی کہ میں کسی بن گئی ہوں جس کے پاس اپنی بیٹی کو چھوڑنا تمہیں گوارا نہیں۔'' فیروزہ جلیل نے تلخ لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا نور کے جانے کے بعد وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھیں پانچ سال کی عمر سے اسے پالا پوسا تھا وہ تو بھول ہی گئی تھیں کہ نور ان کی حقیقی بیٹی نہیں بلکہ لے پالک ہے وہ بھی بہت پیار کرنے والی معصوم سی بچی تھی مگر ظاہر کسی کی اولاد پر ان کا حق ہی کیا تھا نور کے جانے کے بعد سے فیروزہ جلیل کے پاس ان کی بہن کے بچے رہ رہے تھے مگر ظاہر ہے وہ مستقل طور پر تو ان کے پاس نہیں رہ سکتے تھے ویسے اب وہ دوسرے بچوں سے زیادہ لگاؤ پیدا کرنا بھی نہیں چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جب تک ان کی ملازمت ہے وہ کالج کے ہاسٹل میں رہیں گی اور ریٹائرمنٹ کے بعد کسی لیڈیز ہاسٹل میں منتقل ہو جائیں گی۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد ہی وہ ہاسٹل میں شفٹ ہو گئیں گھر کا سامان چونکہ نگہت کا تھا اس لیے مکان خالی کرنے سے پہلے انہوں نے اسے اطلاع دے دی کہ وہ اپنا سامان لے جائے اور یوں ہر قسم کی فکروں اور پریشانیوں سے آزاد ہو کر وہ اطمینان سے وہ ایک بار پھر ہاسٹل کی مکین بن گئیں۔

☆

زاریہ اکثر رات کو جب سونے کے لیے بیڈ

پر لیٹتی تو اسے ماضی بے طرح یاد آتا۔ اسے اپنا طالب علمی کا دور زیادہ ہانٹ کرتا تھا جب وہ بڑے بڑے خواب دیکھا کرتی تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر ایک شاندار سی زندگی بسر کرے گی بڑا سا گھر بنائے گی۔ والدین کو حج کروائے گی۔ اپنے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلوائے گی مگر افسوس اس کی ایک بھی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن تھی۔ تمام نہیں تو اس کے بہت سے خواب پورے ہو گئے تھے۔ اپنا گھر بھی بنا لیا تھا۔ حقیقی بھائی کو نہیں تو اپنے منہ بولے بھائی کو تو اعلیٰ تعلیم دلوا ہی رہی تھی۔ والدہ کی خدمت اور دیکھ بھال بھی بہت اچھی طرح کر رہی تھی۔ اگر سلیم اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ اپنی اب تک کی زندگی کو کامیاب اور مکمل زندگی سمجھتی مگر سلیم نے اسے ٹھکرا کر ایک ایسا روگ اس کی جان کو لگا دیا تھا کہ جس کی کسک کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی دن بھر کی مصروفیات میں تو وہ سلیم کے ساتھ گزارے لمحات کی یادوں کو ذہن کے تاریک گوشوں میں دھکیلنے میں کامیاب رہتی مگر رات کو تنہائی اور سناٹے میں یاد ماضی سے دامن چھڑانا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا۔

سونے سے پہلے وہ آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر اور گھر کے باقی افراد پہ تصور ہی تصور میں دم کرتی اور پھر نیند کی دیوی اس پر نامہربان ہو جاتی اور باوجود انتہائی کوشش کہ وہ سونے میں ناکام رہتی اور بار بار یہی خیال اسے کچوکے لگاتا رہتا کہ آخر اس نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ سلیم جیسا کم ظرف شخص اس کی زندگی میں آ گیا اور کچھ عرصے کی رفاقت کے بعد اسے احساس کمتری میں مبتلا کر کے غائب ہو گیا اس سے قبل اس نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ کم رو ہے اور کوئی شخص اسے یوں ٹھکرا کر اس کے دامن میں حسرتیں اور کم مائیگیوں کے چھید ڈال کر نہ ختم ہونے والی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دے گا جب دیر تک ماضی کی پریشان کن یادیں اس کا پیچھا نہ چھوڑتیں تو پھر وہ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر سے کوئی کتاب اٹھا کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی اور پھر رفتہ رفتہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں اور وہ سب کچھ فراموش کر کے سو جاتی۔ ایسا تقریباً ہر رات کو اس کے ساتھ ہوتا تھا مگر اب شاید وہ بھی اس کی عادی ہو گئی تھی ماضی کی اذیت ناک یادوں کو ذہن کے نہاں خانوں سے نکال کر وہ خود ہی سوچوں کی وادیوں میں محو گل گشت رہتی۔ ماضی کی یادوں کی راکھ کو وہ اس لیے بھی کریدتی رہتی تھی کہ شاید کوئی ایسی چنگاری مل جائے جس سے اس کی ٹھٹھرتی ہوئی منجمد زندگی کو تھوڑی سی خوشی اور مسرت کی حرارت میسر آ سکے ورنہ تو دوسروں کی خاطر جیتے جیتے اور جدوجہد کرتے ہوئے وہ اپنی ذات کو تو فراموش ہی کر بیٹھی تھی۔ مگر تھی تو انسان' پھر ایک عورت کی طرح اس کے دل میں بھی ایک چاہنے والے جیون ساتھی، ایک پیارے سے گھر اور ننھے منے بچوں کی خواہشیں مچلتیں رہتی تھی اور اسے اپنی ذات کے ادھورے پن اور زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محرومی کا ڈر کبھی کبھی آکٹوپس کی مانند اپنے نوکیلے پنجوں میں جکڑ لیتا اور وہ بے آواز اور بغیر آنسوؤں کے دیر تک روتی رہتی۔ اس کے آنسو اس کے دل پر گرتے رہتے اور خود کو اذیت پہنچا کر اسے انجانی سی طمانیت کا احساس ہوتا مگر یہ اس کی کیفیت شروع شروع کے سالوں میں تھی پھر جب وقت کے ساتھ ساتھ مصروفیات بڑھیں تو وہ اب ماضی کو کم کم ہی آواز دیتی تھی۔ اور اپنی سوچوں کا محور موجودہ حالات اور مستقبل ہی کو بنائے رکھنے کی کوشش کرتی جس میں اسے خاصی کامیابی میسر آئی تھی۔ یوں بھی وقت کا کام تو گزرنا ہے خواہ اچھا ہو یا برا۔ وہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی طنابیں کوئی نہیں تھام سکتا بس اس کی ہمرکابی کرنے کی تگ و دو ہی میں انسان نڈھال ہو ہو جاتا ہے اور یہی کیفیت زاریہ کی بھی تھی۔ (جاری ہے)

افسانہ

فرحی نعیم

گرداب

سبق آموز تحریر ان لوگوں کے لیے جو پردیس کو کامیابی کی ضمانت سمجھتے ہیں' خون رُلاتی تحریر جو مصنفہ کے مشاہدے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے

''اب امی کیسی ہیں؟'' سہیل نے عفت سے پوچھا۔

''دوا کھلا کر سلا دیا ہے' ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اُن کو پُرسکون رکھنے کے لیے اُن کا سونا ہی بہتر ہے ورنہ......'' عفت نے حلق میں پھنسے گولے کو بمشکل نگلا اور مزید بولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی' اس نے

انگلیوں سے آنکھوں کے کنارے رگڑے اور لمحے بھر کے لیے سہیل کی طرف نظر کی' سہیل کی آنکھیں بھی اُس کی طرح ضبط سے سرخ ہورہی تھیں۔

''آپ کتنی دیر میں نکل رہے ہیں؟'' اُس نے سہیل سے سوال کیا۔

''سرمد نے ابھی فون کیا ہے' فلائٹ آدھے گھنٹے لیٹ ہے۔'' سہیل نے کہا پھر عفت کے کندھے کو تھپتھپاتا' سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ عفت نے ایک دفعہ پھر آنکھوں کو دوپٹے سے صاف کیا اور امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

سہیل بڑے کمرے میں آکر کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں کتنے ہی لوگ تھے۔ بڑے تایا' چاچا جان' ماموں میاں' خالو' پھوپا سب کے بیٹے' پڑوس کے چند مرد اور اس کے کتنے دوست' مگر نہیں تھا تو ایک وہی نہیں تھا۔ اس کا سب سے عزیز' ماں جایا' اس کا اس دنیا میں سب سے قریبی رشتہ......بس کچھ دیر میں وہ آنے والا تھا' بہت دور سے آرہا تھا۔ لیکن......واپس دور جانے کے لیے......

☆......☆......☆

''ہاں بھئی' اب آگے کیا سوچا؟'' سہیل نے مسکرا کر خرم کو دیکھا۔

''باہر......'' اُس نے ایک لفظ بولا اور ہاتھ کو ہوائی جہاز کی طرح اوپر اڑایا۔

''کیا ہوگیا یار' یہ تم کیا ہر وقت باہر باہر کی رٹ لگاتے ہو۔'' سہیل نے آنکھیں سکیڑیں۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بھائی' میں واقعی اب باہر اپلائی کر رہا ہوں۔'' خرم کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟''

''تو آپ کو کیا میں مذاق کرتا ہوا نظر آتا ہوں'

میں تو میٹرک کے بعد سے ہی باہر جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس نہ تعلیم تھی اور نہ ہی ہنر۔'' اُس نے چند لمحے توقف کیا۔

''لیکن اب میرے پاس ڈگری ہے۔'' خرم نے اپنی ماسٹرز کی ڈگری لہرائی۔

''اب میں باہر جاسکتا ہوں۔''

''تمہارا کیرئیر یہاں بھی بن سکتا ہے' تم یہاں کوشش کرو' آگے پڑھ لو' ایم فل' پی ایچ ڈی' یہاں بھی بہت سے راستے کھلے ہیں' آخر باہر ہی کیوں؟''

''بس بھائی پلیز......آپ جانتے ہیں باہر جاکر پڑھنا اور جاب کرنا یہی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے' میں نے دو تین یونیورسٹیوں میں اپلائی کردیا ہے' بس آپ دعا کریں وہاں سے مثبت جواب آئے۔'' خرم کے لہجے میں مستقبل کی خوشیاں' امیدیں اور اَن دیکھی آرزوئیں بول رہی تھیں۔

''تم نے اپلائی کردیا اور مجھے بتایا بھی نہیں۔'' سہیل کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔

''بتا تو رہا ہوں۔'' خرم کچھ جھینپا واقعی اُسے پہلے بتانا چاہیے تھا۔

''جب کر چکے' تب نا۔'' سہیل کے لہجے میں ناراضگی کا تاثر تھا۔

''کہاں کیا؟''

''آسٹریلیا......''

''جاؤ گے کیسے؟ اتنی رقم کا بندوبست کرلو گے؟'' اب سہیل بھی سنجیدہ ہوچکا تھا۔

''ایک دو' دوستوں سے بات کی ہے' کچھ بینک میں ہے وہ......'' خرم اٹکا۔

''امی کو بتایا' اُن سے اجازت لی' کچھ پوچھا؟'' سہیل نے خرم کو بغور دیکھا۔ اور جواب میں خرم نے سر جھکا دیا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''بہت خوب' بالا ہی بالا سارے منصوبے

بنا لیے اور گھر والے بے خبر ہیں۔'' سہیل اب سچ مچ ناراض ہو چکا تھا۔

''اگر امی سے اجازت لیتا تو وہ منع کر دیتیں۔'' خرم نے اب بھی سر جھکائے ہوئے کہا۔

''ہاں تو کون سی ماں ہوگی جو اپنے بیٹے کو اس طرح پردیس بھیجے گی؟'' سہیل کا لہجہ اب تیز ہوا۔ اُسے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا خرم کے رویے سے......

''اب ایسی بھی بات نہیں۔ آخر اتنے سارے لڑکے باہر جاتے ہیں۔ پڑھتے ہیں جاب کرتے ہیں بلکہ شادیاں بھی وہیں کر کے مستقل ہی وہیں رہ جاتے ہیں، میں تو بس صرف چند سال کے لیے۔'' خرم کچھ جزبز ہو کر بولا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ' واقعی ہزاروں لوگ باہر جاتے ہیں' اپنا مستقبل بہتر کرنے' ایک اگر وہ بھی چلا جائے تو کیا ہوا۔'' سہیل نے دل ہی دل میں اس کی تائید کی۔

''تم چلے جاؤ گے تو امی تمہارے بغیر......''

''آپ ہیں نا یہاں امی کے پاس۔'' خرم نے تیزی سے سہیل کی بات کاٹی۔

''پھر امی کو میری کمی نہیں محسوس ہوگی' اور ویسے بھی چند سالوں کی بات ہے کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی' پلیز بھائی آپ امی کو راضی کر لیجیے گا، آپ کہیں گے تو وہ ضرور مان جائیں گی۔'' خرم کچھ ایسی لجاجت سے بولا کہ سہیل نے نہ چاہتے ہوئے بھی گردن ہلا دی تھی۔

''میں ضرور یہاں ہوں' لیکن تم' تم ہو' تمہاری کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔'' سہیل نے کہا اور اپنا موبائل اُٹھاتا کمرے سے نکل گیا جب کہ دوسری طرف خرم مستقبل کے سہانے سپنے بننے لگا۔

☆......☆......☆

سہیل نے جب امی کو خرم کے ارادوں کے بارے میں بتایا تو کتنی ہی دیر امی گم صم ہو گئیں تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا چھوٹا سچ مچ باہر جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔

''سہیل کیا وہ واقعی باہر جانے کا ارادہ کر چکا ہے؟'' امی آس نراس کے بیچ میں تھیں۔

''جی......'' سہیل دھیرے سے بولا۔

''تم......تم اُسے سمجھاؤ......آخر وہاں ہے ہی کون۔ وہ اکیلا وہاں کیسے رہے گا' کس کے پاس رہے گا۔''

''امی میری اس سلسلے میں اُس سے کئی دفعہ بات چیت ہوئی ہے لیکن وہ اپنے ارادے میں اٹل ہے۔ باہر جا کر جاب اور تعلیم حاصل کرنا اُس کا خواب ہے جسے وہ ہر صورت پورا کرنا چاہتا ہے۔''

''لیکن بیٹا...... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے اور پھر اتنی بڑی رقم؟ رقم کہاں سے آئے گی۔ ٹکٹ کے پیسے' وہاں رہائش' نہیں نہیں' میں نہیں بھیجوں گی نہ جانے کتنے برس لگ جائیں اُسے' تم سمجھاؤ سہیل بیٹا' ایسی خواہش نہ کرے۔'' امی پریشان ہو چکی تھیں۔

''یہی بات وہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں آپ کو مناؤں آپ کو راضی کروں۔'' سہیل ماں سے نظریں چراتا ہوا بولا۔

''کہاں گیا ہے خرم' بلاؤ اُسے میں خود اُس سے بات کروں گی۔ کیا نادان ہو گیا ہے جو ماں' بہن کو اِس طرح چھوڑ کر جا رہا ہے۔'' اب غصہ کا واضح تاثر ان کے چہرے پر تھا۔

''وہ اپنے دوست کے ہاں گیا ہے اور مجھے ہی یہ ذمہ داری سونپ کر گیا ہے۔ وہ آپ کا سامنا

نہیں کر پا رہا۔ امی اُس کی خواہش ہے باہر جانے کی تو جانے دیجیے نا' کوئی ایسی انہونی خواہش بھی نہیں کر رہا' روز سینکڑوں لڑکے باہر جاتے ہی ہیں۔'' سہیل نے بھائی کی طرفداری کی۔

''لو اب تمہارے منہ میں بھی اُس کی زبان آ گئی' تم بھی ماں کے بجائے بھائی کا ساتھ دے رہے ہو، شاباش ہے بھئی۔'' امی سخت خفا ہو چکی تھیں۔

''اور رقم کہاں سے آئے گی؟''

''ہو جائے گا' وہ جو بینک میں رکھی ہے۔''

''خبردار......'' انہوں نے سہیل کی بات کاٹی۔

''وہ رقم تمہاری اور عفت کی شادی کے لیے میں نے رکھی ہے۔ تمہارے مرحوم باپ نے وہ رقم رکھوائی تھی وہ میں کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔'' امی سختی سے بولیں تھیں۔

''تم بس خرم کو اس کے ارادے سے باز رکھو۔''

''امی پلیز مان جائیں نا...... اُس نے وہاں یونیورسٹی میں بھی اپلائی کیا ہوا ہے۔ بہت جلد انشاء اللہ وہاں سے جواب آ جائے گا۔ وہ ضد کر رہا ہے تو آپ تو نہ کریں۔'' سہیل اب پوری طرح مستعد ہو کر ماں کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے بائیں طرف ان دونوں سے چھوٹی بہن عفت بیٹھی تھی وہ بھی بھائی کے باہر جانے کا سن کر بے بسی سے ماں اور بڑے بھائی کی گفتگو سن رہی تھی اور دل سے وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اُس کا پیارا بھائی اور دوست اُس کے ساتھ ہی رہے لیکن بھائی کے مستقبل اور خواہش کا سن کر چپ تھی۔ اور پھر کتنی ہی دیر ماں بیٹے میں بحث ہوتی رہی آخر کار ممتا ہار گئی اور بیٹے کی ضد جیت گئی تھی۔

☆......☆......☆

خرم چار بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ سب سے بڑا سہیل اُس سے دو سال چھوٹا وہ خود' پھر شاہینہ جس کی چند سال قبل شادی ہو چکی تھی اور سب سے چھوٹی عفت جو کالج میں پڑھ رہی تھی۔ والد کا شاہینہ کی شادی کے بعد انتقال ہو چکا تھا۔ سہیل تعلیم مکمل کر کے ایک دفتر میں بہت اچھی جاب کر رہا تھا۔ وہ اپنی جاب سے مطمئن تھا۔ تو دوسری طرف خرم فزکس میں ماسٹرز کر کے مزید آگے تعلیم کا خواہاں تھے۔ لیکن اس کے لیے اس کے خیالات کی پرواز بہت بلند تھی۔ وہ کسی بہت اچھی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا۔ یہ اُس کا برسوں کا خواب تھا۔ اگرچہ گھر میں وہ کبھی کبھار اس کا ذکر کرتا رہتا لیکن شاید گھر والوں کو اندازہ نہ تھا کہ اپنے اس خواب کو پانے کے لیے وہ کتنا سنجیدہ ہے۔ ڈگری ہاتھ میں آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے شروع کر دیے تھے۔ پڑھائی کے ساتھ وہ ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا تھا جس کی آمدنی کو اپنی ضرورت پر خرچ کرنے کے بعد وہ جمع کر رہا تھا۔ والد کی پنشن اور سہیل کی تنخواہ سے گھر کے اخراجات بڑی سہولت سے پورے ہو رہے تھے۔ پھر امی کو کسی حد تک یہ بھی اطمینان تھا کہ میاں کے مرنے کے بعد اُن کے آفس سے جو بقایا جات ملے تھے اس کی بھی معقول رقم بینک میں جمع تھی۔ جس سے وہ عفت کی شادی باعزت طریقے سے کر سکتی تھیں یوں یہ گھر بڑے سکون سے چل رہا تھا جب اس پُرسکون جھیل میں خرم نے اپنی خواہش کا کنکر پھینک کر اضطراب پیدا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر ایک یونیورسٹی کی طرف سے مثبت جواب آ گیا تھا۔ وہ نہ صرف خرم کو ایڈمیشن دے رہے تھے بلکہ یونیورسٹی میں ہی ایک جاب بھی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور اُس کی رہائش کا مسئلہ بھی کسی حد تک حل کر رہے تھے۔ خرم کے تو خوشی کے مارے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ سارے مسئلے یوں آسان ہو جائیں گے یہ تو اُس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اب صرف رقم کا بندوبست کرنا تھا وہ بھی سہیل اور اس نے مل کر کر ہی لیا۔ اس دوران امی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ اگرچہ بیٹے کی خوشی میں بظاہر خوش تھیں لیکن اندر سے وہ کیسی بے چین تھیں یہ وہی جانتی تھیں۔ خرم نے اگرچہ انہیں اپنی محبت اور پیار کا واسطہ دے کر کسی حد تک ناراضگی دور کر لی تھی لیکن ماں کا دل بہت سے اندیشے اور وسوسے سے سہا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

نئی جگہ، نیا شہر خرم نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس کے شب و روز بدل چکے تھے ایک روشن مستقبل کو حاصل کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے یہ اُسے اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ حیات کا سفر بہت کٹھن ہوتا ہے اس کا تجربہ بڑی اچھی طرح ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کی پڑھائی بڑی سخت تھی آدھا دن تو یونیورسٹی میں ہی ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں ہی ایک چھوٹی موٹی جاب آفس سیکشن میں مل گئی تھی۔ آسٹریلین ڈالر کمانا کس قدر مشکل ہے؟ کتنا خون پسینہ بہانا پڑتا ہے؟ یہ یہاں آ کر خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ رہائش کے لیے بھی دو غیر ملکی لڑکوں کے ساتھ ایک کمرہ شیئر کر رہا تھا۔ اُن دونوں کو ہی اِس کے پاکستانی اور مسلم ہونے پر سخت اعتراض تھا جس کا مظاہرہ وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے۔ خرم نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا کیونکہ اُس کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ وہ الگ ایک کمرہ افورڈ کر سکتا۔ لیکن وہ مستقبل میں یہاں سے نکلنے کا پکا عہد کر چکا تھا۔ لیکن یہ عہد کب پورا ہو گا یہ وہ خود نہ جانتا تھا۔

☆......☆......☆

گھر وہ فون کرتا رہتا...... آج کل کے جدید ذرائع کی بدولت گھر والوں سے رابطہ بہت آسان تھا۔ اس کی تقریباً روز ہی ماں اور بھائی بہن سے بات ہو جاتی۔ امی کو وہ دن بدن کمزور ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے تم کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتے؟ آخر اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری صحت اچھی نہیں لگتی؟ تم کمزور ہو رہے ہو؟'' سلام دعا کے بعد فوراً ہی امی کے خدشات لفظوں کے جامے پہن کر اُس پر سوالوں کی صورت برسنے لگتے لاکھ وہ ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ مطمئن نہ ہوتیں۔

''تم واپس آ جاؤ......'' آخری بات اِن کی یہی ہوتی اور وہ مسکرا مسکرا کر اُن کو یقین دلاتا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے پھر اس رقم کا احساس دلاتا جو اُس کے آنے پر خرچ ہوئی۔ ابھی اس نے قرضہ بھی اتارنا تھا۔ اپنی پڑھائی کی اہمیت پر انہیں لیکچر دیتا تو یہاں کی یونیورسٹی سے حاصل ہوئی ڈگری، ایک دن اُسے ترقی کے آسمان پر پہنچا دے گی اور وہ بیٹے کے جملوں کے جال میں اُلجھ جاتیں۔

☆......☆......☆

اور اُسے ابھی یہاں آئے صرف آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ سخت جان توڑ محنت نے اُسے جسمانی مسائل پیدا کر دیے تھے۔ اُس کے سر میں مستقل

درد رہنے لگا تھا۔ نظر تیزی سے گر رہی تھی۔ معدے میں درد، چکر ایک ساتھ ہی کئی بیماریاں اُس پر حملہ آور ہونی شروع ہوگئیں تھیں۔ گھر سے دوری، ساتھی لڑکوں کا متعصبانہ رویہ، دیکھ بھال سے عاری دن رات، نامناسب غذا اور بے قاعدہ علاج، کون اُس کا خیال رکھتا؟ کون اُسے وقت پر کھانا یا دوا دیتا؟ یہاں کون تھا جو اُس کے لیے پریشان ہوتا۔ یہ سب مل کر اُسے حالات کے گرداب میں پھنسا رہے تھے۔ اور پھر بجائے حالات سنورنے کے مزید بگڑتے چلے گئے اگرچہ وہ اس گرداب سے نکلنے کے لیے مستقل ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن ناکام تھا۔

☆......☆......☆

حالات نے پہلا پلٹا تب کھایا جب طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ کئی دن جاب سے غیر حاضر رہا۔ کئی دن کی غیر حاضری کے بعد جب وہ آفس پہنچا تو اُس کو نوکری سے فارغ کردیا گیا تھا۔ اُس نے صفائی دینے کی بڑی کوشش کی لیکن...... اور پھر وہ سر جھکائے وہاں سے لوٹ آیا۔ دوسرا دھچکا اُسے فلیٹ سے بے دخل کرنے پر ملا۔ بے روزگاری کی وجہ سے وہ اُس ماہ کمرہ کا کرایہ بروقت ادا نہ کرپا رہا تھا جس پر اُن دونوں لڑکوں نے اُسے بے دخل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بڑی التجائیں کرنے پر بھی اُن دونوں بے رحم لڑکوں کے دل ذرا نہ نرم ہوئے۔ خرم نے انہیں پورا یقین دلایا تھا کہ وہ دوسری جاب ڈھونڈ رہا ہے اور اُسے امید ہے کہ جلد ہی اُسے جاب بھی مل جائے لیکن انہوں نے تو اُس کے بیگ ہی دروازے کے پاس ڈال دیے تھے۔ ناچار وہ یہاں سے نکل پڑا۔ دو دن اپنے ایک کلاس فیلو کے گھر رہنے کے بعد دوست نے ایک بوڑھے عیسائی جوڑے کے گھر اِس کے سر چھپانے کا بندوبست کردیا تھا۔ جس کے لیے وہ اپنے اس دوست کا بے حد مشکور تھا۔ اُسی نے کچھ رقم بھی اُس کو دے دی تھی۔ جس سے کم از کم چند دن کے لیے تو وہ بے فکر ہوگیا تھا۔ گھر پر وہ اب بھی ان سب باتوں کو چھپا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سہیل، امی، عفت پریشان ہوں، نہ ہی وہ سہیل سے رقم منگوا رہا تھا کیونکہ پہلے ہی اُس کے آنے پر اچھا خاصا قرضہ لینا پڑ گیا تھا جو سہیل ہی اپنی تنخواہ سے اُتار رہا تھا۔ وہ خود تو اب تک اس قابل ہی نہ ہوسکا تھا کہ گھر والوں کو کچھ بھیجتا...... اگر وہ کچھ دے نہیں سکتا تو پھر اُس کو اب بھائی سے لینے کا بھی حق نہیں۔ عفت کی بات بھی امی نے اس دوران طے کردی تھی اور اب امی اس جمع شدہ رقم سے اُس کے جہیز کی تیاری کررہی تھیں۔ یہ وہ جانتا تھا لہٰذا اُس نے اس رقم کو اپنے اوپر لگانا بالکل ہی حرام سمجھ لیا تھا۔ ان سارے مصائب نے مل کر اس کی پڑھائی کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ باقاعدہ یونیورسٹی بھی نہ جا پا رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ گھر سے باہر فرش صاف کررہا تھا۔ سخت سردی میں ہاتھ اکڑے جارہے تھے۔ آج طبیعت کچھ بہتر تھی۔ لہٰذا اُس نے سوچا کہ مسز سوزین نے اُسے کئی دن سے باہر کی صفائی کا کہا ہوا ہے آج وہ یہ کام کرہی ڈالے۔ اگرچہ وہ اُس کا خیال رکھتی تھی لیکن کام کے معاملے میں کوئی لحاظ نہ کرتیں۔ اب بھی یہ اُن کی مہربانی تھی کہ وہ دو دن سے خاموش تھیں۔ کم کرائے کے بدلے وہ اُس سے گھر کے کئی کام کرواتی تھیں۔

''کیم...... اندر آؤ یہ کافی پی لو پھر باقی کام کرنا۔'' اُس نے کھڑکی سے خرم کو آواز دی۔ اور

خرم پتے سمیٹتے سمیٹتے رُکا' اُس نے سر کے اشارے سے اُسے آنے کی حامی بھر کر ہاتھ ہلایا اور جلدی جلدی اپنا کام پورا کرنے لگا۔ آنٹی کے منہ سے خرم نہیں نکلتا تھا لہٰذا انہوں نے اس کے نام کو مختصر کر کے اپنا کام چلالیا تھا۔ وہ ہاتھ رگڑتا اندر آیا۔ اور صوفے پر بیٹھ کر گرم گرم کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ دونوں کتنی ہی دیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرتے رہے۔

☆......☆......☆

خرم کی بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ اُس نے مسز سوزین سے بھی مدد مانگی۔ لیکن انہوں نے بھی معذرت کرلی تھی۔ بس اتنی مہربانی کردی تھی کہ وہ اُسے بغیر کرائے کے بھی گھر میں رکھنے پر آمادہ تھیں۔ اور اُس کے کھانے پینے کا بندوبست کردیتی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے وہ اُن کے لیے بلائے جان بنتا جارہا تھا۔ خرم نے اپنے دو تین دوستوں سے اُدھار کے طور پر رقم مانگی۔ تھوڑی بہت مدد کے بعد وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ حالات دگرگوں ہوتے جارہے تھے اُس کے پاس کھانے پینے کی رقم نہ تھی تو واپسی کے سفر کے لیے کرائے کا وہ کہاں سے بندوبست کرتا۔ گھر والوں سے رابطہ بھی کم ہوچکا تھا۔ جس کے لیے اُس نے سخت مصروفیات کا بہانہ بنایا ہوا تھا۔ دوسری طرف اب گھر والے بھی اُس کی غیر موجودگی کے کچھ عادی ہوچکے تھے۔ لہٰذا وہاں بھی اب پہلا والا اصرار مفقود ہوتا جارہا تھا۔

نہ جانے یہ شرمندگی تھی پشیمانی' پچھتاوا افسوس یا اَنا کہ خرم اتنے برے حالات میں بھی اصل حقیقت گھر والوں سے چھپائے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

چوبیس گھنٹے ہوگئے تھے وہ تیز بخار میں تپ رہا تھا۔ اور چوبیس گھنٹے کے ہی وہ فاقے سے تھا۔ مسز سوزین اور ان کے شوہر شہر سے باہر کسی عزیز کے پاس گئے ہوئے تھے۔ اور اس وقت کوئی اُس کے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہ تھا۔ آنسو کے قطرے اس کے دائیں بائیں گرتے اس کا تکیہ بھگو رہے تھے۔ اس وقت محبت کرنے والی ماں' بھائی اور بہنیں سب ہی کی شکل اُس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں۔ اس نے آنکھیں رگڑیں اور پانی کے لیے اٹھنے کی کوشش کی ابھی بستر سے اُتر کر وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اُسے بڑے زور کا چکر آیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا وقت تھا جب فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ سہیل نے گہری نیند سے بیدار ہوکر سرہانے پڑا اسیل فون اٹھایا۔ خرم کا نمبر اسکرین پر چمک رہا تھا۔ دو دن ہوگئے تھے خرم سے بات نہ ہوسکی تھی۔ سہیل بھی اپنے دفتری مسائل میں آج کل اتنا چکرایا ہوا تھا کہ اُسے گھر میں ماں بہن سے ہی بات کرنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی کجا کہ وہ خرم کو فون کرتا۔ عفت کے پیپر چل رہے تھے اُسے تو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ ایک امی ہی تھیں جو بیٹے کو یاد کرتی تھیں۔ انہوں نے دو تین دفعہ خرم کو فون ملایا تھا لیکن اس سے رابطہ نہ ہوسکا تھا۔ وہ بے چین تھیں، مضطرب ہورہی تھیں لیکن مجبور تھیں۔ سہیل نے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف اجنبی آواز تھی اور اُس اجنبی آواز نے جو کچھ سہیل کو بتایا تھا وہ سہیل کے پاؤں سے زمین کھینچ لینے کے مترادف تھا۔ سہیل تیزی سے بستر سے اُترا' لائٹ جلائی۔ اُس نے اُس آواز سے التجا کی کہ وہ دوبارہ اپنی بات دہرائیں کہ جو کچھ وہاں سے کہا جارہا تھا سہیل کی سمجھ میں نہیں آرہا

تھا۔ اُس کی آواز بے اختیار تیز ہوگئی تھی اور پھر فون بند ہوگیا تھا۔ سہیل کرسی پر گر گیا۔ اُن ناقابل یقین الفاظ نے اُس کی دنیا تہہ وبالا کردی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرکے رو پڑا۔ کتنی ہی دیر وہ اس رات کی تنہائی میں روتا رہا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا دل پھٹ جائے گا۔ کس سے کہے؟ تب وہ عفت کے کمرے کی طرف بڑھا پھر ٹھہرا پلٹا اور عفت سے بڑی شاہینہ کے شوہر کے نمبر ملائے چوتھی گھنٹی پر سرمد نے فون اٹھایا۔ اُس نے بمشکل سرمد کو ساری صورت حال بتائی اور اُسے فوراً گھر آنے کی درخواست کی۔ اس دوران اس نے عفت کو بھی اٹھا دیا تھا۔ اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں اُسے تلخ حقیقت سے آگاہ کیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر سرمد' شاہینہ کو لے کر آ گیا تھا۔ اِن چاروں کے اوپر اس وقت جو گزر رہی تھی اُسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل تھا۔ امی کو اٹھا کر یہ بتانا اس وقت بہت مشکل تھا۔ لہٰذا انہوں نے صبح ہونے کا انتظار کرنا شروع کیا اور پھر صبح تک کئی قریبی رشتہ دار اُن کے گھر آ چکے تھے۔

☆......☆......☆

مسز سوزین جب اپنے شوہر کے ساتھ گھر آئیں تو ایک پُر اسرار سناٹے نے اُن کا استقبال کیا۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ انہوں نے خرم کو کئی آوازیں دیں۔ لیکن کوئی جواب نہ تھا۔ تب انہوں نے خرم کے کمرے میں جا کر دیکھا اور وہاں کا منظر بڑا دردناک تھا۔ خرم فرش پر گرا ہوا تھا۔ کمرے میں کئی چیزیں بھی بے ترتیبی سے پڑی تھیں انہوں نے اُسے ہلا جلا کر دیکھا لیکن وہ بے حس تھا۔ تب اُن کے شوہر نے فوراً ایمبولینس کے لیے فون کیا۔ کچھ ہی دیر میں اسپتال سے عملہ آ چکا تھا اور اس کو دیکھ کر تصدیق کردی گئی تھی۔ خرم کی

غزل

اِدھر زمانہ اُدھر عشق درمیان میں ہم
تمام عمر رہے کیسے امتحان میں ہم؟

یہ سوچ کر کہ کہیں تمہیں دھوپ چبھ رہی ہو گی
زیادہ دیر نہ رہ پائے سائبان میں ہم

جہاں کے اپنے مکیں تھے مسافروں کی طرح
گزار آئے ہیں اک عمر اس مکان میں ہم

کہیں پہ ملتا نہیں زندگی کا اور نشاں
بہت اکیلے ہیں یار ترے جہان میں ہم

چھپے ہوئے کئی نکلے ہیں سانپ شاخوں سے
سمجھ رہے تھے کہ محفوظ ہیں مچان میں ہم

بہت ہی کم تھی ہماری خرید کی قوت
اسی سبب سے نہ ٹھہرے کسی دکان میں ہم

سمٹنے والے ہیں کردار و واقعات ہی جب
پھر آئے ہیں بھی تو کیا تیری داستان میں ہم؟

ناصرہ زبیری

موت اب سے کئی گھنٹے قبل واقع ہو چکی تھی۔ اُسے کیا ہوا تھا یہ تو مکمل چیک اپ کے بعد ہی معلوم ہوتا۔ مسز سوزین پریشان ہو گئیں تھیں اب کیا کیا جائے۔ وہ تو زیادہ معلومات بھی نہیں رکھتی تھیں خرم کے بارے میں، تب انہوں نے خرم کے ایک دوست سے رابطہ کر کے اُسے گھر بلایا اور پھر اُسی نے سہیل سے رابطہ کر کے اُسے خرم کی موت کی خبر دی تھی جس کے بعد خود سہیل کے آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے بعد امی کو بتانا اور خرم کی ڈیڈ باڈی منگوانے کی کارروائی...... سہیل نے یہ سارے کٹھن مراحل کس طرح طے کیے۔ یہ خود ایک کانٹوں بھری کہانی تھی۔ زندگی کٹھنائیاں کیا ہوتی ہیں اس حقیقت کو خرم کے بعد سہیل بھی بہت اچھی طرح جان رہا تھا۔ زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں بھرا بستر ثابت ہو چکی تھی۔ ایسا تو انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔

ان کا تو سفر حیات بڑا سہل گزر رہا تھا لیکن پھر اس کے بعد اس میں پے در پے کیسی تلخیاں گھلیں، کیسے کیسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی کا سفر کتنا اذیت ناک بنا، اور اب تو شاید یہ اذیتیں عمر بھر کے لیے اُن کی زندگی میں رقم ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

آج ٹھیک ایک سال بعد خرم اپنے ملک اپنے شہر، اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ لیکن اپنے پیروں پر نہیں بلکہ تابوت میں بند ہو کر...... آج ہی کی تاریخ کو وہ آسٹریلیا سدھارا تھا اور پورے ایک برس بعد اُسی ماہ کی سترہ تاریخ کو وہ واپس آ رہا تھا۔ گھر میں آج پھر بہت لوگ جمع تھے۔ امی کی حالت صبح سے خراب تھی۔ انہیں دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔ سرمد نے ایئر پورٹ فون کر کے فلائٹ کا ٹائم معلوم کیا تو پتہ چلا کہ آدھے گھنٹے لیٹ ہے چنانچہ وہ اب کچھ دیر میں گھر سے نکلتے...... سہیل کونے میں بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے گھر میں آئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی بھی گھر کے سناٹے کو ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ در و دیوار پر بھی عجیب سی یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خرم پھر اُس کے سامنے تھا۔

''سہیل چلو۔'' سرمد کی آواز نے اُسے چونکایا۔ تو وہ تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا چار افراد خرم کو لینے جا رہے تھے۔ وہ چاروں گاڑی میں بیٹھے گاڑی سہیل کے تایا کا بیٹا چلا رہا تھا۔ سہیل پیچھے ہی بیٹھ گیا تھا یہاں اُسے اپنے آنسو چھپانا زیادہ آسان لگا۔ تب اُس نے نڈھال ہو کر سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆......☆

ایئر پورٹ پہنچ کر خرم کی ڈیڈ باڈی وصول کر کے وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ گھر پہنچ قریبی مسجد میں جنازہ تھا اور پھر اُسے ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جانا تھا۔ خرم ہمیشہ آسمانوں کو چھو لینے کی باتیں کرتا تھا۔ وہ بہت جلد بہت کچھ پا لینا چاہتا تھا اور آج وہ سچ مچ آسمان کو چھو لے گا۔ سہیل نے آہستہ سے تابوت پر ماتھا ٹیک کر اُسے چوما اور خرم کے بلند درجات کی دعائیں کرتا اُس کے سفر حیات کو سوچنے لگا۔

کاش نقصان اٹھانے سے قبل انسان جان پائے کہ پردیس میں تو دو گز زمین بھی نہیں ملتی اپنے پیاروں کے لیے کوئی واپس آئے نہ آئے مگر اُس دو گز کے لیے ضرور پلٹنا پڑتا ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

مریم شیراز

ماں

آدم کے بیٹے نے حوا کی بیٹی کو پھر رسوا کر دیا تھا
ایسا ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا

شام کا ملگجا اندھیرا ہر سُو پھیل چکا تھا۔ تھکا ماندا صہیب چہرے پر دنیا بھر کی بیزاریت و کوفت لیے

بائیک گھسیٹتا ہوا گھر کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اس نے بائیک صحن میں کھڑی کی اور صحن کے کونے میں لگے نل پر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

''بابا آگئے...... بابا آگئے۔'' وہ فریش ہو کر اندر آیا تو بچوں نے اس پر نظر پڑتے ہی خوشی سے نعرہ بلند کیا۔ وہ خلافِ معمول بچوں کو پیار کیے بنا بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''بیٹا آپ جا کر پڑھو، بابا تھکے ہوئے ہیں۔'' ندرت نے بچوں کو پیار سے پچکارتے ہوئے اُن کے کمرے میں بھیجا اور خود کچن کا رُخ کیا وہ چند لمحوں بعد پانی کا گلاس لیے حاضر تھی۔

''صہیب......!'' وہ بازو پر آنکھیں رکھے پلکیں موندے ہوئے تھا۔ ندرت نے اُس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا وہ چونک کر سیدھا ہوا اور غٹا غٹ گلاس خالی کر گیا۔

''کیا آج آفس ورک زیادہ تھا؟'' ندرت نے محبت سے شوہر کا بازو دبایا۔ صہیب نسبتاً خاموش تھا۔ ورنہ وہ روزانہ آفس سے آتے ہی بچوں کے ساتھ مل کر بچہ بن جاتا اور خوب ہنگامہ مچاتا تھا۔

''آج بائیک خراب ہو گئی تھی۔'' صہیب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُسے اصل وجہ بتائی۔ اس کی بائیک خاصی پرانی تھی اور آئے روز خراب رہتی تھی۔ اسے اکثر اپنے کولیگز سے تضحیک کا نشانہ بھی بننا پڑتا۔ وہ اس کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ اسے پیدل گھر بائیک گھسیٹ کر آنا پڑا تھا۔ سو اُس کا موڈ آف تھا۔

''مما...... حمدہ مجھے مار رہی ہے۔'' ندرت نے اُسے تسلی دینے کو لب کھولے ہی تھے کہ خباب روتا ہوا بہن کی شکایت لے کر آ گیا۔ وہ دونوں کھیلتے ہوئے لڑ پڑے تھے۔ حمدہ نے غصے سے اُسے تھپڑ مارا تھا۔ وہ منہ بسورتا ماں کے پاس آ گیا۔

''حمدہ......'' وہ بیٹی کو ڈپٹتی بیٹے کو سینے سے لگائے بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اُسے بچوں کا معاملہ سلجھا کر کھانا بھی تیار کرنا تھا روتا ہوا خباب ماں کے ہمراہ تھا۔ اب حمدہ کی شامت یقینی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ صہیب نے دونوں کے جاتے ہی دوبارہ پلکیں موند کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

☆......☆......☆

''امی آپ...... اتنی اچانک۔'' گیٹ پر بیل کافی دیر سے ہو رہی تھی۔ بچے اسکول اور صہیب آفس تھے۔ ملازمہ گھر کے کام نمٹا کر جا چکی تھی۔ ندرت کھانا بنانے میں محو تھی۔ اس نے بیل پر گیٹ کھولا تو ماں کو خلافِ معمول دیکھ کر بے ساختہ حیرت کا اظہار کیا۔ سدرہ بیگم دو روز قبل ہی چکر لگا کر گئی تھیں۔ اِس کی حیرت فطری تھی۔ سدرہ بیگم خاموشی سے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہمراہ سعد مٹھائی کا ٹوکرا لیے ہوئے تھا۔ ندرت کی حیرت بڑھ گئی۔

''اللہ نے مجھے پوتے سے نوازا ہے۔ سعد کے ہاں شادی کے سات سال بعد بیٹا ہوا تھا۔'' سدرہ بیگم کے مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ وہ پوتے کی خوشی میں مٹھائی لیے بیٹی کے ہاں آ گئی تھیں۔ وہ بیٹی کی طرف مہینے بعد چکر لگاتی تھیں۔ صائمہ کی ایک روز قبل نارمل ڈلیوری ہوئی تھی۔ سدرہ نے پورے محلے اور خاندان میں مٹھائی بانٹی تھی۔ وہ خوشی سے بیٹی کے گلے لگ گئیں۔ سعد کا چہرہ بھی کھلا کھلا تھا۔

''مبارک ہو امی......'' ندرت کے چہرہ پر خوشی کے رنگ پھیل گئے۔

''مبارک ہو بھائی۔'' وہ ماں کو مبارکباد دینے کے بعد بھائی کے گلے لگ گئی۔ سعد نے اس کے چہرے پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ وہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

''ندرت بیٹا...... کسی تکلف میں نہ پڑنا...... مجھے اور بھائی کو صرف پانی پلادے ہمیں جلدی ہے۔'' سدرہ کو ابھی کافی کام نبٹانا تھا انہوں نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

''امی کچھ دیر تو بیٹھیں۔'' وہ پانی لیے آ گئی۔ اسے ماں کی عجلت پر غصہ آنے لگا۔ وہ اتنی بڑی خوشخبری ہوا کے گھوڑے پر سوار لے کر آئی تھیں جبکہ اس کا بس چلتا تو ماں سے ابھی بھتیجے کا پورا نین نقش پوچھ ڈالتی۔ وہ بھتیجا دیکھنے کو اتاؤلی ہوئی جارہی تھی۔

''بیٹا...... ابھی بہت کام نبٹائے ہیں۔'' وہ پانی پی کر جانے کو تیار تھیں سعد بھی اٹھ گیا۔

''ندرت...... یہ میری طرف سے اِس خوشی کے موقع پر تحفہ ہے۔'' سدرہ نے بیٹے کو اشارہ کیا تو اس نے جیب سے ایک موٹا خاکی لفافہ نکال کر بہن کی طرف بڑھایا جس کے اندر سے کئی نیلے نوٹ جھانک رہے تھے۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ بیٹیوں کو بھتیجوں کی پیدائش پر ودھائی دی جاتی تھی۔ سدرہ نے کوئی چیز خریدنے کی بجائے بیٹی کو دولاکھ دینا مناسب سمجھا تاکہ وہ اپنی پسند سے خود شاپنگ کرے۔

''بھیا یہ بہت زیادہ ہے۔'' سدرہ نے بیوگی میں دونوں بچوں کو پڑھا لکھا کر بہترین پرورش کی تھی۔ انہوں نے کبھی دونوں کو کسی چیز کی کمی نہ آنے دی تھی۔ سعد سول انجینئر تھا اور شادی کے سات سال بعد باپ بنا تھا۔ وہ بہن کو کوئی قیمتی تحفہ دینا چاہتا تھا۔ ندرت لفافے سے جھانکتے نوٹ دیکھ کر جھجک گئی تھی۔ وہ لفافہ تھامنے میں متامل تھی۔

''پکڑ بیٹا...... تیرا بھائی اپنی خوشی اور چاؤ سے دے رہا ہے۔'' سدرہ نے محبت و مان سے بیٹے پر نگاہ ڈالنے کے بعد ندرت کو مخاطب کیا۔ سعد بہن پر جان چھڑکتا تھا۔ اس نے ماں سے مشورہ کر کے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ بہن کو دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ندرت کی آنکھیں بھائی کی بے لوث محبت پر بھیگ گئیں۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ تھام لیا۔ سعد بہن کا ماتھا چوم کر آگے بڑھ گیا۔ سدرہ دل میں دونوں کی دائمی محبت کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ندرت دونوں کو رخصت کرنے گیٹ تک آئی تھی۔

☆......☆......☆

''آج امی آئی تھیں۔'' صہیب نے جونہی گھر کے اندر قدم رکھے ندرت تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ مسرت و انبساط سے اس کا چہرہ کھل رہا تھا۔ وہ صبح سے صہیب کا بے قراری سے انتظار کررہی تھی۔ اس نے سارا دن جلے پیر کی بلی کی مانند گھر بھر کے چکر کاٹتے گزارا تھا۔ بمشکل دن ڈھلا اور صہیب کی صورت نظر آئی تھی۔ گویا اس کا انتظار ختم ہو گیا تھا۔

''اچھا......'' صہیب عجب ٹھس انداز میں کہتا صحن میں لگے نل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ندرت کی خوشی لحہ بھر کو ماند پڑی۔ صہیب کافی سیریس اور خاموش لگ رہا تھا۔ ندرت نے صحن میں نگاہ دوڑائی بائیک ندارد تھی۔ وہ اپنی خوشی میں مست بائیک فراموش کر گئی تھی۔ اسے خیال تک نہ آیا کہ صہیب پیدل گھر آیا تھا۔

''صہیب آپ گاڑی لے لیں۔'' صہیب

فریش ہو کر آیا تو ندرت نے اسے مشورہ دیا۔ وہ ملٹی نیشنل کمپنی میں ایم بی اے کے بعد اچھی پوسٹ پر تعینات تھا۔ اس کی سیونگز اور دو ڈھائی کی رقم ملا کر باآسانی ایک چھوٹی گاڑی خریدی جاسکتی تھی۔ ندرت سارا جوڑ توڑ کر چکی تھی۔ یوں بائیک سے بھی جان چھوٹ جاتی اور اس پر آئے روز کا خرچہ بھی بچ جاتا۔

صہیب نے قدرے تحیر سے اُسے دیکھا۔ وہ اس کی سیونگز اور اکاؤنٹ بیلنس سے آگاہ تھیں۔ وہ فی الحال گاڑی لینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

''صہیب آج امی آئی تھیں۔ سعد بھائی کا بیٹا ہوا ہے وہ دو ڈھائی دے گئی ہیں۔'' ندرت نے تفصیلاً بتایا اور الماری سے پیسے نکال لائی۔

''مبارک ہو تمہیں۔'' صہیب نے اسے بھتیجے کی مبارکباد دی تھی۔ ندرت کو اپنے اکلوتے بھائی کے بچوں کو کھلانے کا خوب ارمان تھا۔ جو قدرت نے پورا کر دیا تھا۔ اور اسی لیے مارے خوشی اُس کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔

''خیر مبارک...... یہ دو لاکھ ہیں اور آپ کے پاس سیونگز بھی ہیں۔ اِس سے چھوٹی گاڑی آسکتی ہے۔'' ندرت نے مبارک کا جواب اور اپنا مشورہ بیک وقت دیا۔

''ہاں آ تو سکتی ہے۔'' صہیب کا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ غلط نہ کہہ رہی تھی۔ گاڑی کے لیے رقم اکٹھی ہو گئی تھی وہ بائیک خراب ہونے پر ورکشاپ بننے کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ بائیک میں خرابی زیادہ تھی اور اسے ٹھیک ہونے میں وقت لگنا تھا۔ وہ آفس سے جلد گھر پہنچنے کا عادی تھا۔ وہ ورکشاپ رُک کر انتظار نہ کرسکتا تھا وہ صبح آنے کا کہہ کر رکشہ لے کر گھر آ گیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ گھر بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا تھا اور بچے بھی اس کے انتظار میں رہتے تھے۔

صہیب کے لہجے میں ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی۔ ندرت کو یہ رقم تحفے میں ملی تھی اسے ندرت سے رقم لینا کچھ اچھا نہ لگ رہا تھا۔

''آپ بائیک سے جان چھڑوالیں۔''

ندرت اور صہیب میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اس نے شوہر کی ہچکچاہٹ بھانپ کر خوشدلی سے لفافہ صہیب کو تھمایا۔ اسے یار دوستوں میں اکثر مذاق کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ وہ پیسے تھامنے میں متامل تھا۔ ندرت نے محبت بھری نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''تھینک یو ندرت۔'' ندرت نے اپنی محبت سے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ صہیب نے ممنونیت و محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''آپ ریسٹ کریں میں کھانا لگاتی ہوں۔''

ندرت اس کی تھکن کا خیال آتے ہی بچوں کو اٹھنے کا اشارہ کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ بچے باپ کے آتے ہی اسے گھیر چکے تھے۔ وہ ماں کا اشارہ پاتے ہی اٹھ گئے۔

☆......☆......☆

گاڑی شہر کی معروف ترین شاہراہ پر ٹریفک میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ رش اور ہارن کے شور نے اُسے تھکا ڈالا تھا۔ صبح ندرت نے اسے جلد گھر آنے کی تاکید کی تھی۔ موسم بدل رہا تھا اسے بچوں کی شاپنگ کرنا تھی۔ وہ آفس سے جلد آ گیا تھا اور کافی دیر سے ٹریفک میں پھنسا ہوا تھا۔ ٹریفک چیونٹی کی رفتار سے رواں تھی۔ اللہ اللہ کر کے ٹریفک کا رش کم ہوا تو وہ گاڑی تیزی سے بھگاتا گھر پہنچا۔

''ندرت آج بہت رش تھا۔'' صہیب کے لیٹ آنے پر حسبِ معمول ندرت کا موڈ آف

ہو چکا تھا۔ وہ بچوں کو سلا کر خود خفگی سے بیڈ پر سونے کی غرض سے دراز تھی۔ صہیب کے پاس گھر کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ وہ گاڑی باہر کھڑی کر کے آیا تو ندرت کی خفگی وغصہ عروج پر تھا۔ اس نے آتے ہی ندرت کو تیار ہونے کا کہا مگر وہ احتجاجاً خاموشی کا لبادہ اوڑھے اُسے مکمل نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

''آپ آفس سے قریب گھر لے لیں۔'' ندرت بالآخر مان گئی۔ اس نے اٹھتے ہوئے شوہر کو مشورہ دیا گھر آفس سے کافی دور تھا۔ اُسے گاڑی پر پون گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ اگر گھر آفس سے نزدیک ہوتا تو وہ رش کے باوجود گھر جلد پہنچ جاتا۔ ندرت کو یہی خیال سوجھا تھا۔

صہیب اور زوہیب دو بھائی تھے۔ ندرت اور سحر میں بن نہ پائی تو چند سال پیشتر دونوں بھائی الگ ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے گھر میں دیوار ڈلوا کر الگ پورشن بنا لیے تھے۔ ابا مرحوم نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے گھر کی تعمیر یوں کروائی تھی کہ بوقت ضرورت دیوار ڈال کر دو پورشن بن سکتے۔ امی کا انتقال چند سال پیشتر ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں کی رہائش الگ ہوئی تھی مگر دونوں گھرانوں میں میل میلاپ تھا اور اس میں بھی ندرت کی نرمی کا کافی عمل دخل تھا۔ وہ سحر جیسی سخت مزاج ہوتی تو شاید دونوں گھرانوں کا میل میلاپ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر اب ندرت کے احمقانہ مشورے پر وہ نہ صرف حیران تھا بلکہ کوفت کا بھی شکار ہوا تھا۔

آفس کے قریب ساری پوش ہاؤسنگ سوسائٹیاں اور کالونیاں تھیں۔ وہ یہ گھر بیچ کر بھی آفس کے قریب پوش آبادی میں ذاتی گھر افورڈ نہ کر سکتا تھا۔ اسے بیوی کی کم عقلی پر غصہ آنے لگا۔

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو زوہیب سے دور کرنا چاہتی ہوں۔ میں صرف آپ کی سہولت کے لیے کہہ رہی ہوں۔'' ندرت کی چونکہ اپنی دیورانی سے کم بنتی تھی اسی لیے اس نے فوراً اپنی صفائی دی۔

''یار میری سیونگز صفر ہیں۔'' صہیب نے غصے کی اصل وجہ بتائی۔

''میرے زیورات بیچ دیں۔'' ندرت نے شوہر کی مدد کی۔ ندرت کے بری اور جہیز کے زیورات اور گھر بیچ کر رقم اکٹھی ہو سکتی تھی۔ صہیب کو اکثر شام کے وقت رش کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس کا آفس شہر کے وسط میں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیر تھی۔ پُر آسائش ولگژری لائف فطری انسانی خواہش ہے۔ گاڑی پُر آسائش لائف اور لگژری گھر اس کی ترجیحات میں بھی شامل تھا۔ قدرت اسے اتنی جلد نوازے گی اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ وہ پُر سوچ انداز میں ٹھوڑی کھجانے لگا تھا۔ ندرت نے اس کی مدد کر کے اسے گرویدہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

صہیب مجھے اک ضروری کام ہے۔'' لاؤنج مہمانوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ رضا اور صہیب کی کافی پرانی دوستی تھی اور ان کی دوستی بیگمات میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ رضا اپنی فیملی کے ساتھ پہلی بار اُن کے نئے گھر آیا تھا۔ سارہ اور ندرت کچن میں بے تکلفی سے باتوں میں مگن خاطر تواضع کے لوازمات کی تیاری کر رہی تھیں۔ رضا نے موقع غنیمت جان کر دوست کو ہچکچا کر مخاطب کیا۔

''کہو یار...... اس میں اتنا ہچکچانے کی کیا ضرورت ہے؟'' صہیب نے اپنے دیرینہ دوست

کی ہچکچاہٹ بھانپ کر اسے بات کرنے کا حوصلہ دیا۔

''صہیب مجھے پچاس ہزار اُدھار چاہیے۔'' رضا نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی۔ رضا اس کا بے تکلف و پرانا دوست ہی نہ تھا بلکہ اکثر ضرورت و مشکل میں اس کی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے صہیب سے اُدھار مانگا تھا۔ صہیب چپ کا رہ گیا۔

''لیں رضا بھائی۔'' دونوں کے بیچ بوجھل خاموشی کا بھاری پردہ لمحہ بھر کے لیے حائل ہو گیا تھا کہ ندرت اور سارہ چلی آئیں۔ ندرت رضا کی بات سن چکی تھی۔ اس نے رضا کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے مخاطب کیا۔

''تھینک یو بھابی۔'' رضا نے کپ تھام کر لبوں سے لگالیا۔ ندرت نے سارہ کو چائے تھمانے کے بعد صہیب کو کپ تھمایا۔ دونوں کی جونہی نظریں ملیں ندرت نے اسے آنکھوں سے مبہم اشارہ کیا اور بہانے سے کچن میں چلی گئی۔

''ایکسکیوزمی......!'' صہیب کپ ٹیبل پر رکھ کر معذرت کرتا اٹھ گیا۔ وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ دراصل وہ گاڑی اور گھر میں اپنا سارا جمع جتھا لگا چکے تھے اور اب ان کے پاس سیونگز میں بیس ہزار بھی نہ تھے کجا یہ کہ وہ اسے پچاس ہزار اُدھار دیتا۔ رضا نے ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کی تھی اور کبھی اُسے انکار نہ کیا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے صہیب کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ چاہ کر بھی اس کی کوئی مدد نہ کر پا رہا تھا جبکہ وہ دوست کو خالی ہاتھ بھی نہ لوٹانا چاہتا تھا۔

''آپ یہ ملک صاحب کے پاس گروی رکھ کر اُن سے اُدھار لے آئیں۔'' اُن کی (پڑوسی) ملک صاحب سے خاصی علیک سلیک ہوگئی تھی۔ ملک صاحب سنار تھے اور ان کا بزنس دبئی تک پھیلا ہوا تھا۔ ندرت ہمہ وقت گولڈ کا لاکٹ سیٹ پہنے رکھتی تھی جو کہ پچاس ہزار کی مالیت تک کا تھا۔ وہ شوہر کی مشکل بھانپ گئی تھی اسے فی الحال اس مشکل کا یہی حل نظر آیا تھا۔ اس نے اپنا لاکٹ سیٹ اُتار کر صہیب کے ہاتھ پر رکھا۔

''ندرت......'' صہیب کی آنکھیں ممنونیت و تشکر سے بھیگ گئیں۔ ندرت نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اس کے اس عمل نے تو صہیب کو عمر بھر کے لیے بے دام خرید لیا تھا۔ صہیب کا رواں رواں اس کا مشکور تھا۔ اس نے صہیب کا اس کے دوست کے سامنے بھرم رکھ لیا تھا۔

''آپ جلدی جا کر پیسے لے آئیں۔ میں لاؤنج میں اُن کے پاس بیٹھتی ہوں۔'' ندرت نے محبت و نرمی بھری آنکھوں سے اُسے گھر کتے ہوئے باہر دھکیلا۔ صہیب مٹھی دبا کر آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔ ندرت لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک لوٹا تو لاؤنج میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ندرت انہیں گھر کے متعلق بتا رہی تھی۔

''تھینک یو سو مچ صہیب۔'' وہ کچھ دیر بعد بیٹھ کر جانے لگے تو صہیب نے رضا کو رقم تھمائی۔ وہ ممنونیت سے مسکرا دیا۔ اسے اچانک رقم کی ضرورت آن پڑی تھی اور اسے فوراً صہیب کا خیال آیا تھا۔ صہیب نے بھی اُسے مایوس نہ کیا تھا۔

''میں اگلے ہفتے لوٹا دوں گا۔'' وہ بزنس مین تھا اور سے اگلے ہفتے ایک پارٹی سے رقم ملنا تھی۔ رضا نے ممنونیت سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''کوئی بات نہیں...... جب دل چاہے تم

واپس کر دینا۔'' صہیب نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ تو کبھی واپسی کے لیے وقت نہ بتاتا تھا اس کے پاس جب پیسے اکٹھے ہوتے تو وہ اُدھار لوٹا دیتا تھا جبکہ رضا محض ایک ہفتے کے لیے اُدھار لینے آیا تھا۔ وہ رقم کا انتظام نہ کر پاتا تو اسے دوست کے سامنے سبکی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے دل میں ندرت کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔

صہیب الوداعی مصافحہ کرتا پلٹ آیا۔

☆......☆......☆

لان میں مہمانوں کا رش تھا۔ معاذ (بھتیجا) کے عقیقے کے بعد امی نے بھابی کے میکے اور بیٹی کی دعوت کی تھی۔ بچے کھیل کود میں مگن تھے۔ مرد حضرات سیاسی گفتگو اور خواتین خالص گھریلو گفتگو میں مصروف تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ ندرت چائے کا کپ تھامے صائمہ کے پاس آ گئی۔ وہ لان میں نسبتاً تنہا گوشے میں اپنی بہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سعد اپنے سالے کے ساتھ معاشی بحث میں محو تھا۔ صہیب اُکتا کر ندرت کے پاس آ گیا۔ اسے ان دونوں کی بحث میں قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

''بھابی آپ نے کوفتے بہت اچھے بنائے تھے۔'' صائمہ کی کوکنگ خاندان بھر میں مشہور تھی۔ اس کے ہاتھ کے بنے کوفتے صہیب کو بھی بہت پسند تھے۔ وہ جب بھی سسرال آتا تو ندرت بھابی سے اس کے لیے بطورِ خاص کوفتے بنواتی تھی۔

ندرت نے بھابی کے کھانے کی تعریف کی۔

''یار کبھی تم میری بھابی کی بھی تعریف کر دیا کرو۔'' صہیب نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اس کی زبان سے بے ساختہ شکوہ پھسلا تھا۔ بھابی اور سلمیٰ (بہن) کے چہروں پر استہزائیہ رنگ پھیل گئے۔

ندرت خفت سے سن رہ گئی۔

''بھائی وہ آپ کی بھابی ہے اور میں اس کی بھابی ہوں۔'' صائمہ اکلوتی نند کی کوئی کمزوری یا خامی کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اس نے بھرپور حظ اٹھاتے ہوئے صہیب کو مخاطب کرتے ہوئے استہزائیہ نظروں سے ندرت کو دیکھا۔ وہ ہنوز ساکت بیٹھی تھی۔

''میں بھی تو یہی گلہ کر رہا ہوں۔ اس کی اور سحر کی کبھی آپس میں نہ بنی تھی۔'' صہیب کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی وہ ایسا تو نہ تھا۔ نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔ ندرت کی رنگت مارے خفت و تذلیل کے متغیر ہوتی گئی۔ اس نے ندرت کی وفا و قربانی کو فراموش کر دیا تھا۔ ندرت نے اس کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا اور اس نے ندرت کی لحہ بھر میں تذلیل کر دی تھی۔ بات شاید زیادہ بڑی نہ تھی مگر بعض اوقات انسان اتنا حساس اور نازک دل ہو جاتا ہے کہ اسے بے حد ہتک محسوس ہوتی ہے۔

ندرت بھی خفت کی انتہا پر تھی۔ اس کی سحر سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ دونوں میں اکثر چھوٹی باتوں پر جھگڑا ہوتا تھا اور جلد ہی ختم بھی ہو جاتا تھا۔

آدم کے بیٹے نے حوا کی بیٹی کو پھر رسوا کر دیا تھا۔ بیاہی بیٹی کے لیے میکے میں عزت و مان شوہر کی طرف سے ملی عزت و محبت ہی تو ہوتی ہے۔ صائمہ اور سلمیٰ کی استہزائیہ نظریں مسلسل اسی پر جمی تھیں جبکہ صہیب اپنی کہہ کر دوبارہ سعد اور معیز کے ساتھ جا کر شریکِ گفتگو ہو چکا تھا۔

بے وقعتی اور احساسِ تذلیل سے بھرا خاموش آنسو ندرت کی آنکھ سے نکلا اور دامن میں جذب ہو گیا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عقیلہ حق

محبت فاتحِ عالم

جذبے سچے ہوں تو ہر دن عید اور ہر رات ملن کی رات ہوتی ہے۔
یہ بات تابندہ کو نکاح کے بول میں بندھتے ہی سمجھ آ گئی تھی...
عقیلہ حق کے قلم سے ایک شرارتی سی تحریر

''لو بھئی نئے زمانے میں عید الاضحی کے دنوں میں کون آرام کرتا ہے، حالانکہ حج کے دس دن انتہائی اہم ہوتے ہیں اور 8,9,10 تاریخوں میں مانگی گئی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

اللہ بخشے ہماری اماں کہتی تھیں کہ یہ عید تو قربانی کی ہے اس میں نئے جوتے کپڑوں کی کیا فرمائش؟ مگر روزمرہ کے کام تو کرنا ہی پڑتے ہیں ...... اور ایک یہ ہمارے میاں ہیں کہ پورا سال ہوگیا کہتے کہتے کہ باورچی خانہ کا سنک ٹوٹ رہا ہے، دیواروں کا پلستر اکھڑ رہا ہے ذرا توجہ دے دو کسی مزدور کو لے آؤ لیکن مجال ہے جو کان پر جوں تک رینگی ہو۔ اپنے خاندان والوں کی طرح ایک کان سے سنی دوسرے کان سے نکال دی اب اگر دونوں کانوں کے بیچ میں بھیجے نام کی کوئی چیز ہوتی تو شاید کوئی بات اٹک جاتی، لیکن بھیا ان کے سر میں تو اندر سارا خلا ہے خوامخواہ لوگ چاند گاڑی میں بیٹھ کر خلاؤں میں جاتے ہیں یہاں چلے آئیں کچھ نہیں تو بھوسہ ہی دریافت ہوجائے گا......'' رخشندہ بیگم نے باورچی خانے میں پالک کے پتوں کو علیحدہ علیحدہ کرکے گڈی بناتے ہوئے آرام سے اخبار پڑھتے شاکر میاں کو باتیں سنائیں۔

باپ دادا کے زمانے کا گھر تھا' چار پورشن تھے جو چاروں بھائیوں کے زیر استعمال تھے سب ہی اپنے اپنے پورشن کو ٹپ ٹاپ سے رکھتے تھے لیکن اللہ بھلا کرے شاکر میاں کا جب تک گھر کی دیواریں ہلنے نہ لگیں توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔

شاکر میاں سے بڑے دو بھائی تھے محمد ناصر اور محمد طاہر جبکہ ایک چھوٹے تھے جن کی شادی کو چند سال ہی ہوئے تھے باقر میاں ...... محمد ناصر کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں بڑے بیٹے کی شادی کردی تھی اور وہ لندن میں رہتے تھے جبکہ چھوٹے بیٹے کے لیے زور و شور سے لڑکی کی تلاش جاری تھی......

جبکہ ماشاء اللہ تینوں بیٹوں کے رشتے ان کی ننھیال میں طے تھے محمد طاہر کو اللہ نے اولاد سے محروم رکھا تھا تو سب کے بچے بس ان ہی کے بچے تھے شاکر میاں کی ایک ہی بیٹی تھی تابندہ جو کراچی یونیورسٹی سے مائیکرو بیالوجی میں آنرز کررہی تھی جبکہ باقر میاں کے دو بچے تھے جو ابھی اسکول جاتے تھے سب کا کاروبار مشترکہ تھا گھر میں ایکا اور اتفاق تھا، محمد طاہر کی بیوی، دیور باقر میاں کے لیے اپنی بھانجی بیاہ کرلائی تھیں لہذا قدرتی بات ہے کہ دونوں خالہ بھانجیوں میں بہت زیادہ گھٹتی تھی اور یہ بات شاکر میاں کی دلہن رخشندہ کو بھابی کو بہت کھٹکتی تھی۔

اس بقرعید پر کلثوم بھابھی (طاہر میاں) کی بیگم اپنی بڑی بیٹی کی شادی کررہی تھیں ساتھ ساتھ ان کا ارادہ تھا کہ امریکہ میں زیر تعلیم اپنے دوسرے بیٹے حیدر کی بھی شادی کردیں یوں ایک بیٹی جائے اور دوسری آجائے۔

خیال تو نیک تھا لیکن رخشندہ بیگم کو دکھ اس بات کا تھا کہ خاندان میں جب ان کی بیٹی موجود ہے تو وہ بھابھی کلثوم ادھر ادھر کیوں جھانکتی پھر رہی ہیں۔...... ویسے اگر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا جائے تو بات تو دکھ کی تھی......

......☆......

''آپ خود تو سارا دن اسی کھولے لیٹے رہتے ہیں اور یہ سارے کالے پیلے نیلے، پتلی پتلی ٹانگوں اور سوکھے سوکھے منہ والے مزدوروں کی نگرانی میں کروں میرا تو جیسے کوئی کام اور نہیں ہے......'' رخشندہ بیگم جب مزدوروں کو چائے دے کر پسینے میں شرابور لاؤنج میں داخل ہوئیں تو سکون سے اخبار پڑھتے شاکر میاں اور کمرے کی کولنگ نے ان کے تو جیسے پتنگے لگادیئے......

''ارے امی کیا ہوگا، کیوں اس قدر غصہ کررہی ہیں آپ، آپ خود ہی تو ہر وقت ابا کے پیچھے

پڑی رہتی تھیں کہ باتھ روم خراب ہو رہے ہیں' دیواروں کا پلستر اکھڑ رہا ہے اب ابا بچارے کام کروا رہے ہیں تو بھی آپ کو غصہ آ رہا ہے اور آپ کیوں سارا دن کچن میں گھس کر مزدوروں کو چائے پانی میں لگی رہتی ہیں آسیہ (گھر کی ملازمہ) کی ذمہ داری لگا دیں وہ کو دہی دیکھ لے گی۔''

''تم چپ رہو، نکمی، کام چور اور ابا کی چمچی ارے ابا کی کیا، ایک ماں کے علاوہ تم کو تو سارے ددھیال کی لگتی ہے، سارے محلے اور ہر ایرے غیرے کی لگتی ہے اور میری کیسے لگے گی، ابا اماں نے انڈیا سے جو رخصت کیا تو جب تک زندہ رہے خط کتابت رکھی اب نہ کوئی بہن نہ بھائی۔ میں تو مردے کا مال ہوں، جو چاہے سلوک کرو......''

رخشندہ بیگم دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھ کر پھپک کر رو پڑیں۔

''ارے...... ارے میری پیاری سی اماں، کس نے کہہ دیا آپ اکیلی ہیں، میں ہوں ناں آپ کی بیٹی، آپ کی تابندہ، بس ابا بہت ہو گیا، اماں واقعی تھک جاتی ہیں سارا دن کچن میں کام کرتی رہتی ہیں'' تابندہ نے ماں کو بچوں کی طرح بانہوں میں سمیٹ کر شاکر میاں سے شکوہ کیا۔

''ارے، ارے آپ روئیں نہیں اللہ گواہ ہے میرا مقصد آپ کو تکلیف دینا نہیں تھا وہ تو بھائی جان کے گھر میں ماشاء اللہ شادی سر پر کھڑی ہے تو میں نے سوچا دوسرے شہروں سے مہمان بھی آئیں گے اب گھر تو ایک ہی نا، کچھ لوگ اگر ہمارے پورشن میں ٹھہر گئے تو ان کو تکلیف نہ ہو میں دو چار مزدور اور لگوا دیتا ہوں تاکہ کام جلدی نمٹے...... بس آپ روئیں نہیں، بخدا دل کو آپ کے آنسو دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے چلیے عید اور عید پر آنے والی خوشی میں آپ کو سونے کے کنگن بنوا دیتا ہوں۔'' شاکر میاں نے لاڈلی بیوی کو بچوں کی طرح بہلایا تو تابندہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مجھے کون سی کبھی آپ نے تکلیف دی ہے' قدم قدم پر نوکر کھڑے رکھے بس غصہ اس بات پر نہیں مجھے غصہ آپ کے خاندان اور آپ کی چشم پوشی پر ہے...... حیدر مجھے بچپن سے پسند تھا خوبصورت سمجھدار...... پھر اس قدر لائق...... بھابی جان تو دیور کے لیے بھانجی کو بیاہ لائیں' حیدر کے لیے سارے جہاں کی خاک چھانتی پھر رہی ہیں ان کو میری تابندہ نظر نہیں آ رہی ہے ان کی تینوں بیٹیوں سے بڑی ہے اس سال پچیسویں میں لگ جائے گی کس چیز کی کمی ہے اور یہ ہمارے میاں روز...... دو دو گھنٹے جا کر بھائی کے پورشن میں بیٹھ جاتے ہیں، اتنا نہیں ہوتا کہ کچھ کریں...... جبکہ دو چار دن پہلے میں نے بھابی جان کو ٹٹولا بھی تھا۔

''خیر سے بھابی جان کو کوئی لڑکی سمجھ آئی حیدر کے لیے''۔ رخشندہ بیگم نے چائے کا کپ کلثوم بیگم کو تھماتے ہوئے آس بھرے لہجے میں پوچھا

''دیکھ تو رہی ہوں، دلہن اب لڑکیاں ملنی اتنی آسان تو نہیں ہوتیں نا آگے ساری نسل ہم آنے والی بہو کو تھما دیتے ہیں تو اللہ پاک ایسی لڑکی دلوا دے جو خاندان کو سمجھتی ہو، جو خاندان کو نبھا سکے اور جو آنے والی نسل کی درست پرورش کر سکے...... میری سمجھ میں تو اب آیا کہ بیٹیوں سے زیادہ بیٹوں کی شادی بیاہ کا معاملہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے بیٹی تو بیاہتے ہیں نا پرائے گھرانے میں دیتے ہیں لیکن بہو تو لے کر آنی ہے...... تو بس دعا کریں اللہ پاک اچھی سی لڑکی دلوا دے بلکہ آپ بھی دیکھیے نا آپ کا بھی تو ماشاء اللہ اتنا بڑا حلقہ احباب ہے......'' کلثوم بیگم نے ٹک ٹک سنتی رخشندہ بیگم کو تفصیلی جواب دیا......

حلقہ احباب...... میری تو ساری کائنات میری تابندہ ہے......

تابندہ اور حیدر...... رخشندہ بیگم کے دل نے

ایک آہ بھری۔

☆

''تابی تم مجھ کو مس تو کرو گی نا'' حیدر نے سوٹ کیس میں کتابیں جماتے ہوئے ایک طرف خاموش بیٹھی تابندہ سے پوچھا......

''خیر مس کرنے والی تو آپ میں کوئی بات ہے نہیں، تو آئی ایم سوری ......'' تابندہ نے خشک ہوتے حلق سے بڑی مشکل سے سوچ کے خلاف جملہ نکالا۔

''تم پوچھ رہے ہو میں تم کو کیا مس کروں گی میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی بھی تو رنگ نہیں ہے بچپن سے اب تک تم میرے دوست، میرے پارٹنر رہے ہو میرا تو یہ سوچ سوچ کر سانس رک رہا ہے کہ تم جا رہے ہو' چار سال کے لیے۔ تمہارے مستقبل خوبصورت زندگی کے یقین کے باوجود یہ چار سال میں کیسے گزاروں گی۔ کاش جاتے جاتے امید کی کوئی کرن، آس کا کوئی دیا تم میرے ہاتھوں میں تھما دو...... یقین کرو حیدر اگر میری ہتھیلیاں جلنے بھی لگیں گی تو بھی میں آس کے اس دیے کو بجھنے نہیں دوں گی لیکن مرد ہو کر تم چپ کیوں ہو؟

میرے منہ سے اقرار سننا چاہتے ہو!

تم عورت کی انا کو نہیں جانتے عورت ساری دنیا اپنی انا اور عزت و وقار کے لیے چھوڑ دیتی ہے...... میں کیسے کہوں کہ مس کیا، میں تمہارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی!

تم کیوں نہیں کہہ دیتے! تم کہہ دو ...... میرے کان تمہارے منہ سے صرف ایک جملہ سننے کے لیے ترس رہے ہیں

حیدر کیا میں تم کو اچھی نہیں لگتی۔

کیا سوچ رہی ہو تابندہ تم کو چچی جان بلا رہی ہیں فائزہ (حیدر کی بہن) نے خاموش بیٹھی تابندہ کے شولڈر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

سارے کمرے میں ایک عجیب سا ویرانی سناٹا چھایا ہوا تھا حیدر کا سامان پیک ہو کر ایک طرف رکھا تھا رات کو اس کی نیویارک کی فلائٹ تھی وہ ایک سوٹ کیس پیک کر کے کمرے سے باہر چلا گیا اس کو احساس تک نہ ہوا لیکن دل پر گرتے گرم گرم آنسو اس کی روح کو جھلسا رہے تھے

اس کو آج پہلی دفعہ احساس ہا کہ اس کو حیدر اچھا نہیں لگتا تھا، اس کو حیدر سے محبت تھی' وہ اس کا دوست نہیں، کیوں تھا لیکن ......

☆

لیکن ویکن چھوڑ گدھے...... ان لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا صبح میں ہیں شام کو سبز بن کر ٹہل رہی ہیں تو میرے اپنی کزن سے زیادہ سے زیادہ کیا کرے گی وہ منع ہی کر دے گی اور اس کو منع ہی کر دینا چاہیے اور جب وہ منع کرے گی تو میرے دل میں اس کی قدر اور عزت اور بڑھ جائے گی...... مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ ایک سمجھدار لڑکی ہے کیونکہ تم جیسے باگڑ بلے کو کوئی عقل سے پیدل ہی پسند کر سکتی ہے اور......

''چپ کر یار......'' حیدر نے جل کر اپنے دیرینہ دوست خالد کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''ایک تو میں ویسے ہی پریشان ہوں اور کوئی اچھا مشورہ دینے کے بجائے تم نے بکواس کرنی شروع کر دی۔'' حیدر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس وقت خالد کو گولی مار دے۔

''مجھ پر غصہ مت کر...... محبت کر...... کہہ دے ...... کھالے تھپڑ...... کوئی بات نہیں لیکن کہہ دے......''

خالد نے کمرے سے نکلتے نکلتے واپس دروازے میں سے جھانک کر کہا اور پھر وہ کشن جو حیدر نے اس کے منہ پر کھینچ مارا تھا واپس حیدر کی طرف اچھال دیا۔

......☆......

چھ فٹ سے نکلتا قد، گندمی رنگت' گہری براؤن مسکراتی آنکھیں، گھنی مونچھوں تلے کچھ کہتے لب...... کشادہ پیشانی پر بار بار آتی ایک لٹ......

حیدر تم کیا چیز ہو...... تابندہ نے گہری نگاہوں کے گیلے ہوتے گوشوں کے ساتھ اپنے موبائل میں Save حیدر کی پکچر دیکھی جو پچھلے ہفتے گھر میں ہونے والے ڈنر میں اس نے خاموشی سے اپنے موبائل میں لے لی تھی......

مجھے حیدر سے اتنی محبت ہے یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن...... لیکن...... میں اپنے ابا کا فخر ہوں میری اماں نے کتنی محبت اور اعتماد سے میری پرورش کی ہے نزہت کہتی ہے میں خود حیدر کا راستہ روک لوں...... بھلا میں کیسے روک سکتی ہوں؟

اگر حیدر نے میری محبت کو ٹھکرا دیا یا نہیں بھی ٹھکرایا مگر کسی کو پتہ چل گیا تو میرے بھولے بھالے ماں باپ کو کس قدر تکلیف ہوگی...... نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔

بیٹیاں ماں باپ کا مان ہوتی ہیں اور جو اس مان کی حفاظت نہیں کر پاتیں وہ لڑکیاں ہوتی ہیں اور میں تو اپنے اماں ابا کی بیٹی ہوں اور ویسے بھی رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں جو ہمارے نصیب میں ہے وہ دروازے پر خود بخود آ کھڑا ہوگا۔

لیکن میرا مسئلہ شادی نہیں محبت ہے! میرا دل شادی کے لیے بلکہ محبت کے لیے تڑپ رہا ہے۔ مجھے حیدر سے محبت ہے۔

تابندہ نے کچن کا کاؤنٹر پونچھتے ہوئے اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا کیا......

''کاؤنٹر بعد میں صاف کرنا پہلے آنسو پونچھ لو......'' حیدر نہ جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ حیران رہ گئی......

''اداس ہو تابی!''

حیدر کا لہجہ دھیما اور جذبات کے بوجھ سے بھاری ہو رہا تھا۔

اس کا سر جھکا رہا۔

حیدر نے کچن کے دروازے پر سے دائیں بائیں دیکھا...... چاروں طرف خاموشی تھی محفل لاؤنج میں جمع تھی سب کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے

حیدر کو یہ لمحات غنیمت لگے...... وہ آہستگی سے کچن میں داخل ہوا۔

تابندہ دو قدم پیچھے ہٹی اس کا وجود آہستہ آہستہ لرز رہا تھا کپکپاہٹ دیکھی جا سکتی تھی۔

''چولہے جل رہے ہیں آگے مت جانا......''

حیدر نے بے ساختہ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا......

یہ وہی حیدر تھا جس سے دن میں دس دفعہ سامنا اور کم از کم دو دفعہ لڑائی ضرور ہوتی تھی۔

لیکن آج...... حیدر بدل گیا...... یا دل اور خیالات بدل گئے......تابندہ کے لیے فیصلہ مشکل تھا......

مجھ سے پیار کرتی ہو؟ حیدر کی انگلیاں اس کے شانوں پر جیسے گڑنے سی لگیں اور تابندہ کو لگا جیسے اس کا وجود پتھر کا ہو گیا ہو یہ لمحہ...... اس لمحے کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''بولو ناں تابی...... ! کوئی آ نہ جائے......

میں چار سال کے لیے جا رہا ہوں میرا انتظار کرو گی نا مجھ سے پیار کرتی ہو نا مجھے تم سے بیحد محبت ہے سوچتا ہوں شاید زندگی میں اگر میں نے کسی کو چاہا ہے اگر میں کسی سے محبت کر سکتا ہوں تو تابی وہ تم ہو صرف تم ہو...... جدائی کے لمحات جتنے قریب آ رہے ہیں میرا ادراک یقین میں تبدیل ہو رہا ہے......''

سرو قد' سنگ مرمر سے تراشا بدن، بے ترتیب بال، لمبی سی کمر پر جھولتی چوٹی سے نکل کر

بار بار چہرے کو چھوتے بال لمبی گردن پر سیاہ تل، لان کے گلابی پرنٹڈ سوٹ میں گلابی پیروں کو سیاہ چپل کی قید میں لیے ہر قسم کی زیبائش اور میک اپ سے عاری چہرے کے باوجود حیدر کے لیے وہ مس یونیورس تھی......

''بولو...... بولا نا میری جان...... حیدر کو اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا اور حیدر کے جذباتی الفاظ اس کو حیدر کی کیفیت کا احساس دلا رہے تھے میں اس نے خشک ہوتے حلق کے ساتھ سوکھی زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے ایک نظر حیدر کی طرف دیکھنا چاہا لیکن شرم اور نئی نئی اظہار محبت نے اس کی نظر حیدر کے شانوں سے اوپر نہیں جانے دی......

''ہاں...... بولو تابی بولو......'' حیدر بے تاب ہوا

''میں آپ......''

''حیدر کہاں ہو، اندر کب سے تمہارے ابا تم کو بلا رہے ہیں۔'' کلثوم بیگم زور سے اور اپنے مخصوص انداز میں کہتی لاؤنج سے باہر آتی نظر آئیں اور دونوں جیسے حقیقت میں واپس آ گئے۔ حیدر جلدی سے کچن سے باہر نکل گیا اور تابندہ صاف کاؤنٹر کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی لیکن اب اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے نہیں تھے اب اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ تھی...... نئی نئی محبت کی...... پہلی صبح جیسی مسکراہٹ۔

اور پھر ائیر پورٹ ...... اور ائیر پورٹ سے امیگریشن کاؤنٹر تک حیدر نامکمل جملے کی تکمیل کے لیے تابندہ کو دیکھتا رہا...... اور تابندہ کا خیال تھا کہ اب ان دونوں کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہے

جبکہ لفظوں کی ضرورت تو پڑتی ہے نا!

وہ نہیں جانتی تھی......

لفظ...... الفاظ...... اور جملے...... اس کو سب کی ضرورت ہے لیکن کب؟

......☆......

حیدر ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کر رہا تھا۔ تابندہ ایم ایس سی آنرز کے فائنل سمسٹرز کی تیاری میں مصروف تھی کہ گھر میں جیسے ہنگامے جاگ اٹھے...... فائزہ (حیدر کی بہن) کی سسرال والے شادی کا تقاضہ کر رہے تھے اور کلثوم بیگم چاہتی تھیں کہ حیدر کی شادی بھی ساتھ ہی کر دی جائے......

تابندہ محبت کی مٹی سے بنی تھی اس لیے نہیں کہ وہ حیدر کی ماں تھیں بلکہ وہ اس کی پیاری سی تائی اماں بھی تھیں اور پھر حیدر کے حوالے سے اس کی اپنے تایا کی فیملی سے وابستگی ایک نیچرل سی بات تھی...... وہ یونیورسٹی سے آ کر اماں کا ہاتھ بٹاتی اور پھر کلثوم بیگم کی طرف چلی آتی۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی ان سے گپ شپ کرتی اور اکثر ان کے ساتھ بازار کے چکر بھی لگاتی۔

گھر میں حیدر کے لیے لڑکی کی تلاش کا شور مچا ہوا تھا لیکن اس کے روٹین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی عید کے تیسرے دن فائزہ کی رخصتی تھی اور کلثوم بیگم کا خیال تھا کہ حیدر کو بلا کر اس کا بھی نکاح کر دیا جائے تا کہ پھر حیدر اپنی دلہن کے پیپرز وغیرہ تیار کروا سکے......

لیکن افسوس کلثوم بیگم کو وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب گوہر نایاب کم از کم آئی اسپیشلسٹ مل ہی نہیں رہی تھی۔

رخشندہ بیگم افسردہ تھیں تابندہ سمجھتی تھی کہ ماں کی چڑچڑاہٹ اور افسردگی کو محسوس کر رہی تھی لیکن وہ چپ تھی...... لیکن......!

......☆......

تم پاگل تو نہیں ہو وہ محترم ڈاکٹر حیدر جو جاتے وقت اس طرح تم کو پابند کر گئے تھے جو بقول ان کے تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے...... تم ان سے

''تو بیگم اپنا عندیہ دینے سے پہلے آپ کو کم از کم گھر میں تو ذکر کرنا چاہیے تھا، بیٹے سے تو پوچھنا چاہیے تھا......'' محمد ناصر جو زیادہ تر گھر کے معاملات میں خاموش ہی رہتے تھے......ان کو بھی بیوی کا انداز اور لالچ برا لگا......تو ان کو ٹوکا۔

''تو بھئی میں نے کون سا پیغام ڈالا ہے بس اپنی رضامندی دی ہے پیغام تو اسی طرح جائے گا جس طرح ہمارے خاندان میں ہوتا ہے میں بہت لاڈ اور مان سے بیاہ کر لاؤں گی اپنے حیدر کی دلہن......''

''اپنے حیدر کی دلہن'' کلثوم بیگم کا خوشی سے چہکتا لہجہ تابندہ کے سینے میں کھب گیا اس کو ایسا لگا جیسے آج ساری کائنات مٹھی میں قید ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہو وہ جو فائزہ کے سسرال والوں کے دوپٹوں پر بیل ٹانک کر سلیقے سے تھیلیوں میں پیک کر کے لائی تھی ...... خاموشی سے پلٹ گئی۔ کہ بعض دفعہ پلٹ جانا ٹھہر جانے سے زیادہ آسان لگتا ہے......وہ رونا چاہتی تھی اور رونے کے لیے وہ جلتی جلدی پلٹ سکتی تھی، پلٹ گئی......لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ رونے سے زخم بھرتے نہیں ہرے ہوتے ہیں اور ہری فصلیں مرجھاتی نہیں لہلہانے لگتی ہیں لیکن وہ کچھ نہیں جانتی تھی وہ کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

......☆......

''کیا ہو گیا ہے جو بیٹھی فرش کو رگڑے جا رہی ہو۔ ماسی سے کہو دھو دے گی ویسے بھی شادی اوپر والوں کے ہاں ہو رہی ہے اور جان تم اپنی ہلکان کر رہی ہو اور یہ تمہارے ابا ان کو دیکھو پتہ نہیں کس مٹی سے بنے ہیں۔ صبح سے اوپر جو جا کر بیٹھے ہیں تو لگتا ہے کہ آج وہیں ٹھہر جائیں گے۔'' رخشندہ بیگم نے خاموشی سے فرش کو رگڑتی بیٹی کو دیکھا تو جل کر اس بے قصور کو کھری کھری سنا دیں۔

حیدر دو دن پہلے پاکستان آ چکا تھا لیکن نہ جانے کہاں مصروف تھا پرسوں رات کو جب وہ آیا تھا تو اس نے ایک نظر اس کو دیکھا تھا اور حیدر...... حیدر نے تو اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا...... اس قدر تذلیل......ایسی لاتعلقی......

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنون فراز کب تک؟
جو تم کو بھول چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ اس کا دل رو رو کر دہائیاں دینے لگا لیکن اس کے چہرے پر وہی الوہی مسکراہٹ رہی لیکن اس سے پھر رکا نہیں گیا وہ پلٹ آئی......

اور حیدر جھکی نظروں اور سوچتی کھوجتی روح کے ساتھ اس کے قدموں کے نشان دیکھتا رہ گیا......

کل صبح ہی سے وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ سارا دن کلثوم بیگم اس کو فون ملاتی رہیں کہ اس کی سسرال میں ڈنر پر سارا گھر انوائٹ تھا لیکن اس کا فون آف جا رہا تھا۔

رخشندہ بیگم لاکھ ناراض سہی لیکن وہ بھی پریشان تھیں کہ حیدر کہاں رہ گیا......

پھر فون پر حیدر کی سسرال میں معذرت کی گئی ''بیگم کل لاہور اور اسلام آباد سے مہمانوں کی آمد ہے۔ شادیاں نصیبوں سے ہوتی ہیں ہماری بیٹی اتنی معمولی نہیں کہ ہم اس کو کسی کے سر تھوپیں لہٰذا حیدر نہ سہی کوئی حیدر سے اچھا ہوگا......بس اپنا موڈ خوشگوار رکھیے......کسی کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔'' رات کو جب رخشندہ بیگم چپ سی بیٹھی تھیں تو شاکر میاں نے ان کو سمجھایا...... ''دوسری اہم بات یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمیں اس بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ جو کرتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے مجھے بھی اس بات کا افسوس ہے کہ بھائی جان نے میری بچی کو نظر انداز کیا لیکن کوئی بات نہیں ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے سمجھ لیں بھابی جان کی آنکھ میں ہیرے کو پہچاننے کی صلاحیت ہی نہیں اپنی انمول بیٹی اس کو

بات کرو یہ کیا ہو رہا ہے۔

تمہاری تائی اماں دھڑلے سے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں اور تم اداکارہ شمیم آرا بنی آنکھوں میں آنسو چھپائے مسکرا رہی ہو بیگم صاحبہ یہ فلم نائلہ یا صاعقہ نہیں ہے رئیل لائف ہے اپنے حق کے لیے بولو...... پوچھو حیدر بھائی سے ...... احتجاج کرو...... اس کی دیرینہ دوست نزہت نے بمشکل اپنی آواز کو دباتے ہوئے غصہ بھرے لہجے میں اس کو کسی حتمی فیصلے کے لیے اکسایا......

حیدر کو معلوم ہی ہوگا کہ تائی اماں ان کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں جب وہ خاموش ہیں تو میں کیوں گڑگڑاؤں میں کیوں محبت کی بھیک مانگوں ویسے بھی محبت بھیک میں نہیں ملتی نہ ہی محبت چھینی جاسکتی ہے اگر حیدر کو مجھ سے محبت ہے تو وہ خود بولیں ان کو اپنے وعدے یاد نہیں تو میں کیوں یاد دلاؤں تابندہ کا دکھی لہجہ نزہت کے دل میں چبھ گیا۔

دیکھو تابندہ تم کو رونا آرہا ہے تو رولو لیکن پلیز ضبط کی ان انتہاؤں پر جا کر نہ کھڑی ہو کہ میں رو پڑوں۔

چار سال کیا شاید چار سال کی عمر سے تم حیدر کے نام کی تسبیح پڑھتی ہو تم نے محبت نہیں عشق کیا ہے اور وہ بے وفا سب کچھ بھول گیا...... تم مجھے نمبر دو ان کا...... نزہت نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا تابندہ کا فون اٹھانا چاہا جس کو جلدی سے تابندہ نے ہاتھ سے پرے کر دیا...... رہنے دو نزہت میں محبت کی بھیک نہیں مانگوں گی لیکن ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اب میں کسی سے محبت تو دور کی بات ہے کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی ...... تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں ...... آنکھوں میں آئے آنسو نزہت سے چھپانے کی کوشش میں تابندہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نزہت نے تاسف سے ایک لمحے کے لیے تابندہ کی پتلی کمر پر جھولتی موٹی سی چوٹی کو دیکھا اور پھر لپک کر پرس میں سے پین ڈھونڈنے لگی......

......☆......

''امی اتنی اچھی تو ہے تابی ......'' فائزہ نے دبے دبے لہجے میں ماں سے احتجاج کیا......

''چپ رہو ...... ہماری اماں مت بنو ...... میں نے کب کہا ہے وہ بری ہے وہ بہت اچھی ہے ہماری بچی ہے لیکن میری بہو بننے کی شرائط پر پوری نہیں اترتی ...... ساری زندگی بھابھی رخشندہ کو بھی ان کے میکے والوں نے نہیں پوچھا میرا بیٹا اتنا خوبصورت اتنا بڑا ڈاکٹر میں ایسے لاوارثوں میں تھوڑا ہی اس کی شادی کردوں گی کہ شادی کے بعد ایک گھر بھی لڑکی کے میکے میں نہیں ہوگا جہاں میرے بچے کی دعوت ہوگی ......'' کلثوم بیگم نے بری طرح فائزہ کو جھڑکا۔

آج صبح حیدر کا فون آیا تھا' اور اس نے تابندہ سے شادی کا اصرار کیا تھا...... کلثوم بیگم اپنے میکے میں سب سے بڑی تھیں اور قسمت سے سسرال کی بھی سب سے بڑی بہو...... سو اپنی بات منوانے اور اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی ایک فطرت سی بن چکی تھی ...... انہوں ایک بہت بڑے خاندان کی ڈاکٹر ردا کو پسند کرلیا تھا اور اب ...... اب ان کا بیٹا کہہ رہا ہے کہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جاؤ اور تابی کو میرے لیے مانگو......

''میں ہاں کر چکی ...... لڑکی والے بھی تقریباً راضی ہیں ارے اتنا نامور خاندان ہے آدھا خاندان تو سیاست میں ہے ...... وزیر اور مشیر تو ان کے ہر گھر میں موجود ہیں ان کو تو میرے حیدر کی خوبصورتی بھا گئی ...... وہ تو امریکہ میں ہسپتال تک بنوا کر دینے کو تیار ہیں ...... اور بیٹے صاحب کہہ رہے ہیں کہ ان کو دو جوڑوں میں چچا کی بیٹی ہی چاہیے ...... بے وقوف ......'' کلثوم بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اگر حیدر ان کے سامنے ہو تو دس جوتے ماریں۔

دیکھیے گا جو اس کی قدر کو سمجھتا ہو...... ''شاکر میاں کی اتنی لمبی بات کے جواب میں رخشندہ بیگم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کروٹ بدل لی..........

رخشندہ بیگم کو شاید اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کے دل سے نکلی آہ نے عرش ہلا دیا......

......☆......

واقعی امی صحیح کہہ رہی ہیں ابا بہت دیر سے تایا ابا کے پورشن میں بیٹھے ہیں اللہ سب خیر کرے...... میں بھی چلی جاتی لیکن حیدر...... حیدر بھی تو ہے......

اللہ میاں جی میرا بھرم رکھ لیں...... میری عزت رکھ لیں۔ میرے دل پر کیا گزری، اس کا پردہ ڈھک لیں آپ تو رازداری کو پسند کرتے ہیں، میرا بھی راز...... راز ہی رہنے دیں۔ میرے دکھ، میری محبت کی تذلیل، میرا انتظار، میری وفا، آپ سب جانتے ہیں، میں اپنی محرومیاں آپ سے شیئر کر رہی ہوں، میرے حق میں بہترین فیصلہ کیجیے گا...... تابندہ نے آنکھ میں بار بار آتے آنسوؤں کو بیدردی سے مسلتے ہوئے، جیسے اپنے آپ سے کہا...... اور وہ جو دروازے پر کھڑا اس کی خود کلامی سن رہا تھا۔ مسکراتے لبوں سے پلٹ گیا......

......☆......

گھر میں دوسرے شہروں سے قریبی عزیزوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ سب نے سوچا' برسوں بعد جا رہے ہیں تو پھر عید بھی ساتھ ہی منالیں یوں آج قربانی کے جانور بھی آ گئے ہیں، گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی، فائزہ کو مائیوں بٹھا دیا گیا تھا، شاکر میاں مسکراتے چہرے اور دمکتی آنکھوں کے ساتھ اور رخشندہ بیگم خاموش لبوں اور ستے ہوئے چہروں کے ساتھ مہمانوں کی آؤ بھگت کر رہے تھے گو کہ دونوں جٹھانی دیورانی میں بہت بنتی تھی لیکن آج کل ایک عجیب سا تناؤ تھا...... دونوں اپنی اپنی جگہ آنکھیں چرا رہی تھیں۔

''حیدر کہاں ہیں؟'' کلثوم بیگم نے فائزہ سے پوچھا۔

''حیدر......!'' سیڑھیاں چڑھتی تابندہ کے قدم لڑکھڑائے......

......☆......

''یقین کیجیے ردا جس طرح آپ نے میری بات کو سمجھا ہے' میرا ساتھ دیا ہے...... میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرسکوں...... اگر میں تابندہ کو اس قدر دیوانگی سے نہیں چاہتا ہوتا تو خدا کی قسم آپ جیسی لڑکی کی رفاقت میری خوش نصیبی ہوتی......''

پی سی کے سرد اور خوبصورت ماحول میں چائے پیتے ہوئے حیدر نے ردا سے کہا......

''نہیں حیدر صاحب کوئی شکریہ نہیں، دیکھیے میری شادی تو میرے ماں باپ کی آپ کی والدہ سے ڈیلنگ تھی، ان کو مڈل کلاس فیملی کا ایک ایسا داماد چاہیے تھا جو ساری زندگی میری جوتیاں سیدھی کرتا رہے۔ مجھے ملازم نہیں چاہیے، اپنے لیے برابری کی بنیاد پر شوہر چاہیے، جو مجھ سے محبت بھی کرے' مجھ سے ناراض بھی ہو، کبھی میں اسے مناؤں' کبھی وہ مجھے سمیٹ لے...... میں تو خود آپ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی...... میں جانتی ہوں لڑکیاں محبتوں میں بہت جلد سیریس ہو جاتی ہیں، اور پھر جب ان کو ان کی محبت نہیں ملتی تو ماں باپ کی عزت کی گٹھری اپنے سروں پر رکھ کر ساری زندگی دوسرے مرد کے ساتھ گزار دیتی ہیں لیکن حیدر صاحب میں آپ سے دعوے سے کہہ سکتی ہوں وہ لڑکیاں کتنا ہی اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کا ڈرامہ رچائیں، اکثر راتوں کو ان کا تکیہ بھیگتا ہے وہ تو شکر کیجیے کہ آنسوؤں کا رنگ نہیں ہوتا ورنہ یہ تکیہ ہر صبح نہ جانے کتنے لوگوں کا راز فاش کرتا...... آپ بے فکر ہو جائیے، میں منع کردوں گی مجھے آپ پسند نہیں آئے، تابندہ نے آپ کا بہت

انتظار کیا، آپ مزید اس کو انتظار مت کرائیے گا!''
تم مجھے بے حد پسند آئے ہو تم وہی ہو جس کو میں ڈھونڈتی تھی...... ردا نے دل میں اٹھتی خواہش کو سختی سے کچلا۔ آنکھ میں آیا آنسو بہت خوبصورتی سے پیا اور مسکراتے ہوئے کھڑی ہوگئی......

......☆......

''بس شاکر بھائی میری ہی مت ماری گئی تھی۔ آپ کے بھائی اور بچوں سب کی تو خواہش یہی تھی کہ تابندہ کو حیدر کی دلہن بننا چاہیے، بس میں بہت شرمندہ ہوں پھر حیدر بھی یہی چاہتا ہے آپ مجھے تابندہ دے دیں......''

''یہ کہا؟'' بھابی جان نے رخشندہ بیگم نے تیزی سے پاندان کا ڈھکنا بند کر کے شاکر میاں کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

''اور کیا بس رہنے دیں، مجھے بھی سب پتا ہے اس لڑکی نے خود منع کر دیا ہے، وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہے ظاہر ہے۔ جتنے بڑے گھر کی وہ لڑکی ہے اپنے ہم پلہ گھر میں ہی جانا پسند کرے گی اور اوپر بھابی جان کی ماسی بتا رہی تھی کہ حیدر ملنے گیا تھا اس لڑکی سے اس لڑکی کو حیدر پسند ہی نہیں آیا ......'' رخشندہ بیگم نے طنزیہ لفظوں اور لہجے میں جتایا......

''تو آپ ملازموں سے جاسوسی کروار ہی ہیں؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو......'' شاکر میاں جھنجلائے ان کو رخشندہ بیگم سے اس بات کی امید نہیں تھی......

''خیر چلیں بھابی جان عید کی شام کو انگوٹھی پہنانا چاہتی ہیں ہماری بیٹی کو لیکن بچیوں کا اصرار ہے کہ تابندہ کو سرپرائز دیا جائے......'' شاکر میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو جس میں سب کی خوشی......' رخشندہ بیگم سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی......

اپنے مطلب کا کام ہو گیا تو جس میں سب کی خوشی...... واہ میری چالاکو بیگم...... شاکر میاں دل ہی دل میں قہقہہ مار کر ہنسے اور آنکھیں موند لیں......

......☆......

ارے یہ کیا کایا پلٹ ہوگئی' امی کا تو ایک پیر اوپر اور ایک پیر نیچے...... یا اللہ امی کیسے راتوں رات بدل گئیں۔ کیسی خوش خوش مہمانوں کو ریسیو کر رہی ہیں چلو اچھی بات ہے انسان کو اپنا بھرم نہیں کھونا چاہیے اور حیدر...... حیدر کیسے خوش ہیں، چہرے کی مسکراہٹ اور بے ساختہ قہقہے رک ہی نہیں رہے...... نزہت کہتی ہے میں حیدر سے بات کروں۔
میں حیدر سے بات کیوں کروں؟ نہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ...... محبت کھو دی بھرم کبھی نہیں کھوؤں گی...... انشاء اللہ تعالیٰ۔

......☆......

''ابے گدھے تو تو کہہ رہا تھا کہ میں پاکستان آؤں گا ہی نہیں اور پھر آ دھمکا۔'' خالد نے کافی کا سپ لیتے ہوئے حیدر کو لتاڑا۔
''ارے آپ کی اماں جان صرف لڑکیاں ڈھونڈتیں رہیں بلکہ میری اطلاع کے مطابق وہ ایک لڑکی کو پسند بھی کر چکی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے مرد جو اپنی اماں کے سامنے ایک لفظ بھی نہیں بولتے جن میں اپنی محبت کو حاصل کرنے کی ذرا برابر بھی صلاحیت نہیں ہوتی...... وہ آخر محبت کرتے ہی کیوں ہیں؟
حیدر صاحب محبت قربانی مانگتی ہے...... محبت وہ لازوال جذبہ ہے جو کمزور لوگوں کو سوٹ ہی نہیں کرتا......''

اور وہ تابندہ جس نے چار سال اپنے اماں ابا کو ٹالنے اور آنے والے ہر رشتے کو رد کرنے کے لیے نہ صرف مختلف کورسز میں اپنے آپ کو الجھائے رکھا جس نے ہر لمحہ اپنے دل اور وجود کی حفاظت کی اس نے نامکمل جملے کے لیے جو وہ کہہ نہ سکی تھی......
اور آپ......

’’ارے کہاں کھو گیا یار......‘‘

اور حیدر جس کے کانوں میں نزہت کی باتیں جو اس نے اس کو فون کر کے سنائی تھیں گونج رہی تھیں ......چونک سا گیا۔

کچھ نہیں ......بس ......میں نے سوچا' واپسی ضروری ہے سو میں آ گیا ...... اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا......

تابی سے مجھے بے حد محبت ہے۔ مجھے اس سے اس وقت سے محبت ہے جب مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟

وہ اتنی معصوم اور بھولی ہے کہ جب میں آیا تو اس نے ایک لفظ شکایت کا بھی تو نہیں کہا میں جانتا ہوں وہ آنسو جو آج کل وہ پی رہی ہے اس کے دل پر گر رہے ہوں گے میں انشاءاللہ ان تمام آنسوؤں کو سمیٹ لوں گا......

حیدر اپنے خیالوں میں اس قدر گم تھا کہ اس کو احساس بھی نہیں ہو سکا کہ خالد اس کی خاموشی سے بیزار ہو کر کب کا جا چکا تھا۔

......☆......

ہماری اماں کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یا تو اس قدر ناراض تھیں کہ کسی سے بات کرنے پر تیار نہیں تھیں اور اب یہ حال ہے کہ میرے جہیز کے ٹرنک میں سے جوڑے نکال نکال کر باقر چچا کی دلہن کو دے رہی ہیں تاکہ وہ فائزہ کے لیے پیک کر دیں......چلو کوئی بات نہیں بس گھر کا ماحول خوشگوار رہے یہ خوشی کی بات ہے پرسوں حیدر کا نکاح ہے کل چاند رات کو بری جائے گی مجھے بھی جانا پڑے گا۔ میں کیسے برداشت کروں گی' حیدر کے ساتھ کسی اور لڑکی کو......اف میرے اللہ پاک...... مجھے حوصلہ دینا میں جانتی ہوں آپ اپنے بندوں پر ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے......لیکن میرے پیارے اللہ میاں جی...... میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے......میرا تو دل بند ہو رہا ہے......اس کی آنکھ سے آنسو آٹے میں جا گرے جس کو وہ گوندھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو پیچھے کھڑی رخشندہ بیگم کا دل چاہا کہ لاڈلی بیٹی کو سینے سے لگا کر دل بھر کر پیار کریں لیکن......

......☆......

تم مہندی کیوں نہیں لگوا رہی ہو، کلثوم بیگم نے تابندہ سے آ کر پوچھا۔ بس تائی اماں کام بہت ہے نا، تو سب ہی مہندی لگوا لیں گے تو کام کون کرے گا۔

تو بیٹا کام کرنے والے بہت' چلو تم فوراً نہا دھو کر آؤ تاکہ تمہارے ہاتھ پیروں پر مہندی لگے، حد ہو گئی، سارے خاندان کے مہندی لگے اور......

’’جی ......جی پھوپھی جان ......بس لگوا رہی ہوں تابندہ کے مہندی شاکر میاں کی پھوپی جو آج ہی اسلام آباد سے کراچی آئی تھیں ان کی بات کو رخشندہ بیگم نے بیچ میں سے کاٹا......

......☆......

بنو رانی دلہنیا بنے گی......\
گورے ہاتھوں میں مہندی رچے گی

نہیں......نہیں یہ نہیں بلکہ یہ گاؤ\
مکھڑے پہ سہرا ڈالے، آ جاؤ آنے والے\
چاند سی بنو میری تیرے حوالے

تابندہ کے مہندی لگ رہی تھی فائزہ بھی مایوں کا جوڑا پہنے شاکر میاں کے پورشن میں آ گئی تھی......اور اب وہ بھی ساری کزنز کے ساتھ مل کر لہک لہک کر گانا گا رہی تھی عید کا چاند ہو چکا تھا۔ گھر کا ماحول کچھ اس طرح تبدیل ہو گیا تھا کہ تابندہ کا دل کچھ عجیب سی لے پر دھڑکنے لگا تھا......

حیدر جو پچھلے تین دنوں سے گھر میں نظر نہیں آ رہا تھا بلیک کرتے شلوار میں بیٹھا مسکرا رہا تھا، اور نزہت جو حیدر کے نام سے چڑتی تھی، وہ تھوڑی

تھوڑی دیر بعد آ کر حیدر کے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی......

کچھ گڑ بڑ ہے...... تابندہ نے اوپر سے تائی اماں اور دیگر رشتہ دار خواتین کو اترتے دیکھ کر اور پھر لڑکیوں کے گانے کی آواز کو اونچا ہوتے دیکھ کر کہا

......☆......

''چلو بھئی بہت ہو گیا، بہت بچی کو تم لوگوں نے حیران اور پریشان کر دیا تم لوگوں کی عمریں ہیں یہ شرارتیں کرنے کی'' پھوپھو جمیلہ (شاکر میاں کی پھوپھی) نے سرخ کامدار دوپٹہ تابندہ کے سر پر ڈالتے ہوئے محبت سے مسکراتی کلثوم بیگم اور رخشندہ بیگم کو ڈانٹا......

''ارے جب تین دن پہلے اس نگوڑی ماری لڑکی نے منع کیا تھا اور تم لوگوں نے حیدر اور تابندہ کا رشتہ طے کیا تھا تو کم از کم بچی کو بتا تو دیتے...... حد ہوتی ہے۔''

بس اب کوئی انگوٹھی ونگوٹھی نہیں پہنا رہا...... چلو باقر میاں مولوی صاحب کو بلواؤ...... بس نکاح پڑھواؤ...... اور سن لو بھئی ابھی نکاح ہوگا...... جمیلہ پھوپھو کیا بول رہی تھیں۔

تابندہ کو لگ رہا تھا بس کسی بھی لمحے وہ بے ہوش ہونے والی ہے...... شطرنج کی بساط اس طرح بھی پلٹتی ہے یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا' اماں کے رویے کی تبدیلی، نزہت کا بھاگ بھاگ کر تائی اماں کی طرف جانا...... حیدر کی گھر میں موجودگی۔

یا اللہ سب نے مل کر مجھے کتنا ستایا ہے...... تابندہ کا دل چاہا رونے لگے...... کتنی پریشان رہی ہے وہ...... اور سب انجوائے کرتے رہے......

......☆......

پھوپھی جمیلہ میری درخواست پر آپ آئیں اور ساری بات میری مرضی کی کرادی بس ایک کام اور کر دیں...... آج نکاح کے ساتھ رخصتی بھی کروادیں......

مسجدوں میں چاند رات کی مبارکباد کے اعلانات ہو رہے تھے' اندر تابندہ حیدر کی تائی دلہن کی طرح سجائی جا رہی تھی اور باہر حیدر کھڑا پھوپھی جمیلہ کی منتیں کر رہا تھا......

......☆......

''ملن کی یہ حسین عید کی صبح مبارک ہو، میری جان!''

حیدر نے اس کے ریشمی بالوں میں چہرہ چھپا کر، اس کی کمر کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے سرگوشی کی اور وہ حیدر کے سینے میں سر چھپائے اس کی دھڑکنیں گننے لگی۔

زندگی کی یہ عید، اتنی حسین ہوگی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا......

اس کا دل چاہا، وہ زور...... زور سے کہے سب کو عید مبارک...... لیکن...... زندگی کی اس خوبصورت عید کو حیدر کے سینے میں سر چھپائے اپنی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی......

اسی عید کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہ تھا لیکن کاتب تقدیر نے قلم کی ایک جنبش سے زندگی رنگوں سے بھر دی تھی......

باہر حیدر کو عید کی نماز کے لیے بلایا جا رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح منہ بسور رہا تھا، تابندہ نے مسکراتے ہوئے اسے دروازے کی طرف دھکیلا، حیدر نے اس کو بے بسی سے دیکھا اور وہ ہنستی چلی گئی...... کہ نئی زندگی کی پہلی صبح کی ہنسی اتنی خوبصورت ہوگی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا......

خدا تم کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے میری جان...... حیدر نے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے پلٹ کر اس کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے لیے دعا کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

افسانہ

کرن لقمان

زیست کی کٹھنائیاں

انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے دکھ کو تو کوہ ہمالیہ سے بھی بڑا تصور
کرتا ہے مگر جب کسی کو اس سے بھی بڑی مصیبت میں گرفتار دیکھتا
ہے تب اپنی پریشانی کم محسوس ہوتی ہے...... عائشہ بھی اپنی ماں کو
موت کی آغوش میں جاتا دیکھ کر حواس باختہ تھی......

نصف شب اپنی ظلمت سمیٹ چکی تھی۔

اٹھارویں شب کا دھندلا اور آدھا ادھورا چاند آہستہ آہستہ اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔ آدھی دنیا اپنی الجھنیں اور پریشانیاں نیند کے ہاتھوں گروی رکھوا کر سو رہی تھی پر عائشہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی، اس کے اعصاب خستہ حال تھے خدشوں میں لپٹے، دل کی دھڑکن اب کچھ پرسکون تھی، ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ڈاکٹروں اور نرسوں کا جلگھٹا اس کی ماں کے آس پاس سے چھٹا تھا۔ اس کی ماں کا بیہوش وجود آکسیجن ماسک اور مختلف قسم کی ڈرپس کی سوئیوں سے جکڑا ہوا مدھم مدھم سانس لیتا اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک مقامی ہسپتال کی چوتھی منزل پر پرائیویٹ ائیر کنڈیشنڈ روم میں اپنی ماما کے ساتھ موجود تھی۔ آج اس کی ماما مسز شائستہ وقار کا ایکسیڈنٹ سپر ہائی پر نوری آباد کے قریب اس وقت ہوا جب کہ وہ اپنی ماں یعنی عائشہ کی نانی سے مل کر حیدر آباد سے کراچی اپنے ڈرائیور کے ساتھ واپس آ رہی تھیں۔ نوری آباد سے کراچی کے اس ہسپتال تک آتے آتے ان کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ پچاس سالہ ڈرائیور جمن سائیں موقع پر دم توڑ گیا تھا۔ مسز وقار کے بچنے کی امید بھی کم تھی، اگلے چوبیس گھنٹے ان کی زندگی کے لیے اہم تھے۔

وقار صاحب ہسپتال پہنچ چکے تھے اور اب بیگم وقار کو شہر کے بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

ناگہانی آفت کسی سے پوچھ کر کب آتی ہے شام تک وہ سب کتنے خوش تھے اس کے چھوٹے جڑواں بہن بھائی دانیہ اور سفیر اور وہ خود بھی رنگ برنگے غبارے پھلاتے، چمکیلی پنیوں اور جلتے بجھتے قمقموں سے لاؤنج کو سجاتے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ سب کچھ بکھرنے والا ہے، آنے والا وقت ان کے لیے خوشی کی بجائے دکھ کا پیام لا رہا ہے۔ آج ان کے ماما، بابا کی بیسویں میرج اینورسری تھی جو اس حادثے کی نذر ہوگئی۔ اسے اپنی ماما سے عشق کی حد تک محبت تھی اسے لگا اگر اس کی ماما کو کچھ ہوا تو وہ بھی جی نہیں پائے گی شام سے لے کر اب تک کے حالات کو سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئی تھیں کمرے کی خنک فضا میں اس کا دم گھٹنے سا لگا۔ وہ دروازہ کھول کر کوریڈور میں نکل آئی اس کے بائیں ہاتھ پر دو تین پرائیویٹ رومز کو چھوڑ کر بڑی سی بالکنی تھی جس سے نیچے سہراب گوٹھ کی طرف جانے والا دو رویا چوڑا روڈ دکھائی دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں آ گئی۔ نیچے ٹریفک رواں دواں تھا، دن جیسا رش اور رونق تو نہیں تھی پھر بھی کچھ میڈیکل اسٹورز اور کھانے پینے کی اشیاء کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ آتے جاتے اپنے حال میں مگن لوگوں کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ کسی کا گھر ماتم کدہ بنا ہے یا کسی کی خوشیوں بھری زندگی پر موت دکھ کی چادر بھی پھیلا سکتی ہے۔ ایک لمحے کو اس کے لاشعور نے اسے ایک ایسا منظر دکھایا جس میں زندگی کے تمام کردار موجود تھے پر اس کی ماں نہیں تھی۔ اس منظر کو سوچ کر وہ بے اختیار چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چند لمحے بعد اسے اپنے دائیں کاندھے پر انسانی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، اس نے چونک کر چہرہ گھما کر دیکھا سفید دوپٹے کے ہالے میں ایک نورانی چہرہ، منحنی سا وجود، ایک ہاتھ میں چھوٹے سائز کا قرآن پاک سینے سے لگائے۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔

وہ چند لمحے اس چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ ''نا بیٹی ناں! ایسے نہیں روتے صبر کرو کبھی کبھی یہ آنسو دل کا بوجھ تو ہلکا کر دیتے ہیں پر ہمت

اور حوصلہ ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔'' یہ کیسی بات کی ان خاتون نے، ابھی چند لمحے پہلے بری طرح روتے ہوئے اسے بھی یہی لگا تھا کہ وہ ہمت اور حوصلہ کھو چکی ہے۔

''کیسے صبر کروں آنٹی مجھ سے ہوتا ہی نہیں آپ کو نہیں پتہ میری ماما کی کنڈیشن بہت سیریس ہے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں، اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ مر بھی سکتی ہیں۔''

یہ کہتے کہتے اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی وہ جو کوئی بھی تھیں انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا اور چپ کرانے کی بجائے کھل کر رونے دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود ہی خیال کر کے ان سے الگ ہوگئی۔

''سوری میں نے آپ کو بھی پریشان کر دیا!'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''نہیں بیٹا...... اب تو کوئی پریشانی پریشانی نہیں لگتی۔''

''اچھا، کیوں؟'' اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔

''بس ایسے ہی...... کیا میں تمہاری ماما کو دیکھ سکتی ہوں۔''

''شیور! آئیں میں آپ کو لے چلوں۔''

کمرے کا دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر داخل ہوئیں۔ وہ خاتون ماما کے قریب آئیں۔ وہ خاتون ماما کے قریب، چند لمحے انہیں دیکھنے کے بعد انہوں نے ہاتھ میں پکڑا قرآن پاک کھولا اور کچھ بلند آواز میں سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگیں۔ کمرے کا ماحول ایک دم نورانی ہوگیا۔ عائشہ کو ان سے ایک روحانی عقیدت محسوس ہوئی حقیقت یہ تھی کہ اس سارے واقعے میں وہ ابھی تک ڈھنگ سے اپنی ماما کے لیے دعا بھی نہیں کر پائی تھی۔ بس آنے والا ان دیکھا بھیانک وقت اس پر حاوی ہوئے جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بار بار یہ تو نکلا تھا کہ یا اللہ میری ماما کو بچا لے پر ایک بار بھی اس نے سجدے میں سر رکھ کر اپنے رب سے ان کی زندگی نہیں مانگی تھی۔ قرآنی آیات کا ورد کر کے ان پر دم نہیں کیا تھا، جب تک بابا ہسپتال میں تھے اسے ماما کے ساتھ ان کی بھی فکر تھی کہ اس کے بابا ہارٹ پیشنٹ تھے اور ماما سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ مسز وقار کو دیکھ دیکھ کر ان کی حالت بگڑ رہی تھی، گھر سے دانیہ اور سفیر کے بھی بار بار فون آ رہے تھے ان کا الگ رو رو کر برا حال تھا۔ ان خاتون نے تلاوت ختم کر کے مسز وقار پر دم کیا اور عائشہ کی طرف پلٹیں، اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''فکر نہ کرو اگر خدا کو منظور ہوا تو تمہاری ماما بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''اور اگر خدا کو منظور نہ ہوا تو؟'' اندیشوں میں گھری اس کی بات پر بس وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''زندگی کے اسٹیج پر ہر شخص کو اپنا کردار اتنا ہی نبھانا ہے بیٹا جتنا لکھا جا چکا ہے...... اگر تمہاری ماما کا سین باقی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں زندگی کی طرف واپس آنے سے روک نہیں سکتی۔'' ان کے حقیقت سے بھرپور فلسفے پر وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے اس سے پوچھا۔''خیر یہ بتاؤ کہ تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں......؟''

''کچھ کھانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا۔'' عائشہ نے جواب دیا۔

''ہوں ہوتا ہے ایسا پر بیٹا مریض کو سنبھالنے کے لیے تیمار دار کا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے تم آؤ میرے ساتھ۔''

وہ خاتون کے پیچھے پیچھے کمرے سے

باہر آ گئی دونوں دائیں طرف کوریڈور کے آخر میں بنی کینٹین کی طرف آئیں انہوں نے سینڈوچز اور چائے کے دو کپ لیے اور وہیں بنچ پر بیٹھ کر بہت محبت سے عائشہ کو کھلانے لگیں۔

''تھینک یو آنٹی آپ نے ماما کا اور میرا اتنا خیال کیا۔''

''کوئی بات نہیں، یہ تو انسان کا انسانوں پر حق ہوتا ہے کوئی احسان نہیں۔'' اچانک کچھ دھیان آنے پر اس نے پوچھا۔

''آنٹی آپ یہاں کس کے ساتھ ہیں' آئی مین! کوئی مریض؟''

''ہاں! میں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ ہوں۔''

''آپ کی بیٹی، کیا ہوا اسے؟'' اس سوال پر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''کلینکل ڈیتھ......''

''جی ...... میں سمجھی نہیں۔'' اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''میری بیٹی کوما میں ہے۔ میڈیکل سائنس کے مطابق وہ پچھلے ساڑھے چار ماہ سے ایک مردہ زندگی گزار رہی ہے یعنی نہ وہ زندوں میں ہے اور نہ مُردوں میں۔''

''اوہ......'' وہ کچھ دیر دکھ سے انہیں دیکھتی رہی۔

''تو یہ کیسے ہوا؟''

''اس کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ آپریشن کے لیے اسے بیہوش کیا گیا تھا پھر وہ ہوش میں نہیں آئی۔''

''میں دیکھ سکتی ہوں اسے؟'' اس کے دل میں تجسس جاگا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کو دیکھنے کا جو بیک وقت زندہ بھی تھی اور مُردہ بھی۔

''ہاں کیوں نہیں آؤ میں تمہیں اپنی رانیہ سے ملواؤں۔''

جس روم میں اس کی ماما تھیں اس سے دو روم پہلے ایک پرائیویٹ روم میں داخل ہوئیں۔ ہاسپٹل کے سفید لباس میں ملبوس وہ لڑکی بالکل سوئی ہوئی کوئی گڑیا لگ رہی تھی۔ اکیس بائیس سال کی وہ لڑکی بیحد خوبصورت تھی پر اس کی جلد میں ہلکی سی زردی گھلی ہوئی تھی وہ کچھ دیر بنا پلک جھپکے رانیہ کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی

''آپ دن رات ان کے ساتھ ہوتی ہیں؟''

''میں صبح دس گیارہ بجے تک آتی ہوں اس کے پاس پھر شام ساڑھے آٹھ بجے تک واپس چلی جاتی ہوں، کبھی کبھار دل گھبراتا ہے تو رات کو رک جاتی ہوں آج بھی دل کی اسی بے چینی نے روک لیا تھا ورنہ میں اس وقت تمہیں نہ ملتی، اتوار کو میری دوسری بیٹی آجاتی ہے اور میں گھر میں رکے ہوئے کام نمٹاتی ہوں۔''

''رانیہ کے علاوہ آپ کی کوئی اور بیٹی بھی ہے؟'' اس کی بات سن کر وہ مسکرائیں۔

''ہاں، ماشاء اللہ میری چھ بیٹیاں ہیں بلکہ اب تو سات ...... سات ...... ہاں رانیہ کی بیٹی بھی تو میری ہی بیٹی ہے۔''

''کیوں وہ اپنی فیملی کے پاس نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے اپنے فادر کے پاس؟''

''نہیں جب رانیہ کوما میں گئی تو چند دن اس کے ساس سسر اسے دیکھنے آتے رہے، دو ہفتے تک اس کا شوہر بھی آیا پر اب کوئی نہیں آتا شروع میں فون کر لیتے تھے اب وہ بھی نہیں کرتے، بچی کو انہوں نے پہلے دن سے ہی ہمیں سونپ دیا تھا کیونکہ اس کی دادی جوڑوں کے درد کی مریضہ ہے اور پھوپھیوں کو بچے پالنے کا کوئی تجربہ نہیں، تائی اور چاچی کے اپنے چھوٹے بچے ہیں، وہ

مزید کسی چھوٹے بچے کو نہیں پال سکتیں اس لیے رانیہ کی بیٹی بھی میرے پاس ہی ہے میری بچیاں مل کر اسے سنبھالتی ہیں۔"

ان کی باتیں سن کر عائشہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"رانیہ کے علاوہ آپ کی کوئی بیٹی میرڈ نہیں ہے؟"

"نہیں رانیہ سب سے بڑی ہے، اس کے بعد میری دو بیٹیوں کی منگنی ہوگئی ہے پر دونوں نے شادی سے انکار کر دیا ہے، وہ دونوں رانیہ کو دیکھ کر شادی سے خوفزدہ ہوگئی ہیں۔"

دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ عائشہ کو ایسا لگا کہ اس کے سامنے منحنی سا وجود نہیں بلکہ صبر کا پہاڑ کھڑا ہے، اب اسے سمجھ آیا آنٹی نے کیوں کہا تھا "اب تو کوئی پریشانی پریشانی ہی نہیں لگتی۔"

مسز شائستہ وقار کے ساتھ کون ہے؟ پاس سے گزرتی ایک نرس نے پوچھا۔ "جی میں ہوں!" وہ آگے بڑھی۔

"لیبارٹری سے بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹس لے آئیں۔"

وہ تیز قدموں سے لیبارٹری کی طرف بڑھ گئی۔

اگلی صبح ڈاکٹروں نے نوید سنا دی کہ اس کی ماما کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔

وہ خوشی خوشی رانیہ کے کمرے میں آئی۔ آنٹی کو خوشخبری سنانے پر وہاں رانیہ کے بے حس و حرکت وجود کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے رانیہ کے پاس کھڑے ہو کر دل سے دعا کی اس کے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ جانے کی اور پھر ماما کے کمرے سے وہ گلدستہ اٹھا لائی جو بابا لائے تھے اور بڑی عقیدت سے رانیہ کے سرہانے رکھ دیا۔

☆......☆

غزل

شفیق احمد شفیق

آزاد فضا ہے یا ہے گھٹن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا
کس حال میں ہیں یارانِ چمن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

ویران نظارے لگتے ہیں، کیوں ماند ستارے لگتے ہیں
بے نور سا ہے کیوں آج گگن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

کیوں پھول نہیں گلشن میں کھلے، کیوں سارے شجر ہیں زرد پڑے
کیوں سوکھا سوکھا ہے ساون، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

یہ کیسا زمانہ آیا ہے، ہر سمت اندھیرا چھایا ہے
ہے چاند اور سورج میں بھی گہن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

تم خواب ہمیں دکھلاتے ہو، تعبیر نہیں دے پاتے ہو
کیوں توڑتے ہو تم اپنا وچن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

ہے کون پریشاں حال یہاں، ہے حسرتِ دل پامال یہاں
ہے عیش و طرب میں کون مگن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

آزاد سموم و صرصر ہیں، بکھراؤ کے ہر سو منظر ہیں
قابو میں نہیں حالات چمن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

جو بات شفیق احمد نے کہی، وہ بات ہے سچی اور کھری
ہے جھوٹ سے خالی اس کا سخن، قرطاسِ ہوا پر لکھ دو نا

افسانہ

حمیرا فضا

آئینے میں ایک اور پچھتاوا

فریحہ کے دل پر دھرا بوجھ اس کو جینے نہیں دے رہا تھا... محبوب شوہر کو دھوکے میں رکھنا اور پارسائی کا لباس زیب تن رکھنا شادی کے 9 سال بعد بہت مشکل ہو گیا... بالآخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا...

کبھی بھی کسی گناہ سے آگاہی، کسی غلطی کا ادراک کسی خطا کا احساس ہی تب ہوتا ہے جب وہ نجاست کی طرح جسم سے چمٹ جائے، وہ نجاست جسے ندامت کے سینکڑوں آنسو مل کر بھی پاک صاف نہ کر پائیں۔ وہ بھی ایک ایسے گناہ کی مرتکب ہو چکی تھی جسے شریف لوگ منہ سے ادا کرنا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ گناہ جس نے اس کے سکھ کو کھا کر دکھ کو امر کر دیا تھا، وہ گناہ جو دن کے اجالے کا دشمن اور رات کی سیاہی کا ہمنوا تھا، وہ گناہ جو آئینے کی طرح گھر کے ہر کونے پر آویزاں تھا جس میں اس کو اپنی صورت مسخ شدہ دکھائی دیتی تھی۔

یہ عمر کا وہ حصہ تھا جس نے جمیل کی آنکھوں میں اسے زندگی کے رنگین پہلو دکھائے بیباک جوانی نے محبت کو کمزور کر دیا تھا، بزدل بنا دیا تھا، ایسی بزدل محبت جو عزت کی طاقت سے لڑ نہیں پاتی اور نفس کے دودھاری وار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے محبت کی اس راہ میں شرافت کچلی گئی تھی جس پر چلتے چلتے جمیل بے وفائی کے راستے پر نکل گیا اور وہ پشیمانی کی منزل پر تنہا رہ گئی۔

پہلے پہل تو یہ پچھتاوے کے کیڑے بدن پر صرف رینگتے تھے مگر شادی کے بعد پوری رفتار سے دوڑنے لگے۔ جیسے سارے موسم سال بھر آگے پیچھے دوڑتے ہیں، جسم میں چبھتے اضطراب کے گرم موسم، خیالات کو کپکپاتے قلق کے سرد موسم، دل کو پل پل توڑتے خزاں کے مایوس موسم، اور آنکھوں کو پرنم رکھتے بے خوابی کے گیلے موسم جب کبھی اقبال کی معصوم صورت کے بعد جمیل کی مکروہ شکل نظر آتی تو زندگی کا روپ مزید بھیانک ہو جاتا۔ اقبال کی محبت ایک خوبصورت خواب تھا جس میں وہ ڈر ڈر کر جی رہی تھی۔ خوف تھا کہ اقبال کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دنیا سے بے دخل نہ کر دے جس کے باہر صرف حقیقت کی رسوائی بھری دنیا تھی۔

اسے لگتا تھا یہ صف ملال نہیں وہ جوان سوکن ہے جو اس کے اور اقبال کے دل کے بیچ تاک لگا کر بیٹھی ہے، ضمیر کی دن رات کی ضرب ان طعنوں کی طرح ہے جو گھر بیٹھی ڈھلتی عمر کی لڑکیوں پر جاہل ماں باپ کستے ہیں اور افسوس کی یہ تیز جلن اس بھڑکتی آگ کا نتیجہ ہے جو صرف چمڑی ہی نہیں سکھ چین بھی جلا دیتی ہے۔

''فریحہ ساری آوازیں میری سماعتوں سے قطع تعلق کر لیں جو تمہارے بارے میں غلط سن کے سہہ جاؤں، سب تصویریں آنکھوں کو نوچ کھائیں جو تمہارے سوا کسی اور کو دیکھوں، تمام لفظ خاموشی کے در میں جا بیٹھیں جو تمہاری دل آزاری کروں۔''

اقبال کی ایسی شاعرانہ تعریف اس کی جان پر ہمیشہ ایک ڈنک کی طرح لگتی۔ پچھتاوے کا وہ ڈنک جو کئی کئی روز تک اسے تڑپاتا رہتا۔

عورتوں کو اچھے شوہر مل جائیں تو وہ انہیں اپنے کسی نیک فعل کا انعام سمجھتی ہیں مگر اسے تو بھولے سے بھی کوئی چھپائی ہوئی، کمائی ہوئی نیکی یاد نہ آتی۔ وہ بچپن سے ہی فلمی گانوں کی شوقین تھی، صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کہنے والی خود سر طبیعت کی مالک، بے شرمی کو لباس کی خوبصورتی اور بد اخلاقی کو صاف گوئی کی علامت سمجھنے والی۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ بچپن سے ہی قصوروار ہے۔ لڑکپن کی خطاؤں کے قطروں نے اسے گناہوں کے سمندر میں دھکیلا تھا وہ سمندر جس میں اقبال کی اچھائیاں اور اس کی کوتاہیاں تیر رہی تھیں وقت الارم بجا رہا تھا کہ ڈوبنا مقدر ہے۔

اقبال کی وفا اور جمیل کے دھوکے نے اسے یکسر بدل ڈالا تھا۔ زندگی کے البم میں غلطیوں کی پرانی تصویریں تو تھیں لیکن کسی نئی تصویر کا اب تصور تک نہ تھا۔ ابتدا تو میلی تھی اختتام سے بھی یہی امید تھی اسے مگر بیچ کی اجلی چادر نے گھنا سایہ عطا کیا تھا

محبت اور توجہ کا سایہ، پر اس سائے کو کاٹتی تاسف کی دھوپ نے اسے کبھی مکمل خوش نہ ہونے دیا۔

صرف وقت ہی نہیں اقبال کی آنکھوں میں محبت بھی بڑھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں تعجب...... اکثر وہ اپنے آپ کو اس تنگ دست شخص کی طرح سمجھتی جو راہ چلتے مالا مال ہو چکا ہے۔ ہنوز بے یقینی تھی کہ یہ چاہت اور عزت کی دولت قسمت کی مہربانی ہے یا آزمائش کا اشارہ۔ حیرانی تھی کہ اقبال اتنا اچھا کیسے ہو سکتا ہے اور اس پہ حیرت کا اس کا کیسے ہو سکتا ہے۔ شاید یہ تنہائی کی معافیوں کا صلہ تھا یا گناہ کی سنگینی کا احساس لیکن دل مطمئن کیسے ہوتا۔ اعتراف جو ابھی باقی تھا۔

زندگی کئی واقعات سے بھر چکی تھی جو یقین دلانے کے لیے کافی تھے کہ وہ اقبال کے بالکل قابل نہیں ایک بار بھری محفل میں اقبال کی ایک شوخ کزن نے ان کا کڑا امتحان لیا۔ سوال تھا کہ ان کی لیلیٰ مجنوں جیسی محبت کی وجہ کیا ہے؟ ''اگر میں مصور ہوتا وفاداری، پارسائی کی شکل بناتا تو کاغذ پر فریحہ کا وجود ابھرتا۔ اگر شاعر ہوتا حسن اور دلکشی پر غزلیں کہتا تو فریحہ کا چہرہ ہی اس کا موجب بنتا لیکن میں ایک عام سا بندہ ہوں اور اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کی زمین ہری بھری ہے حسین ہے کیونکہ میں ایک نیک اور خالص دل کا شریک حیات ہوں۔'' وہ شرم کے مارے چپ رہی تھی مگر اقبال کے جذباتی جواب نے اس کی شرم کو شرمندگی میں بدل دیا تھا۔

وقت آگے بڑھ کر اور کم ہوا مگر ڈنک پوری شدت سے لگ رہے تھے وہ جب بھی خود سے ملتی بے ایمانی، بے وفائی کے ڈنک الجھن اور چبھن کے ڈنک کئی نشان چھوڑ جاتے جن کو چھپاتے چھپاتے وہ تھک گئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا اقبال کو سب کچھ بتا کر بیقراری کی دوزخ سے رہائی پا لے پر بچی سجائی بنی بنائی جنت کو کھونے کا ڈر ایسے گھیر لیتا جیسے ویران جنگل میں تن تنہا مسافر کو بھوکا پیاسا شیر۔

''جانتی ہو فریحہ میں نے اتنے برس نابینا گزارے ہیں۔ اس انوکھی بات پر اس نے اچنبھے سے اقبال کو دیکھا دکھ اور فریب نے وہ روشنی سلب کر لی تھی جس سے چیزیں اور رشتے صاف نظر آتے ہیں، پھر تم میری زندگی میں آئیں اور تمہارا چہرہ جو صرف درخشاں نہیں سچا بھی ہے اسے دیکھ کر ہی سب رشتے صاف اور سچے نظر آئے۔ ہر شے خوبصورت دکھائی دی۔'' اقبال کا سر زعم سے اٹھا ہوا تھا اور اس کی گردن غم سے جھکی ہوئی عین دل پر ڈنک لگا تھا، لاعلم اندھی محبت کا ڈنک۔ وہ اس شخص کو روک نہیں پا رہی تھی جو اپنے ہی خمار میں اسے محبت کی چوٹیوں تک لے جا رہا تھا بغیر یہ جانے کہ وہ روز پشیمانی کی کھائی میں گر رہی ہے۔

دیکھنے میں اس کی زندگی مکمل تھی، تین پیارے پیارے بچے، محل جیسا گھر محبت لٹاتا شوہر وہ خوشیوں سے ایسے لدی ہوئی تھی جیسے مہارانیاں زیورات سے لدی ہوتی ہیں۔ مگر اندر ایک خلا تھا جسے پر کرنے کے لیے آسائشیں اور محبت ناکافی تھی۔ یہ زندگی کی وہ خالی جگہ تھی جو اس کے اپنے لفظوں سے ہی بھرنی تھی اپنے سچے لفظوں سے۔

آخر ہمت نے ہتھیار ڈال دیے۔ جسم ڈنک کے وار سے تھک چکا تھا تو روح ضمیر کی مار سے۔ اس نے یہ اندیشہ کچل دیا کہ وہ جنت سے نکالی جائے گی کیونکہ دوزخ میں رہنا اب اسے گوارا نہیں تھا۔ شادی کو نو برس بیت چکے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی شادی کی سالگرہ پر اقبال کو اب تک کا بہترین تحفہ دے گی حقیقت اور سچ بیانی کا تحفہ۔

وہ اظہار میں جتنا سخی تھا وہ اتنی ہی کنجوس۔

''فریحہ بس ایک ہی شکایت رہی تم سے کہ تم باتیں

سنبھال کر رکھتی ہو۔ آج شام میں جلدی آجاؤں گا نیا سامان لے کر نئے تحفے لے کر دل کے بکسے سے سارا پرانا سامان نکالیں گے نئی چیزوں کی جگہ بنائیں گے۔ آج ہم ڈھیروں باتیں کریں گے، میٹھی باتیں جمع کر کے تلخ باتیں تفریق کر دیں گے۔ دل کے شیلف خالی رکھنا، نئی باتوں اور نئی یادوں کے لیے۔''

اقبال کے چہرے پر بے تحاشہ محبت تھی اور لہجے میں گہری سنجیدگی۔ وہ محبت کی ادا میں ایسی کھوئی کہ لہجے پر غور نہ کر سکی۔

ان کی شادی کی سالگرہ پر موسم خوشگوار سا ہوتا تھا، شاید دل مسرور ہو تو باہر کا موسم دنیا کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے لیکن آج موسم میں سوگواری تھی یقیناً باہر کی دنیا دل کی مرضی کے ماتحت تھی۔ معصیت کا لباس اترنے والا تھا، اس کا دل چاہا کہ سفید کپڑے پہن لے وہ سکون کے حصول سے پہلے سکون کی تاثیر محسوس کرنا چاہتی تھی۔

اقبال کے آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی مگر ان کے آنے سے پہلے نہ آنے کی اطلاع آ گئی۔ ایک حادثے نے اقبال کی جان لے لی تھی اور اس خبر نے اس کی۔ وہ دلوں کی عارضی جدائی مٹانے کے لیے بھاگ رہی تھی اور دائمی جدائی سے ٹکرا گئی۔ اعتبار اور برداشت ساتھ نہیں رہے تھے کہ اب اس کا اور اقبال کا ساتھ نہیں رہا۔

''اقبال چلے گئے، کیوں چلے گئے؟ کیسے جا سکتے ہیں وہ؟ میرا دل کا بوجھ ہلکا کیے بغیر؟ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ میری محبت کی شدت کو جانے بغیر، کیوں خاموش ہو گئے؟ میرے گناہوں کا اعتراف سنے بغیر۔'' وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھی لیکن ضمیر کی دل شکستہ آوازیں ہر پل ستا رہی تھیں۔

وہ روز اقبال کی کسی نہ کسی پسندیدہ چیز کو ضرور چھوتی۔ کسی کو محسوس کرنے کا شاید یہ احمقانہ طریقہ ہو مگر محبت ہمیشہ فراست اور حماقت کے بیچ ہی جھولتی رہتی ہے۔ وہ ہچکولے لیتی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی پتوں اور ہواؤں میں اداس گفتگو جاری تھی۔ اقبال کے ہاتھ کے لگائے پودے ان کے منتظر کھڑے تھے۔ ننھے سیب، انگور کی بیلوں کو تسلی دے رہے تھے۔ سفید کلیاں لال گلابوں سے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔

اس کے ہاتھ میں ڈائری تھی وہ جس سے جڑی تھی جو اس کے وقت اور محبت میں برابر کی شریک تھی۔ اقبال نے بچھڑنے سے ایک دن قبل تین صفحے لکھے تھے۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا، آنکھیں پانی سے بھر گئیں، پورا صفحہ محبت سے بھیگا ہوا تھا۔ اتنی تڑپ دیکھ کر بے چینی اور بلبلا اٹھی، اتنی عزت پا کر عزتِ نفس کو مزید ٹھیس لگی، الفت کی ایسی دیوانگی پر خاموش محبت کو نہایت صدمہ ہوا۔

اس نے اگلا صفحہ پلٹا...... یوں لگا ہوا کے لب سل گئے...... پودوں کی سانس رک گئی...... پھولوں نے آنکھیں میچ لیں اور کھڑکی کی جان نکل گئی۔ دوسرے صفحے پر وہ گناہ برہنہ پڑا تھا جو اس کی دانست میں پردے میں تھا۔ جس کی لاش کا ٹھکانہ بس اسے ہی معلوم تھا۔ اقبال نے ٹھکانہ ڈھونڈ لیا تھا اور لاش کو معافی کی قبر میں دفنا بھی دیا تھا۔ اسے لگا سارے ڈنک مر گئے سارے بوجھ ہٹ گئے سارے نشان ہٹ گئے۔

وہ تیسرے صفحے پر آئی...... جسم کو حیرت اور غصے کے کئی جھٹکے لگے مگر جلد ہی اسے محبت اور ظرف نے تھام لیا معافی کی خیرات دے کر معافی کی بھیک مانگی گئی تھی۔ آخری صفحہ نہیں ایک آئینہ تھا...... پچھتاوے کے ہاتھوں میں تھاما ہوا آئینہ...... جس میں صرف اس کے گناہ کی شکل نہیں، اقبال کے گناہ کا عکس بھی تھا۔

☆☆☆

ناولٹ

محبت جاگ جائے تو......

واعظہ کے لیے یہ انکشاف سوہانِ روح تھا کہ اس کا محبوب شوہر ماسی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے ان خواتین کے لیے لمحہ فکریہ جو بڑھتی عمر کے ساتھ اپنی توجہ شوہر سے کھو بیٹھتی ہیں۔

''یار کتنا انتظار کراتی ہو ایک بج رہا ہے رات کا۔'' اس کے کمرے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی منیر صاحب کا گلہ لبوں پہ آ گیا اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے شیشے سے ہی منیر صاحب کو جھانک کر دیکھا جو لیپ ٹاپ کھولے کوئی مووی دیکھنے میں مگن تھے اور مسکرا کر چھیڑتے ہوئے کہا، ویسے کیا خیال ہے جوں جوں آپ کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے آپ کی بیقراریوں میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ شدت نہیں آتی جا رہی ہے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا کیا میں بڈھا ہو گیا ہوں صرف نصف سینچری تو ہوئی ہے لیکن ابھی بھی اپنے عمر سے کہیں کم لگتا ہوں۔'' انہوں نے بدستور اسکرین پر نظریں گاڑے گاڑے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''بیگم بہت سے تو اس عمر میں پہلی شادی کرتے ہیں اور بہت سے دوسری۔'' انہوں نے تنبیہی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور متوقع جواب نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

''تو کرلیں آپ بھی دوسری شادی کون روک رہا ہے۔ گھر میں جوان بچے شادی کے لائق بیٹھے ہیں۔ یہاں ابا کے ارمان ہی ختم نہیں ہو رہے ہیں۔'' واعظہ نے پھر ان کی خواہش کو بچوں کی آڑ میں دبانے کی کوشش کی۔

انہوں نے اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر واعظہ کو خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''کس کتاب میں لکھا ہے کہ بچے بڑے ہو جائیں تو محبت کرنا جرم ہوتی ہے۔ ناجائز یا زبردستی تو تم سے کبھی کوئی فرمائش کی بھی نہیں۔'' ان کی نگاہوں کا مرکز اس کا چہرہ ہی تھا جو ہر گزرتے وقت کے ساتھ نکھرتا جا رہا تھا یا وہ والہانہ محبت تھی جو وہ اپنی بیگم کے علاوہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتے تھے۔

وہ تھوڑی دیر جز بز سی کھڑی رہی پھر کوئی جواب دیے بغیر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنے اسمارٹ فون پر مصروف ہو گئی۔ شیزا کے لیے دو سوٹ آن لائن پسند کر کے آرڈر بھی کر دیے۔ اسکرین کو آگے

پیچھے اسکرول کر کے بیڈ شیٹس وغیرہ دیکھیں لیکن پسند نہیں آئیں۔ فیس بک پر فرینڈز ریکوئیٹس چیک کیں ایک دو کو ایڈ کر کے باقی کو ڈیلیٹ کر دیا۔ کمنٹس پڑھے دو تین پوسٹ لائک کیں پھر کروٹ لے کر لیٹ گئیں اور تھوڑی دیر میں ان کے نرم گرم خراٹوں کی آواز نے بتا دیا کہ وہ سو چکی ہیں۔ منیر صاحب نے کچھ دیر ان کی نظر التفات کا انتظار کیا پھر اسکرین پر نظریں جما کر ان سے غافل ہو گئے اس روزمرہ کے روٹین کی انہیں عادت ہو گئی تھی۔

''امی خالہ کے یہاں چلیں بہت دن ہو گئے ہیں فری سے ملے۔'' شیزا نے واعظہ بیگم کو مشورہ دیا جو گریجویشن کے بعد گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی تھی'' تم کو جانا ہے تو ارسلان کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے فرصت نہیں ہے، درزن کو تمہارے شادی کے کپڑے دیئے ہوئے وہ تو غنیمت ہے گھر کے قریب ہے اس کا تو چکر لگا کر دیکھ آتی ہوں ورنہ درزی کو دے کر انسان اپنے ہاتھ کٹوا کر بیٹھ جاتا ہے جیسا بھی سل گیا پہننا پڑے گا۔ شادی کے کپڑے ہیں آگے پیچھے کر دیئے تو روتی رہو گی۔'' اس نے سالن چڑھاتے ہوئے اسے جواب دیا'' ویسے بھی شام میں تمہارے بابا کو آفس سے آنے کے بعد چائے پانی تو دینا ہوتا ہے۔ تم جاؤ میں تمہارے بابا کے ساتھ رات میں آ جاؤں گی۔''

انہوں نے کھانا بنانے کے دوران ہی سارا پروگرام طے کر کے اسے مطمئن کر دیا اور وہ ارسلان کو اٹھانے اس کے کمرے کی طرف چل دی جس کا سورج گیارہ بج جانے کے باوجود طلوع نہیں ہوا تھا۔

شام میں منیر صاحب واعظہ بیگم کو تیار دیکھ کر کھل اٹھے۔ ''قسم سے بیگم آفس کی ساری تھکن کافور ہو گئی۔'' انہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ انہوں نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ٹی وی لاونج میں ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے گھر میں پھیلے سکوت پر معنی خیزی سے مسکرا کر پوچھا۔'' لگتا ہے میدان صاف ہے۔''

واعظہ بیگم پھر جھنجلا گئیں۔'' کیا ہے منیر صاحب آپ کے پاس اور کوئی موضوع نہیں بچا کیا؟ کپڑے تبدیل کر کے فریش ہو جائیں۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر آپا کی طرف چلیں گے بچے بھی دوپہر سے وہیں گئے ہوئے ہیں۔''

منیر صاحب نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا'' سب خیریت تو ہے نا۔''

''منیر سب بھول جاتے ہیں آپ۔'' اس نے مصنوعی خفگی کے ساتھ جواب دیا۔'' پرسوں زوبی باجی اور انوار بھائی وغیرہ تاریخ پکی کرنے کے لیے آئیں گے۔ آپا کو نہیں بلائیں گے کیا اور ہم نہیں تو کیا ہمارے بچے یہ دعوت دیں گے انہیں۔''

''اوہ!'' پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے منیر صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا'' ٹھیک ہے پھر میں فٹافٹ فریش ہوتا ہوں تم چائے کے ساتھ ایک دو سلائس بھی سیک کے لے آنا۔''

منیر صاحب کا طریقہ تھا کسی کے گھر جانے سے پہلے کچھ کھا پی کر نکلتے تا کہ اگر روکنے والے کو کھانے میں دیر ہو نہ اسے شرمندگی ہو اور نہ انہیں کوئی فکر ہو یہی اصول انہوں نے بچوں کو بھی سکھایا تھا اور اگر وقت پر مل جائے تو ہلکا پھلکا کھانا کھا بھی لیا جائے کہ میزبان کی دل آزاری نہ ہو۔ آپا کے گھر میں گھرے سناٹے نے ان کا استقبال کیا۔'' تمہیں یقین ہے کہ بچے خالہ کے گھر ہی آئے تھے۔'' منیر صاحب نے تشویش والے انداز میں بیگم سے پوچھا۔'' جی ہاں بلکہ انہوں نے پہنچنے کے بعد آپا سے میری بات بھی کرائی تھی۔'' ''اچھا'' گیلری عبور کر کے اندر کا دروازہ ناک کیا تو وجیہہ آپا نے پرتپاک استقبال کیا ''یہ باہر کا دروازہ کیوں کھلا ہے۔'' منیر صاحب نے تنقید کرتے ہوئے پوچھا'' کوئی چور اچکا بھی گھر میں گھس سکتا ہے۔''

''ارے شعیب سے میں نے کہا تھا کہ ابا نماز پڑھنے جارہے ہیں دروازہ بند کرلینا لیکن ان لوگوں کے اپنے مشاغل ختم ہوں تو بات سنیں'' انہوں نے برہم لہجے میں کہا۔ ''خیر تم لوگ تو اندر آؤ......'' منیر صاحب ڈرائنگ روم میں جاکر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے اور وہ آپا کے ساتھ کچن میں آگئیں ''بچے کہاں ہیں آپا'' اس نے تشویش سے پوچھا ''بھئی کمروں میں ہوں گے اپنے دیکھ لو جاکر۔''

اس نے فری کے کمرے کا دروازہ کھولا تو عجیب منظر تھا۔ فری اور شیزا لیپ ٹاپ پر مووی دیکھ رہی تھیں ایک کونے میں ارسلان اپنے اسمارٹ فون پر مصروف تھا اور دوسرے کونے میں شعیب اوندھا لیٹا ٹیبلٹ پر کوئی گانے سننا میں مصروف تھا۔

اس نے دھڑ سے دروازہ پورا کھول دیا شیزا اور فری دونوں ایک ساتھ چلائیں کیا ہے اندھیرا کرو روشنی میں اسکرین نظر نہیں آرہی ہے...... وہ سمجھیں کہ شاید ارسلان نے انہیں تنگ کرنے کے لیے دروازہ کھولا ہے۔

''اندھیرے کی بچیوں تم لوگوں کو انہی چیزوں کے ساتھ وقت گزارنا تھا تو گھر پر رہتے۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ آپس میں گفتگو کرنے یا کوئی ایکٹویٹی کی جگہ وہی لیپ ٹاپ، اسمارٹ فون، ٹیبلٹ تم لوگوں کی زندگی اس سے باہر نہیں نکلے گی کیا۔ جم جائیں گے ہاتھ پاؤں کچھ گھومو پھرو ایک دوسرے سے باتیں کرو'' اس کی آواز پر آپا بھی آگئیں ''ارے اس جنریشن کا یہی المیہ ہے۔'' اور چاروں بچوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا مسکرائے اور کمرے سے رفو چکر ہوگئے لیکن اپنے ساتھ سارا سامان بھی لے کر آگئے۔ اس نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر آپا نے اسے چپ کرادیا ''چھوڑو تھوڑی دیر کے لیے مل کر بیٹھتے ہیں جس طرح چاہیں وقت گزار لیں۔ تم بتاؤ کیسے چکر لگالیا۔''

''بس وہ شیزا کا بہت دل چاہ رہا تھا پھر مجھے بھی تم لوگوں کو پرسوں کے لیے انوائٹ کرنا تھا۔'' واعظہ نے مختصراً سب بتادیا۔ ''اچھا اچھا چلو انشاء اللہ پھر پرسوں ضرور ملاقات ہوگی آپا کے یہاں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

''ارے شیزا آج سورج کہاں سے طلوع ہوا ہے۔'' منیر صاحب کی آواز پر اسکارف باندھی شیزا بھاگ کر کمرے میں آئی۔ جہاں منیر صاحب شوخ نظروں سے واعظہ کو دیکھ رہے تھے۔ کیا ہوا ابو اس نے بات کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا ''کچھ نہیں اتنے دنوں بعد تمہاری ماں کو اپنے لیے اتنے اہتمام سے تیار ہوتے دیکھ رہا ہوں لگتا ہے تمہاری ماں کو بھی میرا کچھ کچھ خیال آنے لگا ہے۔'' انہوں نے شکوہ کناں انداز میں ایک آنکھ دباتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

اور حسب معمول واعظہ جو شیشے میں کھڑی لپ اسٹک لگا کر خود کو چیک کررہی تھی غصے میں تن من کرتی کمرے سے نکل گئی یہ کہتے ہوئے کہ شیزا کے ساتھ شاپنگ پر جارہی ہوں ہر وقت کی شوخیاں بھی اچھی نہیں لگتیں منیر صاحب بچے بڑے ہوگئے ہیں آپ بھی بڑے ہوجائیں۔ اور باپ بیٹی کی مشترکہ ہنسی کی آواز نے اسے مزید سلگا دیا۔

یہ بات نہیں کہ واعظہ اور منیر صاحب کے درمیان اختلافات تھے مگر کچھ وقت قیامت کی چال چل رہا تھا کہ ذرائع مواصلات نے اسکائپ کی صورت کوسوں میل کے فاصلے تو سمیٹ لیے تھے لیکن غیر محسوس طریقے سے مکینوں کے درمیان سمٹ نہ آنے والے صدیوں کی مسافتیں حائل کردی تھیں۔ کچھ بچوں کے جوان ہوجانے کے سبب واعظہ نے خود ہی منیر صاحب سے کافی احتیاط برتنا شروع کردی تھی۔

اسے بچوں کے سامنے منیر صاحب کا مذاق

میں چھیڑنا بھی برا محسوس ہوتا تھا۔ جانے آپ مرد لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے وہ منیر صاحب سے تنہائی میں یہی شکوہ کرتی اور منیر صاحب ان کی حد سے زیادہ محتاط طبیعت پر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتے تھے۔

منیر صاحب اور واعظہ کے دو ہی بچے تھے۔ شیزا کی بات پھوپھی زاد تیمور سے طے تھی ارسلان انجینئرنگ یونیورسٹی کے فرسٹ سمسٹر میں تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ منیر صاحب واعظہ سے بیحد محبت کرتے تھے حتیٰ کہ بیس سالہ رفاقت بھی اس کی چمک ماند نہیں کر سکی تھی یہ یقین تھا کہ اس کا منیر صاحب اس کے مرنے کے بعد بھی کسی کو اس کی جگہ کسی کو نہ دے سکیں گے یا عمر کا تقاضا کہ جذبات میں ٹھہراؤ آ جانے کے سبب اس کے ذہن و دل نے محبت کو بڑھتی عمر کی قید سنا دی تھی اور وہ گزرتے وقت کے ساتھ نہ صرف خود کو بلکہ منیر صاحب کو بھی بے توجہی کی نظر کر جاتی تھی۔ جبکہ منیر صاحب کا یہ عالم تھا کہ انہیں واعظہ کو دیکھے بغیر ابھی بھی قرار نہیں آتا تھا۔ زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ ان کی نصف بہتر اس محبت کو باسی کڑی کے ابال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی وہ شاید یہ بھول گئی تھی کہ کڑی جتنی باسی ہوتی ہے اتنی ہی مزیدار ہو جاتی ہے اور منیر صاحب اسے یہ بات سمجھانے سے قاصر تھے۔

اماں شادی کا ویسے ہی اتنا کام ہے اب کیا ہوگا شیزا نے پریشانی سے کہا۔ اس کی شادی سے پہلے ایک مشکل اور آ کھڑی ہوئی تھی کہ ماسی نے ان کے یہاں مزید کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اس نے دو تین دفعہ اصرار کیا۔ پیسے بڑھانے کا لالچ بھی دیا لیکن اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی اور گاؤں جانے کا بہانہ کر کے کام چھوڑ دیا اس نے بھی تم روٹھے ہم چھوٹے کے مصداق خود ہی سارا گھر سنبھال لیا مگر آنے جانے والوں کی آؤ بھگت شادی کی تیاریاں اور گھر کے کاموں نے اس کو ہلکان کر دیا۔ یہاں بھی منیر صاحب نے اسے اکیلے نہیں چھوڑا اور گھر اور باہر کے کاموں میں برابر اس کا ہاتھ بٹاتے رہے

نند اور دیور تو ہنسی مذاق میں اس کو سنا بھی دیتے کہ بھابھی کیا گھول کر پلایا ہے ہمارے بھیا کو۔ وہ اندر ہی اندر بلبلا کر رہ جاتیں اور سارا غصہ منیر صاحب پر نکالتیں کہ آپ ہر آئے گئے کے سامنے کام کرنا نہ شروع کر دیا کریں پورا دن گھر میں میں جھک ماروں اور تمغۂ حسن کارکردگی سب آپ کو پہنا دیتے ہیں ارے ان باتوں کی پرواہ کیوں کرتی ہو جانی، وہ جلتے ہیں تو جلنے دو۔ میں تو تمہارا دفاع کرتا ہوں نا۔ مجھ سے زیادہ نہ تمہیں کوئی جان سکتا ہے نہ چاہ سکتا ہے۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہونا چاہیے۔ تمہارا میاں تم پر بھروسہ کرتا ہے اور مطمئن ہے۔ ان کے سمجھانے پر وہ واقعی طمانیت بھرا سانس لیتیں۔ وہ لحہ لحہ منیر صاحب پہ بحیثیت باپ اور اپنے شوہر کے فخر محسوس کرتیں لیکن جہاں منیر صاحب سوالی بنتے وہیں وہ نگاہیں چرانے لگیں۔

شیزا کی شادی پر بھی اس سے زیادہ منیر صاحب دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ آخر بیٹیاں تو ہوتی ہیں باپ کی لاڈلی ہیں پھر وہ تو تھی بھی ایک ہی۔ اپنی دعاؤں میں رخصت کر کے جب گھر آئے تو گھر کاٹنے کو دوڑتا محسوس ہوا۔ منیر صاحب تو آفس میں مشغول ہو گئے اور اس نے گھر کی سمیٹا سمائی شروع کر دی اگرچہ گھر میں کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ شیزا کے ساتھ اس کی ہمت اور طاقت بھی رخصت ہو گئی ہے۔ اس نے آپا سے ماسی ڈھونڈنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اس سے اب صفائی نہیں ہوتی تھی۔ شادی کی تھکن بھی اتارے نہیں اتر رہی تھی۔ شیزا آ جاتی تو ایک دم محسوس ہوتا کہ توانائی آ گئی ہے لیکن اس کے جانے کے بعد پھر سوتے سوتے دن گزرتے۔ وہ اسکائپ پہ شیزا سے آن

لائن رہتیں یا اپنے اسمارٹ فون پر فیس بک پر مصروف ہو جاتی۔

سنو تھک گئی ہو گی چلو ہٹو تم جا کر آرام کرو میں کچن سمیٹ دیتا ہوں انہوں نے ان کے ہاتھ سے برتن لے کر رکھے اور کندھے سے پکڑ کر کچن سے باہر لانے لگے۔ منیر صاحب خاموشی سے ان کے پیچھے آ کے کھڑے ہو گئے کام میں منہمک اسے احساس بھی نہیں ہوا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ شیزا اور اس کے سسرال والوں کو رخصت کر کے آئی تھی۔ اس کے شادی کے کافی دنوں بعد آج واعظہ نے اس کی دعوت کی تھی کیونکہ ڈھنگ کی ماسی کا ابھی انتظام نہیں ہو سکا تھا اور دعوت کا چھوٹا موٹا کام تو ہوتا نہیں اس کی بہن وجیہہ آپا نے ایک دو ماسیوں کا ذکر تو کیا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ بیٹی کی سسرال کا معاملہ تھا آخر کب تک دعوت ٹالتیں۔ دیور، جیٹھ، نند اور آپا سب کو ہی بلایا تھا۔ اچھی بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا اس نے۔

وہ واقعی اتنی تھک چکی تھی کہ منیر صاحب کی ضد کے آگے مجبور ہو کر کچن سے نکل آئی تھی مگر منیر صاحب کو ساتھ لے کر کیونکہ دوران دعوت ساتھ کام کروانے پر برابر کہیں سے منیر صاحب کو ممنون حسین صاحب کا خطاب مل رہا تھا تو کہیں الو کی ڈنڈی گھمانے کا الزام اس پر لگایا جا رہا تھا۔ حالانکہ منیر صاحب نے ان کی بولتی کافی حد تک بند کرنے کی کوشش کی تھی کہ بھئی اگر تمہاری بیویاں بھی میری بیگم کی طرح تمہارے لیے ایک ٹانگ پر کھڑی رہتیں تو تم بھی ان کا دم بھرتے نظر آتے۔ مگر وہ سسرالیوں کے مذاق میں چھپے طنز کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اور خود بھی منیر صاحب کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی تھیں۔

”واعظہ اپنا بھی کچھ خیال کر لیا کرو میری خاطر نہ سہی بچوں کے خاطر سہی۔“ منیر صاحب نے ان کے تھکن زدہ چہرے کو دیکھ کر محبت و ہمدردی سے کہا وہ ہلکی سی مسکراہٹ دے کر کمرے میں آ کر لیٹ گئیں اور جب تک منیر صاحب آئے وہ سو چکی تھیں۔

گھر کے کاموں کے چکر میں وہ خود سے کچھ زیادہ ہی غافل ہوتی جا رہی تھیں۔

اس دن بھی ارسلان نے انہیں چار کپ چائے بنانے کو کہا اس کے دوست آئے ہوئے تھے۔ وہ محبت میں چائے دیتے خود ڈرائنگ روم پہنچ گئیں اس کے ساتھ ہی پیچھے سے ارسلان باہر آ گیا ایاں مجھے آواز دے لیتیں اندر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے الجھے لہجے کے ساتھ گلہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں ابھی تک اس کے دوپٹے کے پھٹے ہوئے پلو پر اٹکی ہوئی تھیں جو دروازے کی نیٹ میں اٹک کر پھٹ گیا تھا۔ اس نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا ارے بیٹا اب اس میں میرا کیا قصور۔ دنیا سے نرالی تھوڑی کوئی بات ہوئی ہے اور وہ ان سے الجھے بغیر واپس چلا گیا کہ وہ الٹا دلائل دے کر اسے غلط ثابت کر دیں گی۔ مگر آئندہ کسی دوست کو گھر لانے کی غلطی نہیں کی۔

”امی ذرا اپنا بھی خیال رکھا کریں کیا حال بنا رکھا ہے۔“ شیزا سے ماں کے سفید جھاگ ہوتے بالوں کو دیکھ کر رہا نہیں گیا تو بے ساختہ کہہ بیٹھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے کچھ دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ پھوپھی کو دیکھیں صبح اٹھتے ہی تک سک سے مجھ سے کہیں زیادہ بجی سنوری تیار بیٹھی ہوتی ہیں اور مجھے بھی تیمور کے آنے سے پہلے حال حلیہ ٹھیک کر لینے کا حکم ہے لیکن یہاں تو آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے شام غریباں منا رہی ہیں۔ میرے جانے کے بعد تو آپ اور زیادہ خود سے لاپرواہ ہو گئی ہیں

واعظہ بیگم بیٹی کے اتنے بڑے لیکچر پر چراغ پا ہو گئیں۔ تیز آواز سے گویا ہوئیں ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ اپنی شادی کے بعد تم بھی کافی بد لحاظ

ہوگئی ہو اور جہاں تک تمہاری ساس کا تعلق ہے تو میری نند ہونا اپنی جگہ لیکن مجھے دونوں میاں بیوی ہمیشہ ایک نمبر کے چھچھورے لگے۔ نہ بڑے چھوٹے کا ادب لحاظ نہ آئے گئے کی تمیز اور نہ ہی اپنی عمر اور رتبے کا پاس۔ لو بھلا بتاؤ یہ کوئی عمر ہے فیشن کرنے کی اسے شیزا کے موازنہ کرنے پر واقعی طنطنے لگ گئے۔

وہ ویسے ہی ساری زندگی نند کی شیخی خوری کی عادت سے خائف رہی تھی۔ تمہارے پھوپھا دراصل سدا کے دل پھینک رہے ہیں اس لیے تمہاری ساس کو خطرہ لگا رہتا ہے۔ ان کا پارہ چڑھا تو سب لحاظ اور رشتے داری بھول گئیں۔

ان کا پارہ چڑھتے دیکھ کر شیزا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا امی ابھی ارسلان کی شادی بھی کرنی ہے اور پھر آپ کی عمر کو کیا ہوا ہے۔ آپ نے کچھ زیادہ ہی اپنے اوپر بڑھاپا سوار کرلیا ہے خود کہتی ہیں کہ لڑکے لڑکی سے زیادہ ان کے ماں باپ کا رہن سہن دیکھا جاتا ہے اور......

اچھا اچھا زیادہ میرا دماغ مت کھاؤ نہ میری ماں بننے کی کوشش کرو۔ اس نے شیزا کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور اسے سردیوں کی دھوپ سینکتا چھوڑ کر مٹر پلاؤ پکانے اٹھ گئیں کام کے دوران بھی ان کی بڑبڑاہٹ کی آواز شیزا کے کانوں میں آرہی تھی۔

''کام کاج ایک طرف رکھ دو خود سج سنور کر بیٹھ جاؤں جیسے ابا نے گھر میں نوکروں کی فوج تعینات کررکھی ہے۔ کچھ نہ کرنے پر سسرال والوں کی باتیں اب تک سننے کو مل جاتی ہیں کہ کیا گھول کر پلا رکھا ہے۔ سجنے سنورنے لگی تو کہہ دیں گے کالا جادو کروادیا ہے۔'' انہوں نے نخوت سے منہ بنایا اور کیبنٹ سے چاول کے لیے بگونہ نکالنے لگیں۔

شیزا نے سسرال والوں کی شامت آتی دیکھی تو مسکرا کر موضوع بدل دیا اور آواز لگائی۔ امی کسی ماسی کا انتظام ہوا یا نہیں۔

''نہیں بیٹا دیکھو آج آپا نے ایک ماسی کو بھیجنے کا کہا تو ہے آجائے تو بات ہے۔'' انہوں نے لہجے میں محبت اور نرمی سموتے ہوئے جواب دیا۔

منیر صاحب کمرے میں دوران مطالعہ دونوں ماں بیٹی کی گفتگو سن رہے تھے ہلکی سی لپ اسٹک اور تیار رہنے کی خواہش کا اظہار تو وہ بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے بقول ان کے عورت کا سجنا سنورنا مذہباً جائز ہی اس کے شوہر کے لیے ہے۔ تم دعوت میں اور بازار جاتے وقت تو تیار ہو بھی جاتی ہو مگر گھر میں جھاڑ منہ پہاڑ پھرتی ہو اور وہ دلیل دیتیں کہ اگر بے تکے حلیے میں باہر نکلی تو بھی سب آپ کو ہی برا بھلا کہیں گے کہ بیوی کا خیال نہیں رکھتا میرا کیا ہے ورنہ تو مذہب نے سادگی کی تعلیم دی ہے اور غصہ میں ان کو خاموش کراتے ہوئے وہ کہتے کہ مذہب کا بیچا اور صرف اپنے مفاد کے لیے سہارا نہ لیا کرو۔ مذہب نے سادہ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ پردے کا حکم بھی دیا ہے۔ اشتہار بننے کا نہیں اور وہ چپ ہوتے ہوتے بھی یہ جملہ ضرور کہتیں کہ پردہ صرف عورت کے لیے ہی نہیں ہے مرد کے لیے بھی ہے اور وہ دلائل ہونے کے باوجود تلخ ماحول سے بچنے کے لیے خاموش ہوجاتے۔ مگر اس وقت ان کو ان کی اس سوچ پر افسوس ہورہا تھا انہیں شدید دکھ ہورہا تھا کہ واعظہ بیگم کو اپنے بچوں کے احساس شرمندگی سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے وہ اس ماحول سے بچنے کے لیے گھر سے باہر جانے کا سوچ کر نکلے تو شیزا کی آواز دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز ایک ساتھ سنائی دی۔

''ابو باہر جارہے ہیں تو مجھے گڑ کی پاپڑی لادیجیے گا۔'' یہ اس کی سردیوں کا پسندیدہ میٹھا تھا ''ارے میرا بیٹا اگر میں باہر نہیں بھی جاتا تو کیا ایسا ہوسکتا تھا کہ میری بیٹی مجھ سے فرمائش کرے اور میں

پوری نہ کروں۔'' انہوں نے محبت پاش لہجے میں اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ شادی کے بعد تو بیٹیاں اور بھی عزیز ہو جاتی ہیں کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے جگر گوشوں کو خود سے دور کر دینا ان کے اندر شیزا کے لیے محبتوں کا سمندر ہر وقت ہی ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا خاص طور پر جب وہ تیمور کے ساتھ واپس جا رہی ہوتی تو سمندر کی موجیں ان کی آنکھوں کے ساحل کو چھوئے بغیر نہیں چھوڑتی تھیں۔

انہوں نے شیزا کو محبت سے دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

''السلام علیکم جی!'' ایک مدھر نسوانی آواز نے انہیں پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں اترتی چمک کچن سے نکلتی واعظہ بیگم کے دل کو خاکستر کر گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے منیر صاحب کا وہاں نشان بھی نظر نہیں آیا۔

واعظہ نے اوپر سے نیچے تک اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ وہ جو بھی تھی بڑی فرصت سے بنائی گئی تھی۔ ستواں ناک، زندگی سے بھرپور شوخ آنکھیں، تراشیدہ کمان ابرو، سر پر اسکارف کی صورت لپٹا ہوا سوٹ سے ہم آہنگ دوپٹہ، وہ متاثر ہو چکی تھیں لیکن بدستور سوالیہ انداز قائم رہا ''جی آپ کون؟''۔ آخر اسے زبان کا سہارا لینا ہی پڑا۔

''وجیہہ باجی نے بھیجا ہے کہہ رہی تھیں کہ آپ کو ماسی کی ضرورت ہے؟'' اس نے واعظہ کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھے بغیر لٹھ مار انداز میں پوچھا لہجے کے پھکوپن سے جیسے وہ ہوش میں آ گئی۔

''ہاں ہاں آؤ اندر آ جاؤ۔''

پہلی ہی نظر میں جو احساس شرمندگی اپنے حلیے کے حوالے سے ان کے اندر جاگا تھا ماسی کا سن کر اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اپنے ترنگے حلیے کو نظر انداز کر کے عجیب رقیبانہ انداز سے پوچھا ''شادی شدہ ہو۔''

''آہو جی پر بچہ کوئی نہیں۔ رب دی مرضی۔''

کافی باتونی لگ رہی تھی۔ انہوں نے اس کی رام کہانی کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور پیسے وغیرہ کام کے طے کر کے مطمئن ہو گئیں۔ شادی شدہ بھی تھی اور صاف ستھری بھی، انہیں ایسی ہی ماسی چاہیے تھی۔

یہ بھی اطمینان تھا کہ دس گیارہ بجے تک آئے گی کم از کم منیر صاحب تو آفس جا ہی چکے ہوں گے ورنہ وہ ضرور اس کا موازنہ ماسی سے کر کے دماغ خراب کرتے۔

ماسی کے آ جانے سے جہاں اس کو کام کی طرف سے فراغت ملی وہاں اس نے اس بات کا بھی خیال رکھنا شروع کر دیا کہ ماسی کی نسبت خود ڈھنگ کے حلیے میں نظر آئے کم از کم ماسی اور مالکن کا فرق تو واضح ہو۔ وہ منیر صاحب کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

شیزا کے گھر آنے والے ننھے مہمان کی تیاریاں بھی شروع کرنی تھیں ویسے تو ہر شے ہی ریڈیمیڈ دوکانوں پر موجود تھی لیکن خریداری کے لیے گھر سے نکلنا بھی ضروری تھا اکیلے وہ جاتی نہیں تھی اس لیے منیر صاحب سے آفس کی چھٹیاں لینے کے لیے کہہ دیا وہ بھی بخوشی راضی ہو گئے۔

''باجی جی وہ آپ کے شوہر بہت اسمارٹ ہیں آپ بھی تیار شیار رہا کرو نا جی! جوڑی چنگی لگے گی۔'' ناظمہ نے کچن میں برتن دھوتے ہوئے جھانک کر ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ بیٹھے منیر صاحب کو دیکھ کر بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے کھانا پکاتی واعظہ سے بے تکلفی سے کہا۔ آج منیر صاحب کی چھٹی کا پہلا دن تھا اور وہ حسب عادت ناشتے کے بعد اخبار پڑھنے میں محو تھے۔ واعظہ نے بدقت ناگوار تاثرات کو چھپا کر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے مشورے کا خیر مقدم کیا اور جواب دیے بغیر کام

سے فارغ ہو کر کچن سے باہر آ گئیں۔
منیر صاحب کے پیچھے سے گزر کر کمرے میں جاتے ہوئے ان کی نظر بے اختیار کچن کی طرف اٹھ گئی۔ ناظمہ وہاں سے برتن دھوتی صاف نظر آ رہی تھی۔ فٹنگ کے کپڑوں میں بھرا بھرا جسم اور کمر پر لشکارے مارتا چٹیلا جو اس کی ہر حرکت کے ساتھ دائیں بائیں جھولتا نجانے ان کے ذہن میں کیا آیا منیر صاحب کو کمرے میں جا کر اخبار پڑھنے کا مشورہ دینے لگیں۔
انہوں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھ کر کہا ''خیریت تم کو پتا نہیں ہے کہ میں روز یہیں روشنی میں بیٹھ کر اخبار پڑھتا ہوں'' وہ گومگوں کی کیفیت میں اندر تو چلی گئیں لیکن کچھ دیر بعد ہی کچن میں آ کر اس وقت تک نادیدہ کام میں مصروف رہیں جب تک کہ ناظمہ کچن سے فارغ ہو کر واشنگ ایریے کی طرف نہیں چلی گئی۔
دوسرے دن بھی منیر صاحب وہیں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ارسلان یونیورسٹی جا چکا تھا وہ ان کے پاس شاپنگ پہ جانے کا پروگرام طے کرنے بیٹھ گئی۔ وہ بدستور منہ کے آگے اخبار کیے ہوں ہاں میں جواب دیتے رہے۔
اس نے جل کر ان کا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے کہا ''منیر صاحب میں آپ سے مخاطب ہوں در و دیوار سے باتیں نہیں کر رہی ہوں۔'' انہوں نے اخبار تہہ کر کے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''زہے نصیب میں سمجھا تم ناظمہ سے بات کر رہی ہو'' اور ناظمہ کھل کھل ہنستی ہوئی کپڑے دھونے چلی گئی۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے زہر خند انداز میں کہا۔
''میں نوکروں کے منہ نہیں لگتی منیر......''
''اچھا......'' انہوں نے اچھا کو کھینچتے ہوئے معنی خیز انداز سے ان کو دیکھا اور کہنے لگے نہیں ''یار اچھی خاصی صاف ستھری خاندانی عورت لگتی ہے۔ پتا نہیں کیا مجبوری ہوگی بے چاری کے ساتھ۔''
واعظہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ منیر صاحب نے تو کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔ کتنی ہی ماسیاں آئیں اور چلی گئیں لیکن وہ یہ حقیقت فراموش کر گئی تھی کہ ناظمہ جیسی نسوانیت سے بھرپور ماسی سے واسطہ اس سے پہلے کبھی ان کو پڑا بھی نہیں تھا۔ اس کے منہ سے بدقت نکلا ''آپ نے کب اس سے تفصیلات حاصل کر لیں۔''
''ارے وہ کل شیزا سے باتیں کر رہی تھی باہر صحن میں تو کان میں بات پڑ گئی ورنہ تم مجھے کیا اب اتنا گرا ہوا بھی سمجھنے لگیں کہ کام والیوں کی ٹوہ لیتا پھروں۔'' انہوں نے خفگی سے دیکھا تو اس کا سینے میں اٹکا ہوا سانس بحال ہوا۔
''خیر میں یہاں ناظمہ کو نہیں شاپنگ کو ڈسکس کرنے بیٹھی تھی۔'' انہوں نے بظاہر پرسکون لیکن تپے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''اوہ سوری جانِ منیر!'' اکیلے میں وہ اسے اسی طرح محبتوں سے پکارتے تھے لیکن وہ کبھی ان الفاظ کو اہمیت نہیں دیتی تھی بلکہ الٹا عامیانہ اظہار محبت کہہ کر انہیں چپ کرا دیتی تھی مگر اس وقت نجانے کیوں منیر صاحب کا توجہ دینا اسے اچھا لگا۔
اسے کاندھوں سے پکڑ کر منیر صاحب نے خیالوں کی دنیا سے نکالا تو وہ چونک گئی۔
''یار تمہاری طبیعت کچھ بہتر نہیں لگ رہی ہے اور مجھے بھی آج تھوڑا کام ہے ہم انشاءاللہ کل یا پرسوں چلیں گے۔ پورے مہینے بھر کی چھٹیاں ہیں میرے پاس فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اور اس کا جواب سنے بغیر وہ باہر نکلتے چلے گئے۔
وہ جو اس وقت اپنے اندر پیدا ہو جانے والے خدشات کی تشفی کے لیے منیر کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی ان سے اپنے پاس بیٹھے رہنے کی

خواہش کا اظہار بھی نہ کر سکی کہ وہ تو خود منیر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانے کو بے وقت چونچلے کہہ کر ٹال دیتی تھی۔

وہ اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کر بے خیالی میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سوچا واقعی وقت کی گرد نے اس کے حسن کو اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا اس نے خود کو کر رکھا تھا۔ بالوں میں اترتے چاندی کے تاروں نے اس کی شخصیت میں واقعی وقار تو پیدا کر دیا تھا مگر بالوں کو سمیٹ کر الجھا سا جوڑا ہمہ وقت اس کے سر پر دھرا رہتا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے آئندہ وقت کی فکریں نکال کر محبت کے رنگ بھر دیئے جائیں تو اس عمر میں بھی وہ کسی کے بھی دل کا قرار لوٹ لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ چہرے سے ناگوار تاثرات ہٹا دیے جائیں تو جان لیوا مسکراہٹ ابھی بھی بیسیوں لوگوں کو قتل کر سکتی تھی اسکن ابھی بھی اتنی فریش تھی کہ فیشل یا ایکسٹرا انٹرٹینمنٹ کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔ پینتالیس سال اب ایسی کوئی زیادہ عمر بھی نہیں۔ اس نے سوچا۔

آج اتنے عرصے بعد خود کو دیکھا تو آئینے نے اس کی ساری کوتاہیاں اس پر عیاں کر دیں۔ محبت جسے وہ ایک خاص عمر کا تقاضہ سمجھتی تھی اسے ایک دم ایک بہت بڑی ضرورت میں ڈھلتی نظر آئی

وہ رات جلدی کمرے میں آ گئی لیکن منیر صاحب سو چکے تھے اسے حیرت بھی ہوئی ورنہ وہ اس کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی جب چھٹی حس بیدار ہو کر خطرے کا الارم بجا دے تو آنکھیں سو نہیں پاتیں۔ اس نے پاس رکھے دو دن کے اخبار اٹھا کر ان کی ورق گردانی کرنی شروع کر دی کچھ صفحات درمیان سے پھٹے ہوئے تھے جسم اور ذہن دونوں تھکے ہوئے تھے وہ ان پر غور کیے بغیر نجانے کب سو گئی۔

اگلے دن پھر منیر صاحب اخبار میں گم تھے۔ ناظمہ برتن دھو کر صفائی کرنے چلی گئی تھی۔ اس نے کچن میں سے ہی منیر صاحب کو مخاطب کر کے کہا میں کام سے فارغ ہو جاؤں تو آج چل کر کچھ شاپنگ کر لیں روز آج کل پر ٹل رہا ہے۔ منیر صاحب نے انہیں دیکھے بغیر رضا مندی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا پھر تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر باہر کسی کام سے چلے گئے۔ وہ بھی کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔ اچانک اسے ارسلان کی جینز کا خیال آیا اس نے دھلوانے کو کہا تھا وہ اس کی پینٹ لے کر جلدی سے واشنگ ایریے کی طرف آئی کہ کہیں ناظمہ کپڑے دھو کر فارغ نہ ہو گئی ہو ویسے ہی واشنگ ایریا رہائشی حصے سے باہر گیلری بنا کر پیچھے کی طرف تھا وہ آواز بھی دیتی تو اس تک نہ جاتی لیکن گیلری کے قریب پہنچ کر منیر صاحب کی آنے والی آواز نے اس کے ذہن اور قدم دونوں منجمد کر دیے۔

''ارے تم تو اتنی حسین ہو کہ کوئی بھی بہک سکتا ہے۔ میں کیا چیز ہوں بس یونہی کبھی کمرے میں کبھی یہاں مجھے وقت دیتی رہو تو میرا تو اسی میں کام ہو جائے گا۔''

''اگر بیگم صاحبہ نے دیکھ لیا تو......'' ناظمہ کی گھبرائی ہوئی آواز تھی۔

''ارے اسے اپنا ہوش نہیں اسے کیا پتا چلنا ہے شہزادی۔'' منیر صاحب کی آواز بہکے جا رہی تھی۔

واعظہ گرتے گرتے بچی۔ گیلری کی دیوار کا سہارا لیا جس کی اوٹ سے منیر اور ان کے پیچھے ناظمہ کا گریزاں اور آدھا سا وجود اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ بمشکل خود کو گھسیٹ کر کمرے تک لائی۔ اس کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین اور ہاتھوں سے منیر صاحب ایک ساتھ نکلتے محسوس ہوئے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ منیر صاحب اور ناظمہ کا سامنا ہو

اس خیال سے نہیں کہ منیر صاحب دل پھینک تھے بلکہ اس سبب کہ وہ اس کے حلیے کو تنقید کا نشانہ بناتے لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدل گیا تھا ان کا کہا ہوا بڑا بول ان کے سامنے آ گیا تھا۔

وہ تو کسی سے کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں تھی کہ منیر صاحب کو تو خود دور کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لہو صورت گرم گرم سیال تکیے میں خاموشی سے جذب ہوتا رہا۔

شام کو شاپنگ بھی طوعاً و کرہاً ہو سکی۔ دل و دماغ دونوں ہی جگہ پر نہیں تھے۔

ناظمہ دو دن سے نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ ارسلان کا کمرہ سمیٹ کر کچن میں آئی تو منیر صاحب کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔ ”خیریت یہ آج کل ناظمہ نظر نہیں آ رہی ہے۔“ ان کی آواز میں چھپی بیقراری ان کے دل کا قرار لوٹ لینے کے لیے کافی تھی۔

”کیوں اس سے کیا کام آ گیا آپ کو“ اس نے اپنے لہجے کو نارمل ہی رکھا۔ نہیں بس ”تم کام کر رہی ہو اس لیے فکر ہو رہی تھی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

”مجھے بتا کر چھٹی نہیں کی ورنہ وجہ بتا دیتی۔“ اس سے زیادہ کوئی جملہ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو سکا مگر دل نے ضرور کہا دوغلہ انسان۔

شام میں شیزا کو فون کیا۔ بس خیر خیریت لے کر فون رکھ دیا ایک بے کلی تھی جو ختم نہیں ہو رہی تھی۔

منیر صاحب ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ”امی چائے ملے گی۔“ ارسلان نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تو اسے یاد آیا کہ وہ شام کی چائے بنانا بھول گئی ہے اور حیرت منیر صاحب پر بھی ہوئی ورنہ انہیں تو ہر آدھے گھنٹے بعد چائے کا کپ چاہیے ہوتا ہے وہ ان لوگوں کو چائے دے کر خود صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ ناریل کے درخت سے جھانکتا آخر مہینے کے الوداعی چاند کا بے نور چہرہ شام کے سائے گہرے ہونے کے ساتھ ساتھ روشن ہوتا جا رہا تھا مگر باہر بچوں کے کھیلنے کی آوازیں اس کے دل کی طرح ڈوبی ہوئی لگ رہی تھیں۔ سب منظر سب آوازیں لگتا تھا اپنی دلکشی اور تاثر کھو چکے ہیں۔ اپنی ذات کا احتساب کرنا اس کے لیے اذیت ناک عمل تھا۔

مغرب کی اذان پر اس نے غور کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ رب سے معافی بھی مانگتی رہی پھر وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

رات کام سے فراغت کے بعد اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ اندر سے منیر صاحب کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی سے بات کر رہے تھے۔

”اس کو چھوڑو تم بتاؤ کیوں نہیں آ رہی ہو؟“ دوسری طرف سے کیا جواب ملا اس کا تو پتہ نہیں چلا لیکن وہ گلہ کر رہے تھے کہ میری تو چھٹیاں ختم ہو جائیں گی تمہارے بغیر گزارہ مشکل ہے یار۔ دوسری طرف سے پھر کچھ پوچھا گیا تھا جس پر انہوں نے ہنس کر جواب دیا ”پلکوں کی نہیں اخبار کی چلمن کہو مگر کل ضرور آنا ورنہ تمہارے گھر تک رسائی ہے میری اور تمہارے شوہر کو بھی خرید سکتا ہوں۔ کسی بھی رات شب خون مار دوں گا فکر نہ کرو۔“

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منیر کی آواز آئی ”ارے یار پیسے کا کھیل ہے دو لوگوں کی ضرورت ہوگی گواہی کے لیے وہ میں انتظام کر لوں گا۔ بس تم اپنی بات پر قائم رہنا۔“ دوسری طرف سے کیا جواب ملا تھا کہ منیر صاحب نے تھوڑی دیر بعد پھر تمسخرانہ انداز میں کہا ”اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی بعد میں پتا چل جائے تو خیر ہے۔“

منیر صاحب کے بلند قہقہے کے ساتھ اللہ حافظ کی آواز نے اس کو خوش فہمی کی بلندیوں سے تلخ حقیقت کی پستیوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اب وہ

اتنی ناسمجھ تو نہیں تھی کہ اسے پتا نہ چلتا کہ وہ کس سے اور کیا گفتگو کررہے ہیں۔ منیر کی بے وفائی پہ دل یقین کرنے کا نہیں چاہ رہا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنا بھی گر سکتے ہیں۔ وہ خود کو بمشکل کنٹرول کر کے اندر آگئی۔ منیر صاحب لیپ ٹاپ پر موؤی دیکھنے میں محو تھے۔ اس نے غور کیا کوئی رومانٹک گانا تھا تمام حدود وقیود سے آزاد۔ آہٹ پر مڑ کر دیکھا اور حیرت سے کہنے لگے ''ارے آج کیسے اتنی جلدی فرصت مل گئی آپ کو گھر کے جھمیلوں سے۔'' پتا نہیں مذاق تھا یا طنز وہ سمجھنے کے قابل نہیں تھی۔ لیکن اعتراض ضرور کیا کوئی ڈھنگ کی موؤی نہیں دیکھ سکتے آپ۔ گناہ خود کریں یا دیکھیں برا ہی ہوتا ہے۔

''اچھا بڑی جلدی خیال آ گیا۔'' منیر صاحب نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''میں تو کافی عرصے سے اس سے ہی دل بہلاتا ہوں، آج سے پہلے تو منع نہیں کیا۔'' اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ کس طرح ان کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے معافی مانگے۔ اس کی خاموشی پر انہوں نے اسکرین پر دوبارہ نظریں جماتے ہوئے چبھتے لہجے میں پوچھا ''کیا تمہارا سیل فون خراب ہوگیا یا پیکج ختم ہوگیا ہے۔'' پھر لیپ ٹاپ بند کر کے رکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے ''لگتا ہے تمہیں نیند نہیں آرہی ہے لیکن مجھے بہت آرہی ہے۔'' اور اسے دیکھے بغیر کروٹ لے کر سو گئے۔

روزمرہ کی طرح نہ کوئی ذومعنی جملہ اچھالا، نہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی بیقراریوں کا اظہار کیا۔ تین چار دنوں کی یہ تبدیلی آج اسے شدت سے محسوس ہوئی۔

اگلے دن جب وہ منیر صاحب کے ساتھ مارکیٹ گئی تو شیزا کے لیے کی گئی شاپنگ کے ساتھ ساتھ ایک عدد ہیر کلر، دو تین گہرے لپ اسٹک کے شیڈز اور نئے ڈیزائن کے سوٹ بھی اپنے لیے خرید لیے۔ اب عمر وہ منیر صاحب کو کھو دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گھر آ کر وجیہہ آپا کو فون کیا کہ ماسی کے نہ آنے کی وجہ معلوم ہو تو پتا چلا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دو دن مزید نہیں آئے گی۔

اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور وہ دل ہی دل میں دعا کی کہ کبھی نہ آئے لیکن آپا کے اگلے جملے نے اس کے پورے جسم میں جیسے آگ سی بھر دی وہ کہہ رہی تھیں کہ دو سال بعد اللہ نے اسے اولاد کی خوشخبری سنائی ہے۔ دیکھو وہ آگے کام بھی کر سکے یا نہیں۔ مطلب بات نکاح سے بھی زیادہ آگے تک بڑھ گئی۔ اپنی نظروں میں خود گر جانے کا صدمہ لے کر وہ بستر پر ڈھے سی گئی۔

صبح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے گڑگڑا کر اپنے رب سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ علاوہ اس کے کوئی نجات کی راہ نہیں نکال سکتا تھا۔ شیزا سے بھی ملے کافی دن گزر چکے تھے۔ وہ اپنے ہی چکروں میں مبتلا ہوگئی تھی اس کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آرہا تھا اور شاید وہ دعا کرتے کرتے سو گئی تھی۔

منیر صاحب ناشتے کے لیے آئے خاموشی دیکھ کر کچن میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ آہٹ پر پلٹ کر پیچھے دیکھا تو اسے تیار دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''خیریت صبح ہی صبح کہاں جانے کی تیاری ہے۔'' اس کی خوش فہمی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ''جی ہاں شیزا کی طرف جانے کا سوچا ہے۔'' اس نے بات بنائی۔

''ناظمہ آج بھی کام پر نہیں آئی؟'' منیر صاحب نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا اس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''ہاں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اچھا......'' منیر صاحب گہری سوچ میں غرق ہوگئے۔ اس کا خود کو نظرانداز کیے جانا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ منیر صاحب نے اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''کوئی کام ہے ماسی سے؟'' اس نے ناظمہ کے منصب کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں اپنے تئیں ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ جواب دیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد منیر صاحب تیار ہو کر باہر جاتے نظر آئے اس نے پوچھا بھی کہ ناشتہ کیے بغیر کہاں جارہے ہیں آپ؟

''آفس!'' مختصر سا جواب دے کر وہ واعظہ کو اسی طرح تشنہ چھوڑ گئے جتنا متعدد بار اپنی مصروفیت کے بہانوں سے وہ انہیں چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔

اس کے لیے تو یہ ہی مر جانے کا مقام تھا کہ منیر صاحب اس کا مقام و مرتبہ کسی اور کو دینے کا سوچیں کجا وہ بھی ایک کام والی ماسی کو دل کی دنیا کے لٹنے کے ملال سے زیادہ یہ احساس شرمندگی دامن گیر تھا کہ بیٹی کی سسرال میں کیا عزت رہ جائے گی دنیا والے اس کے لیے کتنی باتیں بنائیں گے وہ سب کو کیا صورت دکھائے گی وہ وہیں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ بات بے بات آنکھیں نم ہوئے جارہی تھیں۔

''امی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'' آنکھوں پر ہاتھ رکھے کمرے میں لیٹا دیکھ کر ارسلان نے تشویش سے پوچھا۔

اس کا دل بھر آیا لیکن وہ منیر سے بات کیے بغیر کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔

''ہاں بس تھکن محسوس ہو رہی ہے۔'' پھر بات کا رخ پلٹ کر اس سے پوچھنے لگیں ''تم نے ناشتہ کرلیا یا دوں؟''

''آپ آرام کریں میں خود دیکھ لیتا ہوں۔'' ارسلان نے انہیں کاندھوں سے پکڑ کر پھر لٹا دیا اور کمرے سے چلا گیا۔

اگزام ہونے والے تھے وہ زیادہ تر گھر پر ہی ہوتا تھا۔ ناشتہ کھانے کے وقت ہی ہوتا تھا اس کا۔

شام تک طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو وہ چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ منیر بھی آچکے تھے وہ چائے بنا کر لاؤنج میں ہی لے آئی۔ لیکن ارسلان کی زبان سے ناظمہ کا نام سن کر اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ ''ان کو تو شک نہیں ہوا؟'' یہ ارسلان کی آواز تھی۔

''نہیں، لیکن تمہارا اور شیزا کا ساتھ چاہیے۔'' منیر صاحب کی آواز آئی۔ ''مگر ابا! لوگ کیا کہیں گے۔'' ارسلان پریشانی کے عالم میں منیر صاحب سے مخاطب تھا۔ ''بیٹا مجھے لوگوں سے کوئی مطلب نہیں کہ کون کیا سمجھتا ہے یا سوچتا ہے لیکن تمہاری امی کے ساتھ اس حالت میں اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔''

وہ الٹے قدموں کچن میں آئی اور ارسلان کو آواز دے کر چائے لے جانے کو کہا اور خود کمرے میں آکر لیٹ گئی بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ ایک جست میں اس کی وفاداریوں کو رولتے کسی اور طرف رجوع کرلیں اسے قطعاً اس بات کی امید نہ تھی لیکن اتنا حق تو تھا کہ ان سے باز پرس کرتی اتنے آرام سے تو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے رات کو ان سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور عصر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی۔ سلام پھیر کر فارغ ہوئی تو دیکھا منیر صاحب کہیں جانے کی تیاری کررہے ہیں۔ اس وقت کہاں جارہے ہیں؟

''کیوں کوئی کام ہے؟'' سوال کا جواب سوال سے دے کر اسے دیکھا جو انہی کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں بس آپ ابھی تو آئے تھے اس لیے'' اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ورنہ وہ کافی عرصے سے ان کے ہر قسم کے معمولات سے بے خبری رہنے لگی تھی۔

''اس توجہ کا شکریہ آفس سے فون آیا ہے اس لیے جارہا ہوں۔'' وہ ہلکا سا طنز کر کے اسے گم صم چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔ رات وہ گھر نہیں آئے تو

آپ نے دن کو رات کہا رات سمجھا رات کو دن کہا دن سمجھا۔'' اس کی آواز اس کے لفظوں اور جذبوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ ''اس عمر میں یہ خطا ہوگئی کہ آپ کی محبتوں کا جواب آپ کے انداز میں نہ دے سکی تو آپ نے اس کی اتنی بڑی سزا دے دی۔''

''کیسی سزا؟ بھئی'' انہوں نے پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ اس نے خود کو کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا ''پھر ناظمہ کا کیا چکر ہے۔ آپ جو اس کے ساتھ مل کر کھیل کھیل رہے ہیں کیا مجھے پتا نہیں چلے گا۔'' منیر صاحب نے اسے بغور دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں جواب دیا۔

''حیرت ہے تم ہی نے تو کہا تھا کہ گناہ کرنا اور دیکھنا برابر ہے۔ میں تو کافی عرصے سے نیٹ پر بھی بہت کچھ دیکھتا تھا۔ تم نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔ تو اب اس کو عملی طور پر کرنے میں تم کیوں پریشان ہو۔ سزا تو مجھے ملنی ہے ہر صورت۔ تم کو پہلے بھی اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا تو اب بھی لاپرواہ رہو لیکن اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ میں کوئی گناہ کر رہا ہوں اب مجھے صاف راستہ نظر آ گیا ہے اتنا تو تم کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔''

''جی ہاں اور اس بات سے بھی آگاہی ہوگئی ہے کہ آپ بھی ایک عام مرد ہی ہیں جن کی محبت جی حضوری کی صورت میں ہی مل سکتی ہے جو بستر پر کروٹ بدلنے کے ساتھ ہی اپنی نظر اور نظریات دونوں بدل لیتا ہے۔'' اس کی آواز میں بے بسی اور شکست نمی کی صورت گھلنے لگی۔

''مجھے اس حد تک لانے والی بھی تم ہی ہو جب عورت نادان ہو جاتی ہے تو خاص مرد بھی عام مرد بن جاتا ہے۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو محبت کرنی تم نے ختم کی ہے میں نے نہیں۔ تعلق تم نہیں نبھا سکیں میں نہیں، اور ویسے بھی زندگی میں محبت کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ مسئلہ فرائض اور ذمہ داریوں سے کوتاہی پیدا کرتی ہیں، کبھی خود پر نظر کی ہے تم نے' اپنے بچوں کا اور میرا احساس ہے تمہیں، تم کو میرے ہر جملے پر شرمندگی ہوتی تھی لوگ کیا کہیں گے' بچے کیا سوچیں گے؟ لیکن کبھی یہ سوچا کہ گھر میں بے تکے حلیے میں لوگ دیکھیں گے تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ بچوں کے دوست کیا سوچیں گے؟ تمہیں محبتوں کے ساتھ عزت عزیز ہے تو مجھے بھی عزیز ہے واعظہ۔'' انہوں نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بے رحمی سے جواب دیا۔

''ایک ماسی سے تعلقات جوڑ کر آپ اپنے بچوں کے لیے باعزت مقام تو حاصل نہیں کر سکتے البتہ گناہ ضرور کر سکتے ہیں، منیر'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا ''میں پہلے کون سا ثواب کما رہا تھا؟'' انہوں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا ''اب جو راستہ میں نے سوچا ہے وہی درست ہے۔''

''آپ کی آنکھوں پر تو کسی نے ایسی محبت کی پٹی باندھی ہے کہ آپ کو علاوہ میرے قصور کے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ نہ بیٹے کا مستقبل نہ بیٹی کی عزت۔ میں تو ہمیشہ سے ایسی ہی تھی منیر اور آپ کو میرا یہی انداز پسند تھا اچانک اور وہ بھی اس وقت جب کہ بچے شادی شدہ اور شادی کے لائق ہو رہے ہیں، آپ کو میرے حال حلیے کا خیال کیوں ستانے لگا۔'' اس نے بدستور الجھے اور التجائیہ انداز میں ان سے سوال کیا۔

''حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے واعظہ بیگم' بیوی شوہر کی ایک نظر پہچانتی ہے پھر تم نے میری نظر کو کیوں نظر انداز کیا۔ تمہارا قصور ہے اور صرف تمہارا ہی قصور ہے۔'' منیر صاحب مارے غصے کے کھڑے ہوگئے۔ ''تم نے نہ صرف دوسرے کو پٹی باندھنے کا موقع فراہم کیا بلکہ خود بھی اپنی آنکھوں پر خوش فہمی کی پٹی باندھی رہیں۔ میں کیا کوئی بھی شریف آدمی ہوتا یہی راستہ اختیار کرتا۔''

اس نے ارسلان سے پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آفس میں کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ نو بجے کے قریب ارسلان نے ان کے آفس کولیگ کو فون کیا تو بس اتنا پتہ چل سکا کہ شاید شہر سے باہر گئے ہیں۔ کیوں کس لیے اس کا انہیں نہیں پتا تھا۔

وہ رات کاٹنی واعظہ کے لیے مشکل ہوگئی تھی۔ بار بار منیر صاحب کا جملہ ذہن میں گونجتا تھا کہ کسی دن شب خون ماروں گا اور اس کے ساتھ ہی ناظمہ کا تصور ذہن میں آجاتا۔ اپنی بے وقعتی کے احساس سے آنکھیں بار بار چھلک پڑتیں۔

اگلے دن کوئی تین بجے کے قریب وہ گھر پہنچے۔ ارسلان اور واعظہ پریشان بیٹھے انہیں کا انتظار کر رہے تھے۔

''کہاں گئے تھے منیر آپ بنا بتائے، نہ کال خود کی نہ کال ریسیو کر رہے تھے۔'' انہیں دیکھتے ہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھٹ پڑے لیکن اپنے غصے کا اظہار وہ جوان بیٹے کے سامنے کرنا نہیں چاہ رہی تھی اسی لیے جھنجلاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

''ارے یار سوری!'' انہوں نے تھک کر صوفے پر گرتے ہوئے کہا ''دراصل ارجنٹ آفس کی طرف سے اسلام آباد جانے کے آرڈر تھے۔ میں نے سر سے کہا بھی کہ گھر پر اطلاع کر آؤں تو انہوں نے کہا کہ راستے سے کر دینا اور جب کال کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ موبائل کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔'' انہوں نے تھکن زدہ مسکراہٹ کے ساتھ بات ختم کردی۔ پھر ارسلان سے اس کی پڑھائی کا پوچھنے لگے۔

''ٹھیک چل رہی ہے۔ بابا بس آج ایک اسائمنٹ کے لیے سب دوستوں کو شہود کے گھر جمع ہونا ہے۔ شکر ہے آپ آگئے اب میں اسی طرف نکلوں گا۔'' ارسلان نے اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر صبح وہیں سے ہم یونیورسٹی چلے جائیں گے۔ پروجیکٹ اور اسائنمنٹ جمع کرانے کے لیے۔''

منیر صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا ''چلو ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہوگی۔ میں بھی اب آرام کروں گا۔'' پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور التجائیہ انداز میں کہنے لگے ''بیگم ایک کپ اپنے ہاتھ کی مزیدار سی چائے پلا دو تاکہ کچھ تو تھکن اتر جائے۔'' وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد ارسلان بھی دوستوں کی طرف چلا گیا۔ وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو منیر صاحب کسی سے باتوں میں مصروف تھے۔ ''یار اب مزید آزمائش میں نہیں ڈال سکتا۔ میری برداشت جواب دے رہی ہے۔'' اس کی آمد پر انہوں نے گھبرا کر لائن کاٹ دی۔

اس نے کپ ان کے برابر میں رکھتے ہوئے کہا ''بات کرتے رہتے لائن کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں واعظہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' انہوں نے مطمئن انداز میں جواب دے کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''برداشت تو میری بھی جواب دے رہی ہے منیر'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے چائے پی کر کپ نیچے رکھ دیا

''خیریت!'' مختصر ترین سوال پھر واعظہ کا منتظر تھا۔ ''یہ آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں منیر کہ خیریت ہے یا نہیں؟''

''اب کیا خطا ہوگئی۔'' انہوں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے آپ کی محبتوں پر بہت مان تھا، منیر'' اسے اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''میں مانتی ہوں کہ آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنی لیکن منیر بخدا اپنے باپ کے بعد اگر کوئی مرد میری زندگی میں آیا تو وہ آپ ہیں اور آپ کے بعد اگر محبت کی تو صرف اپنے بچوں سے۔ ساری زندگی

''کیا مطلب بیوی کی جگہ ماسی کو دے دیتا یہی بیوی کی وفاداریوں کا صلہ ہے۔'' اس نے پھر طنز یہ انداز سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو بھی چاہے سمجھو جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ تمہارے آگے جواب دوں۔'' منیر صاحب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

''مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے آپ میں نے خود آپ کو ناظمہ کے ساتھ دیکھا اور آپ کی باتیں بھی سنی ہیں۔''

''تو میں نے کب انکار کیا۔ تم نے ہاتھ کھینچا تو کوئی تو پکڑے گا۔ توجہ و محبت کس کو بری لگتی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم میری طرف سے آنکھیں بند کرلو گی تو ساری دنیا اندھی ہوجائے گی۔ ویسے بھی دوسری شادی کا مجھے پورا حق حاصل ہے اور اللہ نے کہیں یہ شرط نہیں لکھی کہ شادی کے لیے بیوی کی اجازت کی ضرورت ہے۔ ہاں انصاف کرنے کا حکم ہے تو تمہارے ساتھ قطعاً ناانصافی نہیں ہوگی۔'' انہوں نے واعظہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جو بے بس سی ان کا جواب دینے سے لاچار نظر آرہی تھی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس حد تک بدل سکتے ہیں۔'' گرنے کا لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا کہ کہیں منیر صاحب ناراض ہوکر ہی نہ چلے جائیں۔ اتنے دنوں بعد تو وہ اس کے ساتھ تھے۔ وہ مزید خود سے بدظن نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جب دوسری عورت مرد کی زندگی میں آجائے تو اس کا خمار توڑنا آسان نہیں۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس عمر میں اسے اپنی عزت و محبت کے لیے جنگ لڑنا پڑے گی۔

انہوں نے اس کے پشیمان چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ''غلط راہ عورت ہی دکھاتی ہے۔ اپنی طرف رجوع کروا کے کریا خود سے دور کرکے اور میں بھی انسان ہوں۔ غلطی تو مجھ سے بھی ہوسکتی ہے۔ اگر تم خود کو بدل سکتی ہو تو میں بھی کوشش کرسکتا ہوں، وعدہ نہیں۔''

اس نے منیر صاحب کی طرف دیکھا جو اسے ہی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''کیا آپ نے اس سے نکاح کرلیا ہے؟'' تکلیف کی شدت سے جتنے ٹوٹ کر اس کے زبان سے یہ جملہ ادا ہوا، اس سے کہیں زیادہ روانی سے ٹوٹ کر آنسو بہہ نکلے۔

''نہیں واعظہ! ابھی تک یہ مقام میں نے کسی کو نہیں دیا۔'' انہوں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ ان سے اس کے آنسو برداشت نہیں ہوسکتے تھے۔ ''میں سب بھول جاؤں گا۔ بشرطیکہ تم مجھے اسے یاد کرنے کا موقع نہ دو۔ کرو وعدہ۔'' انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے بدستور تنبیہی لہجہ رکھا اور اس نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے رضامندی کا اظہار کردیا۔

اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ دس پندرہ دنوں پر مشتمل اتنا اعصاب شکن محاذ جس کا ایک ایک پل صدیوں پر محیط لگ رہا تھا وہ اتنی آسانی سے جیت جائے گی۔ اگرچہ منیر صاحب کی لگائی ہوئی ضرب کاری ضرور تھی لیکن غنیمت تھا وقت پر آنکھ کھل گئی۔

اور یقین تو منیر صاحب کو بھی نہیں آرہا تھا کہ ان کا منصوبہ ان کی سوچ سے کہیں زیادہ کامیاب اور جلد ختم ہوجائے گا۔ ابھی تو انہیں اپنی کولیگ کا بھی شکریہ ادا کرنا تھا جس کی جگہ انہیں اسلام آباد کے ٹرانسفر آرڈر مل گئے تھے جس نے نہ صرف ان کے لیے ماسی کا رول پلے کیا بلکہ طبیعت کی خرابی کے سبب ان کی جگہ اپنا ٹرانسفر کروا کر واپس چلی گئی اور منیر صاحب ایسے خودغرض بھی نہ تھے کہ اپنے دوست کی بیگم کو اکیلے اسلام آباد جانے دیتے۔

اگرچہ منیر صاحب کا یہ دانشمندانہ قدم خود ان کے لیے بھی کسی آزمائش سے کم نہیں تھا لیکن لگن سچی ہو اور محبت جاگ جائے تو سودا برا نہیں..... مگر یہ بھی یاد رہے کہ ہر مرد منیر صاحب نہیں ہوتا.....!!

منی ناول

میرے چارہ گر کو نوید ہو

زندگی سے جڑے ایک حسین رنگ کا ساتواں حصہ ......

''تم ابھی تک ریڈی نہیں ہو چیمپ ...... جانا نہیں کیا...... آج تو ہمارے لیے بہت اہم دن ہے ...... آج ڈیڈی اپنے بیٹے کی تعریفیں سننے کی آس لے کر جارہے ہیں...... کم آن ہری اپ اینڈ گیٹ ان ٹومنٹس......''

''پھر کیا ہوا؟'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''پھر وہاں بہت مزہ آیا...... تمام ٹیچرز نے ڈیڈی کو بتایا کہ میں اسکول کا بیسٹ اسٹوڈنٹ ہوں...... ڈیڈی بہت خوش تھے۔'' خوشی سے بولے۔

''آخر بیٹا کس کا ہے......؟''

''اچھا...... انہوں نے یہ کہا؟'' وہ حیرت زدہ تھی۔

''بس ماما......'' خوشی اس کی آواز سے ٹپک رہی تھی۔ پھر ڈیڈی اس خوشی میں مجھے ڈنر کے لیے لے کر گئے۔ اور سب چیزیں میری پسند کے مطابق آرڈر کیں...... کاش آپ بھی وہاں ہوتیں تو دیکھتیں...... میں نے آپ کو بہت مس کیا۔''

''ویری سوری مائی ڈارلنگ......'' ہم اکٹھے ہوں گے اب تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔''

''پلیز ماما جلد آجائیں ...... اور جینا باجی کہاں ہیں۔ آئی مس ہر ٹو......''

ماہا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ مہینے میں ایک دن کے لیے ایک چکر ضرور لگاتی تھی۔ اس عرصے میں بھی...... ان کے ملنے والے سوالات کرتے تھے حالانکہ سب کو بتادیا گیا تھا کہ جینا نے ابروڈ اسٹڈیز کے لیے ایڈمیشن لے لیا ہے...... ابھی نہ جانے کون کون سے اور سوالوں کے جوابات دینے ہوں گے۔ لوگوں کو تو خوامخواہ کریدنے کی عادت ہوتی ہے...... اور وہ کسی جواب سے مطمئن نہیں ہوتے...... اجالا کی پیدائش کے بعد دو ماہ وہ وہیں رہی...... ہر طریقے سے جینا کی مدد کی۔ لیکن جب واپسی کا وقت آیا تو جینا نے واپس جانے سے صاف انکار کردیا۔

''میں وہاں نہیں جاسکتی ممی...... نہ ہی اجالا کو یہاں چھوڑ سکتی ہوں...... وہاں لے کر گئی تو اس کے ہونے کا کیا جواز پیش کروں گی۔ میں ڈیڈی اور خاندان کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔ میری غلطیوں کا خمیازہ آپ لوگ کیوں بھگتیں...... اور اب

وقت آ گیا ہے کہ اپنی غلطیوں کا ذمہ میں خود اٹھاؤں جب تک اس کے باپ کی اصلیت کا پتہ نہیں چل جاتا...... میں واپس نہیں جاؤں گی۔ ڈیڈی سے کہیے گا ...... اگر کبھی ان کا دل چاہے تو اپنی بیٹی اور نواسی کو ملنے آ جائیں...... آپ تو مجھے پتہ ہے آئیں گی ہی۔''
اس نے پرامید نظروں سے ماہا کی طرف دیکھا۔
''آف کورس ڈارلنگ ...... وائلڈ ہارسز کین ناٹ کیپ می اوے فرام یوں اینڈ مائی گرینڈ ڈاٹر!
پھر جینا کی خواہش کے مطابق جواد نے اسے مری سیٹ کروادیا ......رانی اور دلاور خان کو وہیں بھجوادیا۔
ماما واپس آئی تو فواد اور جواد نے اس کا پر جوش استقبال کیا۔ فواد کی آنکھوں میں تو بس خوشی ہی خوشی تھی۔ لیکن جواد کی آنکھوں میں خوشی کے ساتھ ساتھ اداسی اور دکھ بھی تھا...... اور ماہا جانتی تھی کہ وہ جینا کی وجہ سے دکھی ہیں۔ تبھی تو اس نے ان کے دیئے سارے دکھ پل بھر میں بھلا کر ان کو سمیٹنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ ان کی بکھری شخصیت کو سہارا چاہیے تھا اور یہ سہارا صرف وہی مہیا کر سکتی تھی فواد نے تو اپنا پارٹ نبھادیا تھا اب اس کی باری تھی...... وہ ان کے کہے بغیر ہی ان کے کمرے میں منتقل ہوگئی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر اور محبت دونوں ہی تھے...... فواد اب سمجھ دار ہوگیا تھا...... اس نے اس تبدیلی کو محسوس تو کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ ہاں تھوڑا مایوس تھا...... وہ جب چاہتا ماں کے کمرے میں آ کر اس کے بستر میں گھس جاتا تھا' ماہا نے اسے بازوؤں میں چھپا کر سرگوشی کی۔
''...... تمہیں پتہ ہے بیٹا ...... ابھی بھی کچھ نہیں بدلا ...... تم رات کو جب چاہو جس وقت چاہو ہمارے کمرے میں آ کر ہمارے بستر میں گھس سکتے ہو......بس ناک کرنے کی ضرورت ہے۔''
''ریئلی......'' وہ حیران ہوا اور پھر خوش ہوگیا۔
''اوہ یو آر گریٹ ماما......'' ماہا پرسکون ہوگئی ...... وہ آ تو گئی تھی لیکن اس کا دل جینا اور اجالا میں اٹکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو تسلی دی ...... مری دور ہی کتنا ہے؟ جب چاہوں گی چکر لگالوں گی ...... رات گھر میں جواد کی سنگت میں پرسکون اور گہری نیند آئی...... صبح اٹھی تو خوشیوں کے باوجود سب ادھورا لگ رہا تھا۔ جینا اور یہ گھر جیسے لازم وملزوم تھے۔ اس کے بغیر ہر چیز جیسے اداس سی تھی۔ بیٹیوں کو رخصت تو ہونا ہوتا ہے...... ایک دن ماں باپ کو چھوڑ کر چلے جانا ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح جانا جیسے دیس نکالا مل گیا ہو...... واپس آنے پر پابندی لگی ہو۔ چاہے یہ جینا کی خود ساختہ پابندی تھی لیکن فی الحال شاید اسی میں بہتری تھی۔ صبح اٹھی تو جواد بستر میں نہیں تھے ...... وہ گھبرا کر اٹھ گئی...... آج پہلی بار ہی نئی زندگی کی ابتدا ایسے نہیں ہونی چاہیے تھی کہ اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیا جائے...... ناشتے کی تیاری کے ساتھ ساتھ فواد اور جواد کی تیاری میں مدد کرنا اس کی ترجیحات میں شامل تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو کر آئی تو سب ڈائننگ ٹیبل پر منتظر تھے...... سب میں تھا ہی کون...... جواد، فواد اور نوکروں کی فوج...... اس وقت اماں بے تحاشہ یاد آئیں...... آنکھیں بھیگ گئیں۔
''ماما آئیے نا...... ڈیڈی کب سے انتظار کررہے ہیں...... ناشتہ شروع ہی نہیں کررہے اسی لیے مجھے بھی بھوکا بیٹھنا پڑ رہا ہے۔''
جواد ہنس پڑے۔
''ہمارا بیٹا کافی عقل مند ہوگیا ہے ماہا......''
ماہا نے خوشگوار حیرت سے جواد کی طرف دیکھا آج پہلی بار جواد نے ہمارا بیٹا کہا تھا ورنہ ماضی میں تمہارا بیٹا تمہارا بیٹا کی گردان جاری رہتی تھی اور وہ بھی غصے اور طنز کے طور پر۔
''......اسکول میں تو سب ٹیچرز کا فیورٹ اسٹوڈنٹ ہے۔ میں پہلی بار فواد کے اسکول گیا تو

حیران رہ گیا...... سب اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ بہت پاپولر ہے اسکول میں ہمارا بیٹا......"

ماہا نے پھر چمکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے جواد کی سمت دیکھا۔ اور سر جھکا کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ فواد پوری رغبت سے ناشتہ نہیں کر رہا تھا لیکن اس کی زبان بھی ساتھ ساتھ خوب چل رہی تھی۔ ماہا نے اسے اتنی باتیں کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اپنی ماما سے بھی اتنی تیز رفتاری اور خوش گفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ شاید ہر وقت ڈیڈی اور جینا کا سلوک اس کے معصوم دل کو خوفزدہ رکھتا تھا۔ لیکن اب جبکہ یہ خوف دور ہو گیا تھا...... اس کی جگہ محبت اور اعتماد نے لے لی تھی۔ اس کی خوبیاں کھل کر سامنے آنے لگی تھیں اس نے ناشتہ کر لیا تو ماہا جلدی سے بولی۔

"چلو بیٹا جلدی سے تیار ہو جاؤ...... اسکول کے لیے دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"او کے ماما...... وہ فرماں برداری سے اٹھ گیا۔ لیکن میں واپس آؤں گا تو آپ گھر میں ہوں گی نا......؟" اسے ابھی بھی خدشہ تھا کہ وہ غائب نہ ہو جائے۔

"آف کورس بیٹا...... میں شدت سے آپ کی منتظر رہوں گی۔"

"ڈیڈی آپ بھی......؟"

"ڈیڈی تو آفس میں مصروف ہوں گے نا بیٹا...... شام تک آ......"

"ہم بھی موجود ہوں گے تم فکر نہ کرو......"

جواد نے یقین دلایا...... ماہا نے بے پناہ حیرت سے جواد کی طرف دیکھا...... کیا وہ اسے جھوٹی آس تو نہیں دے رہے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو......؟" جواد نے پوچھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ دھیمی آواز میں بولی

"اجازت کی کیا ضرورت ہے......؟"

"کیا آپ نے فواد کو بیٹا مان لیا ہے؟"

"بھئی تم سے وابستہ ہر چیز اب ہماری ہے۔ ہم اسے پسند کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں؟"

ماہا کا دل چاہا کہہ دے اگر وہ آپ سے بھی وابستہ ہوتو......؟ لیکن چپ رہی اس کی پرسوچ نظریں بدستور جواد کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

بھئی اگر تم مکمل طور پر میرا چہرہ اور میرے نقوش از بر کر چکی ہو تو ہمیں آفس جانے کی اجازت ہے......؟ جواد مذاقاً بولے تو وہ خجل سی ہو گئی۔ جواد اور فواد کے جانے کے بعد وہ سارا دن سوچوں میں ڈوبی رہی۔ گم سم سی رہی...... دل میں کوئی بات ذہن پہ کوئی بوجھ تھا جسے وہ اتارنا چاہتی تھی...... لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے کس طرح یہ بوجھ اتارے۔ دل کی بات جواد سے کیسے کرے؟ اتنی ہمت کہاں سے لائے...... جواد کی ناراضگی کا خیال ساری قوت سلب کیے ہوئے تھا۔ اتنی مدت کے بعد تو حالات ٹھیک ہوئے تھے۔ اتنے عرصے کے بعد وہ ایک فیملی بننے کے قابل ہوئے تھے یہ الگ بات ہے کہ فیملی ابھی نامکمل تھی...... لیکن جتنی موجود تھی وہ تو خوش تھی کیا وہ اس خوشی کو گہن لگانے کی ہمت کر سکتی ہے...... لیکن کچھ بھی ہو...... کوئی بھی نتیجہ نکلے سچ کو سامنے آنا ہی ہوگا۔ وہ روکے گی تو بھی سچ تو اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہے...... اور اگر کسی اور سے جواد نے یہ سچ جانا تو ان کو ٹھیس پہنچے گی اور اگر وہ اس کی وجہ سے پھر سے اپنے ماحول میں بند ہوئے تو وہ سارا دن بے چین، بے قرار اور مضطرب رہی...... دوپہر کو فواد آیا تو وہ بھی ساتھ ہی تھے۔

"آپ......؟ اتنی جلدی......" وہ پریشان ہو گئی۔

بھئی ہم لنچ کرنے گھر آئے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ ہمارے بیٹے کو تو نہیں ہے کیوں فواد......؟"

"آف کورس ناٹ ڈیڈی...... میں تو خوش

ہوں کہ آپ آئے ...... دونوں کپڑے بدل کر منہ دھو کر آ گئے ...... کک نے کھانا لگا دیا ...... دونوں نے خوش گپیوں کے درمیان مزے سے کھانا کھایا ...... وہ حیران پریشان کبھی جواد کا چہرہ دیکھتی اور کبھی فواد کا ...... برائے نام کھا سکی ...... کھانے کے بعد فواد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''ماما میں تھوڑا آرام کروں گا ...... پھر ٹیسٹ کے لیے پڑھنا ہے ......''

جواد اپنے کمرے میں آ گئے ...... وہ کمرے میں آئی تو وہ بھی کپڑے بدل کر لیٹ گئے تھے۔

''آپ واپس آفس نہیں جائیں گے ......؟''

جواد نے غور سے اسے دیکھا

''آپ ہمیں واپس کیوں بھیجنا چاہتی ہیں ...... ہماری موجودگی گوارا نہیں ہے ......''

''نہیں، نہیں وہ ہراساں ہو کر بولی ...... ایسی تو کوئی بات نہیں ......''

''اچھا! ادھر آ کر میرے پاس بیٹھو ......'' انہوں نے اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ بے دلی سے بیٹھ گئی۔ ...... جواد ان اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے ......؟''

''مسئلہ ......؟ کوئی مسئلہ نہیں ہے ......'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی

''ماہا میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ کل سے تم گم سم۔ چپ چپ اور پریشان ہو تمہارے دل پر کوئی بوجھ ہے ...... مجھے بتاؤ گی تو دل ہلکا ہو جائے گا ...... اور شاید میں مسئلے کا بہتر حل نکال سکوں ......''

''...... اس طرح کا مسئلہ نہیں ہے جس کا حل نکالنا پڑے ......' اسے پتہ تھا بتائے بنا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جب وہ اس کی پریشانی بھانپ گئے ہیں تو جانے بنا نہیں چھوڑیں گے۔

''اچھا کس طرح کا مسئلہ ہے ...... آئی ہوپ مسئلہ فیثا غورث نہیں ہے ......''

''مذاق نہیں اڑائیں ......''

''او کے، میں سنجیدہ ہو گیا ...... اب بتاؤ ......''

''پہلے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''بھئی اس عمر میں قسمیں وعدے، قسمیں اچھی نہیں لگتی ...... مگر تم کہتی ہو تو ......''

''آپ پھر مذاق اڑا رہے ہیں ......'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا

''بات سیریس نہیں لگتی ہے ...... جینا تو ٹھیک ہے نا اور اجالا ......''

''ان کا مسئلہ نہیں ہے ......'' وہ رونے والی ہو رہی تھی۔

''پھر کس کا مسئلہ ہے؟ تم کچھ بتاؤ گی تو پتہ چلے گا ......''

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ ناراض نہیں ہوں گے؟''

''ناراض ......؟'' وہ حیران ہوئے۔

''ہاں ناراض ...... کیونکہ میں نے جو بھی کیا اس میں آپ کا بھی قصور ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے مجھے یہ سب کرنا پڑا۔''

''کیا کیا ہے تم نے ......؟'' وہ پریشان ہو گئے۔ فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ غصہ نہیں کریں گے اور مجھ سے خفا بھی نہیں ہوں گے اور ...... ڈانٹیں گے تو بالکل نہیں ......''

''ایسا کیا کر دیا ہے تم نے جو لمبے چوڑے وعدے لے رہی ہو ...... مجھے گھبراہٹ ہونے لگی ہے ...... ماہا اس عمر میں میں کسی بری خبر کا متحمل نہیں ہو سکتا ......'' وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں ان دیکھی اذیت اور اضطراب تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے آپ خواہ مخواہ گھبرا گئے ہیں۔''

''پھر بتاؤ ...... اور ذرا جلدی کرو ......''

''آپ نے ابھی وعدہ نہیں کیا ......''

''اوکے......اوکے......'' وہ جلدی سے بولے۔ ''کچھ نہیں کہوں گا......بس جلدی بتادو''

''بہر حال...... جو میں آپ کو بتانے جارہی ہوں اس میں مجھ سے زیادہ آپ قصور وار ہیں اور مجھے یہ سب بتانے کے لیے تھوڑی تمہید باندھنی پڑے گی...... یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں نے شادی کے بعد خود کو آپ کے قابل بنانے کے لیے کتنی محنت کی تھی...... اپنی تعلیم کس مشکل سے مکمل کی تھی لیکن آپ کا غصہ اور رویہ کسی طرح تبدیل نہیں ہورہا تھا...... یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے ماسٹرز اعلیٰ اعزازی نمبروں سے پاس کیا...... آپ بزنس ٹور پر بیرون ملک گئے ہوئے تھے...... اماں مرحومہ بہت خوش تھیں...... وہ چاہتی تھیں کہ اس خوشی میں میرے اعزاز میں پارٹی دیں...... لیکن میں ڈر رہی تھی کہ آپ خفا ہوجائیں گے لیکن اماں نے کہا تم فکر نہ کرو اگر اس نے غصہ کیا تو وہ خود سب کچھ سنبھال لیں گی لیکن میری بدقسمتی کہ جیسے ہی پارٹی ختم ہوئی آپ تشریف لے آئے...... اس وقت جینا دس سال کی تھی...... وہ بے خبری میں غلطی سے ہی تھک کر میرے پاس بیٹھ گئی...... اور مجھے اپنی دادو سمجھ کر میرے ساتھ لگ گئی۔ عین اس لمحے آپ سامنے آگئے۔ میں گھبرا گئی...... جینا کو یوں میرے ساتھ لگے دیکھ کر آپ آگ بگولہ ہوگئے پھر میرے کمرے میں آکر مجھے بے نقط سنائیں...... لیکن ان سب باتوں میں ایک جملے نے مجھے بری طرح ہٹ کیا...... آپ کو یاد ہے آپ نے کیا کہا تھا؟''

''غصے میں کہی گئی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں......'' وہ پشیمانی سے بولے، ماتھے پر پسینہ آگیا۔

''لیکن میں کیسے بھول سکتی ہوں...... وہ جملہ میرے دل پر نقش ہوگیا...... پتہ ہے آپ نے کیا کہا تھا...... آپ نے کہا تھا اگر ہمارا کوئی اور بچہ بھی ہوتا تو میں اسے کبھی تمہارے پاس نہ رہنے دیتا اسے بھی چھین لیتا...... میں بری طرح خوفزدہ ہوگئی...... جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ میں اس وقت تین ماہ کی پریگننٹ تھی...... میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ اماں سے بھی نہیں کیونکہ اماں کو معلوم ہوتا تو کسی نہ کسی وجہ سے بات آپ تک پہنچ جاتی...... ان دنوں کھلے کھلے کپڑے پہننے کا رواج تھا اس لیے کسی کو پتہ نہیں چل سکا...... لیکن آپ کے منہ سے وہ جملہ سننے کے بعد میں بری طرح پریشان ہوگئی...... میں دوبارہ اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کرسکتی تھی میں ایک بار اور ایک بچہ پیدا کرکے اس کی زندگی سے بے دخل ہونے کی ہمت نہیں رکھتی تھی مجھے اپنے بچے کو خود پالنا تھا اپنی گود میں لینا تھا...... اس سے پیار کرنا تھا...... میں دوسری بار اپنی گود خالی نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے گھر سے جانے کا پلان بنایا...... اماں سے یہی کہا کہ مجھے کچھ وقت اکیلے گزارنا ہے۔ میں اس طرح اور ان حالات میں یہاں نہیں رہ سکتی...... ورنہ میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی...... میں پاگل ہوجاؤں گی...... اماں تو سب جانتی تھیں...... انہیں لگا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں...... اور انہیں میری بڑی فکر رہتی تھی چنانچہ میری صحت کی خاطر انہوں نے مجھے اجازت دے دی اور یہ تسلی بھی دی کہ جواد سے میں خود نمٹ لوں گی۔ مجھے ڈرائیور کے ساتھ گاؤں بھیجا لیکن میں نے بسوں کے اڈے پر اتر کر ڈرائیور کو واپس بھیج دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو پتہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کوئی میرے پیچھے پہنچ جائے اور میرا راز افشا ہوجائے۔

وہ دم لینے کو رکی اور جواد کے چہرے پر ایک نظر ڈالی...... وہ حیرت زدہ اس کی داستان یوں سن رہے تھے جیسے وہ کوئی طلسم ہوشربا سنا رہی ہو...... اور دوبارہ شروع ہوئی

''یوں تو میں گاؤں ہی گئی تھی...... لیکن گاؤں سے کافی فاصلے پر مضافات میں ماسی جیراں رہتی

ہے۔ آپ تو اسے جانتے ہیں..... جب وہ جوان تھی تو دائی کا کام کرتی تھی..... بوڑھی ہوئی تو اس گھر میں آ گئی۔ کوئی ادھر نہیں آتا تھا..... بچے تک گھبراتے تھے وہاں آنے سے کیونکہ وہ سمجھتے تھے وہاں بھوت رہتے ہیں..... میں نے ماسی جیراں کو اپنی سچی کہانی سنا کر ان سے مدد مانگی..... وہ راضی ہو گئیں اور کہنے لگیں

''میں جانتی ہوں جوادی کو.....شروع ہی سے بڑا اتھر منڈا تھا.....''

میں نے ماسی کی بہت مدد کی۔ ان کے گھر کو صاف ستھرا کر دیا..... کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی وہ مجھ سے بہت خوش تھیں..... فواد ان کی مدد سے پیدا ہوا..... فواد پیدا ہوا تو مجھے نئی زندگی مل گئی..... اب مسئلہ تھا اسے گھر کیسے لے کر جاؤں اگر آپ کو معلوم ہو گیا کہ فواد آپ کی اولاد ہے تو آپ مجھ سے چھین لیں گے اسی لیے ماسی جیراں کے ساتھ مل کر ہم نے بیوہ عورت کی کہانی گھڑی جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ بچے کو جنم دے کر موت کے منہ میں چلی گئی.....

اور..... اور میں ان سے محبت کا شکار ہو کر اسے اڈاپٹ کرنے پر تیار ہو گئی..... بس مسئلہ یہ تھا کہ آپ اسے اڈاپٹ کرنے پر تیار ہوں گے یا نہیں..... لیکن مجھے پکا یقین تھا کہ اماں میرے ساتھ ہوں گی.....''

ماہا نے ڈرتے ڈرتے جواد کے چہرے کی طرف دیکھا..... وہ ابھی تک پتھر کا بت بنے حیرت زدہ اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر یکدم ان کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے..... یوں لگ رہا تھا ان میں ہلنے کی سکت نہیں..... بولنے کی سکت نہیں..... کتنی دیر تک وہ اس حالت میں بیٹھے رہے..... ماہا ان کی حالت سے خوفزدہ ہونے کو تھی کہ ان کے لب ہلے

''تمہارا مطلب ہے کہ..... فواد میرا بیٹا ہے؟ میرا اپنا خون ہے.....؟''

ان کی آنکھیں نم تھیں اور چہرہ بے یقینی کا شکار تھا۔ ماہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ تم نے کیا کیا ماہا.....؟'' ان کی آنکھوں میں بے پناہ اذیت تھی..... تم نے مجھے اپنے ہی بیٹے سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا..... وہ مجھ سے دور دور رہتا تھا..... مجھ سے خوفزدہ رہتا تھا اور..... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا..... میں اس کی اس کیفیت کو یوں انجوائے کرتا تھا جیسے اس کی سزا بھی تمہیں مل رہی ہے''

ماہا خاموش انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیقراری سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کا ایک ایک قدم ماہا کے دل پر پڑ رہا تھا..... دل مسلا جا رہا تھا۔

''شاید اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں.....'' وہ تکلیف دہ لہجے میں بڑبڑائے میں نے جینا کو تم سے دور رکھا..... تمہیں تکلیف دینے کے لیے اس کی محبت سے محروم رکھا اور تم نے فواد کو مجھ سے دور کر دیا۔

''لیکن ایک جیسا عمل کرنے کے باوجود نیتوں میں بہت فرق ہے..... آپ نے جینا کو مجھ سے دور رکھا مجھے تکلیف دینے کے لیے لیکن میں نے فواد کے بارے میں حقیقت چھپائی صرف فواد سے پیار کرنے کے لیے۔ اپنی ترستی تشنگی ممتا کی تسکین کے لیے میرا مقصد آپ کو تکلیف دینا ہرگز نہیں تھا.....'' ماہا رو پڑی۔

''جانتا ہوں..... خدا سب حساب برابر کر دیتا ہے۔ ہم اپنی چال چلتے ہیں اور وہ اپنی چال چلتا ہے..... شاید اسی لیے آج ہمارے دونوں بچے اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور باپ سے شاکی رہتے ہیں..... خدا کس طرح بازی پلٹ دیتا ہے۔''

'' ایسا نہیں ہے جواد جینا بھی آپ کو چاہتی ہے اور فواد..... فواد پہلے شاکی تھا آپ سے لیکن اب تو آپ دونوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں..... بہت پیار کرتا ہے وہ آپ سے.....''

''ہاں..... لیکن تم نے آج یہ سب بتانے کا

فیصلہ کیوں کیا؟ تم ابھی بھی یہ سب راز رکھ سکتی تھیں۔''

''اس کی بھی وجہ ہے جواد..... فواد کو میرا اڈاپٹڈ بیٹا سمجھنے کے باوجود میرے آزاد کشمیر جانے کے بعد آپ نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس سے اچھا سلوک کیا اسے اپنے گھر لے آئے آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنا سیکھنے لگے۔ اس کی کامیابیوں کے اوپر ایک باپ کی طرح فخر کرنے لگے اور جب میں واپس آئی تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی آپ نے اسے ہمارا بیٹا تسلیم کیا..... آپ کو اس سے محبت ہوگئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غیر ہے۔ نہ جانے کس کا خون ہے..... آپ کو کسی بات کی پروا نہ رہی..... آپ کی محبت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تو میں نے سوچا کہ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اس کی اصلی ولدیت کے بارے میں جانیں..... اب جبکہ ہم حقیقی فیملی بن رہے ہیں تو سب کارڈز ٹیبل پر رکھ دینے چاہئیں..... ساری سچائیاں سامنے آجانی چاہئیں..... ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہنا چاہیے.....'' ماہا کا چہرہ سچائی کے نور سے چمک رہا تھا۔ اسی لمحے جواد کو اصل حقیقت نے ہٹ کیا

''فواد..... میرا بیٹا ہے..... میرا اپنا بیٹا..... میرا اپنا خون.....''

''ہاں..... جواد آپ ہی اس کے پراؤڈ فادر ہیں.....''

''اور تم نے یہ بات اتنے سال مجھ سے چھپائی.....'' وہ ایک دم غصے سے بولے۔ ماہا سہم گئی تو انہوں نے ایک زوردار جاندار قہقہہ لگایا

''چلو میرے ساتھ.....'' انہوں نے ماہا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکلے۔

''کہاں..... کہاں لے جارہے ہیں؟''

''اپنے بیٹے کے پاس..... آج اسے ایک نئے زاویے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

فواد تکیے پر سر رکھے معصومیت سے سو رہا تھا۔ جواد ایک ٹک اسے دیکھے گئے۔ ان کی آنکھوں سے محبت کی بارش ہورہی تھی..... وہ آنکھوں سے اس کے پیارے چہرے کو چوم رہے تھے۔ نظروں سے پیار کررہے تھے۔ کتنی دیر گزر گئی ان کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا واپس جانے کو..... دل چاہ رہا تھا کہ دیکھتے رہیں..... پھر انہوں نے اطمنان بھری سانس لی

''تھینک یو ماہا..... تھینک یو مجھے اتنی بڑی خوشی دینے کا............''

''آپ ناراض نہیں ہیں نا.....''

''کیسے ناراض ہوسکتا ہوں..... جبکہ میں ہی قصوروار ہوں..... میں نے ہی تمہیں مجبور کیا۔ اگر میں جینا کو تم سے نہ چھینتا تو تم ایسا کبھی نہ کرتیں..... اصل میں تو میں ہی تمہارا مجرم ہوں بس تھوڑی سی مایوسی ہے کہ اتنے سال ضائع ہوگئے..... اپنے بیٹے کے ساتھ بانڈ نہیں کرسکا لیکن اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوگا..... تم نے دیکھا آج میرے بیٹے نے کتنے ایوارڈ لیے..... بالکل باپ پر گیا ہے.....'' وہ فخر سے سینہ پھلا کر بولے ماہا نے محبت پاش نظروں سے انہیں دیکھا۔

''اچھا اب جلدی سوجایئے..... صبح ہمیں جینا اور اجالا سے ملنے جانا ہے مجھے تو خوشی کے مارے نیند نہیں آرہی..... اتنی کیوٹ اور پیاری ہے میری نواسی.....''

''ہماری نواسی.....'' جواد نے تصحیح کی تو وہ مسکرادی۔

''کسی دن..... کسی دن جینا کی زندگی میں بھی دوبارہ وہ خوشیاں آئیں گی جن کی وہ متلاشی ہے۔ یاخدا اجالا کے باپ کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کر کہ وہی جینا کی خوشیوں کا ضامن ہے۔ اسے یقین کامل تھا کیونکہ آج تک وہ اپنے لیے آنے والے ہر رشتے سے انکار کرتی آئی تھی۔

☆

آج کاشانہ بلال مرزا میں بھر پور جوش و خروش سے نانی حضور کے پاس گاؤں جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا کچھ حصہ تو گزر چکا تھا رات اپنی الماری سے ملبوسات منتخب کرتے ہوئے یونیورسٹی کے ان دو سالوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کئی نشیب و فراز کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے تھے۔ اس کے سارے ہی پیپرز بہت اچھے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ٹیچرز کی منظور نظر طالبہ تھی۔ کچھ پرانی دوستیں تھیں اور کئی نئی سہیلیاں بھی بنی تھیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے کئی لڑکوں نے بھی اس کی پرکشش شخصیت کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کر ہی نہیں سکتی تھی اسے اپنی بابا جانی اور امی جان کی عزت بہت عزیز تھی اور وہ کسی قیمت پر اسے داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی دوسرے کوئی اس کے من میں جگہ نہیں بنا سکتا کہ اس دل پر تو عالی کا راج تھا وہ اسے نہیں مل سکتا تھا لیکن ہمیشہ دل کی مسند پر براجمان رہنے والا تھا۔ اسے اپنے اصول یوں بھی بہت عزیز تھے۔ زندگی میں ایک بار جینا کی خاطر انہیں توڑنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ اب دوبارہ ایسی غلطی دہرانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بیگ میں چند منتخب شدہ جوڑے رکھتے ہوئے اس کی سوچ اسی رات پہ اٹھ گئی۔ وہ آج بھی حیران تھی کہ آخر کیا سوچ کر وہ جینا کی خاطر اتنا بڑا رسک لینے پر تیار ہو گئی تھی یہ ٹھیک ہے کہ اس رسک کی وجہ سے ایک نایاب خزانہ اس کے ہاتھ لگا تھا وہ محبت جیسے انمول احساس سے روشناس ہوئی تھی لیکن رسک تو رسک ہوتا ہے...... وہ پرسوچ انداز میں آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں اسے عالی کی محبت کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی...... سچی محبت...... اور یہی تو اس کے سوال کا جواب تھا۔ اس روز جینا کی التجائیں اور منتیں اس پہ کبھی اثر نہ کرتیں اگر وہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھتی۔...... اسے ان آنکھوں میں سچی محبت کی تڑپ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس محبت کی تحریر اس کے چہرے پر روشن حروف کی صورت لکھی تھی...... آنکھوں میں ستاروں کی طرح دمک رہی تھی آج اس پہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ جینا جسے وہ پسند بھی نہیں کرتی تھی جسے وہ ایک بگڑی ہوئی بد دماغ لڑکی کے سوا کچھ نہیں سمجھتی تھی اس کی خاطر اپنے اصول توڑنے پہ کیسے مجبور ہو گئی۔

''ویل کبھی تو ہر انسان اپنے اصول توڑنے پر مجبور ہو جاتا ہو گا میں بھی فرشتہ تو نہیں ہوں اور شاید یہ اسکی مدد کرنے کا جذبہ ہی تھا جو خدا تعالیٰ کو پسند آیا اور مجھے اتنے حسین انعام سے نوازا۔ میرے دل کو آباد کر دیا روشن کر دیا ایک نایاب احساس سے دوچار کر دیا اب عالی مجھے ملے نہ ملے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... اس کی تصویر تو ہمیشہ ان آنکھوں میں رہے گی اسے تو شاید کبھی پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی ہے جس کے لیے وہ زندگی ہے...... سانسوں کی ڈور اس کے ساتھ بندھی ہے...... دل میں عجیب سی کسک ہونے لگی...... تو وہ جیولری بکس کھول کر بیٹھ گئی...... ہاتھ بے اختیار ہی اس پازیب تک پہنچ گئے...... کتنی دیر اس کا لمس محسوس کرنے کے بعد اس نے اسے پاؤں میں پہن لیا۔ پھر اس کی نظر انگوٹھی پر پڑی تو آنکھیں جگمگا اٹھیں...... اس نے انگوٹھی بھی انگلی میں پہن لی آج وہ یہ دونوں چیزیں اپنے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتی تھی...... انہیں ہر دم محسوس کرنا چاہتی تھی۔ پیچھے چھوڑ جانا گوارا نہیں تھا۔ انہیں ساتھ ساتھ رکھنا جیسے عالی کی موجودگی کو محسوس کرنا تھا...... اس کی یاد من کا موتی تھی۔ تن سے جدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ اپنا بیگ لے کر وہ باہر آ گئی۔ لاؤنج میں

خاموشی تھی۔ سب جانے کہاں تھے۔ شاید سبھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ تبھی فون کی بیل بجی۔ اس نے بڑھ کر ریسیور تھام لیا۔

''ہیلو کاشانہ بلال..... کون بول رہا ہے پلیز.....؟''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

''کیا بابا جانی کے کوئی دوست ہیں.....'' وہ مترنم آواز میں بولی'' ..... نام بتائیں پلیز.....''

''عالی.....'' دوسری طرف سے بس ایک ہی لفظ بولا گیا..... اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ یہ آواز..... اس آواز کو تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی لیکن یہاں ہمارے نمبر کا اسے کیسے پتہ چلا..... اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

''پلیز بند مت کیجیے گا..... مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے.....'' کسی کے آنے جانے کے خیال سے وہ ہراساں ہوگئی Panic کا شکار ہوگئی اور جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اس کا رنگ فق تھا اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں..... سارا اپنا بیگ لینے لاؤنج میں آئی تو اسے دیکھ کر حیران ہوگئی

''کیا ہوا آپی؟ ایسے لگتا ہے آپ نے کوئی بھوت دیکھ لیا.....'' وہ مذاق میں مسکرائی۔

فون کی بیل دوبارہ ہوئی..... اس نے گھبرا کر سارا کی طرف دیکھا..... سارا نے کنفیوز ہو کر اسے دیکھا اور فون کی طرف بڑھی۔

''سارا پلیز فون مت اٹھانا.....'' وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔

''کیوں آپی..... کوئی اہم کال ہوسکتی ہے.....'' سارا نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو.....''

'ہیلو دیکھیے میں امریکہ سے عالی بول رہا ہوں..... مجھے زارا سے بات کرنی ہے۔ بہت اہم بات ہے پہلے بھی میں کال کر چکا ہوں..... لیکن انہوں نے فون رکھ دیا تھا.....'' سارا نے حیرت سے زارا کی طرف دیکھا۔

''کیا زارا آپی آپ کو جانتی ہیں؟''

''آئی ہوپ سو.....'' وہ شائستگی سے بولا..... ''اگر وہ مجھے بھول نہیں گئیں تو.....''

''اوہ.....'' سارا شوخی سے گویا ہوئی۔ ''کیا آپ کی ملاقات ہوئی ہے کبھی.....''

''کوئی ڈھائی یا شاید پونے تین سال پہلے ملاقات ہوئی تھی ایک..... آپ زارا کی بہن ہیں؟''

''جی..... عابدولت کو سارا کہتے ہیں..... لیکن زارا آپی سے بات کرنا کیوں اتنا اہم ہے؟''

''گیس کریں۔''

''اوہ.....'' سارا شرارت سے بولی۔ ''دیکھیے مجھے لگتا ہے بابا جانی یا امی جان ادھر آرہی ہیں..... فی الحال تو ہم گاؤں جارہے ہیں..... دو ماہ بعد واپس آئیں گے تو کال کیجیے گا..... زارا سے بات ہوجائے گی..... یہ وعدہ ہے میرا..... خدا حافظ.....''

''سنیے..... سنیے پلیز'' وہ بے چینی سے بولا..... لیکن لائن کٹ گئی تھی۔

آنے والا شیری تھا۔

''سب تیار ہیں..... اور بارش بھی شروع ہوچکی ہے۔ ہر طرف سیلاب کی خبریں آرہی ہیں کہیں راستہ خطرناک تو نہیں ہوگا آپی؟''

''ارے فکر مت کرو..... جدھر ہم جارہے ہیں وہ علاقہ بلند ہے۔ وہاں کبھی سیلاب نہیں آیا..... کبھی پہلے سنا تم نے.....؟'' سارا نے اسے تسلی دی

''ہاں سنا تو نہیں لیکن پھر بھی ہمیں جلدی نکل جانا چاہیے تاکہ رات ہونے سے پہلے پہنچ جائیں۔''

''فکر کیوں کرتے ہو میرے پیارے بھائی، بابا جانی سے کہو اب اپنی محفل برخاست کریں۔''

شیری فوراً چلا گیا..... سارا فوراً زارا کے قریب آئی..... معنی خیز شوخ نظروں سے اسے

دیکھا۔

''......شروع ہو جایئے جلدی سے......وقت کم ہے۔ ابھی امی جان ادھر آ جائیں گی۔ کون ہیں یہ عالی حضرت......؟'' زارا نے پوچھا تو وہ عجلت میں بولی ''کوئی نہیں ہیں۔''

''کوئی نہیں ہیں؟'' آپ کے چہرے کی گلابیاں تو کہہ رہی ہیں کہ جناب سب کچھ ہیں اور یہ آنکھ مچولی کب سے چل رہی ہے۔ میری بے خبری میں......؟''

''کچھ خدا کا خوف کرو سارا آنکھ مچولی؟ بس ایک ملاقات کی خطاوار ہوں۔''

''یہ خطا کیسے ہوئی......؟'' سارا زور دے کر بولی ''ڈھائی سال......ڈھائی سال گزر گئے اور آپ اس راز کو سینے میں چھپائے سلگ رہی ہیں''

''سلگ رہی ہوں......'' زارا ہنس پڑی ''کیا بات کر رہی ہو تم؟''

''بالکل سلگ رہی ہیں اور وہ بھی گیلی لڑکی اوہ سوری گیلی لکڑی کی طرح......''

''کیوں ڈراماٹائز کر رہی ہو۔ ایک عام سی سچویشن کو......'' زارا نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''اوہو......'' سارا نے آنکھیں مٹکائیں۔'' اگر یہ اتنی عام سچویشن تھی تو آپ یہ گلٹی گلٹی نظریں کیوں چرا رہی ہیں......بتایئے؟''

زارا کو علم تھا سارا جان تو چھوڑنے والی نہیں ہے اس لیے جلدی جلدی اسے ساری صورتحال سمجھا دی......اس سے پہلے کہ امی جان آ جائیں۔

''اور امی جان جانتی ہیں اس بات کو میں نے انہیں بتا دیا تھا......''

سارا نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ویل......ہم نے آپ کی کہانی سنی......اس کا تجزیہ کیا......بات تو یہ ساری قصے کہانیوں والی لگتی ہے......لیکن پچھلے اتنے ہی عرصے سے......کتنا عرصہ بتایا تھا آپ نے......ہاں ڈھائی تین سال......اتنے ہی عرصے سے ہم آپ میں کچھ تبدیلیاں محسوس کر رہے ہیں۔ نواب زادی مس زارا بلال صاحبہ......ہر وقت کھوئے کھوئے رہنا......بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ ہی کچھ سوچ کر زیر لب مسکرا دینا......اور یہ......یہ انگوٹھی کہاں سے آئی......؟ یہ تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ خاصی قیمتی لگتی ہے اور خاص تحفہ بھی......''

''اف سارا......'' زارا ایک دم زچ ہو گئی......صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا......آنکھوں میں تھوڑی سی اذیت جھلکی......اور چہرے پر درد کی کیفیت اتنی واضح تھی کہ سارا پریشان ہو گئی......چند لمحے سنجیدگی سے زارا کی طرف دیکھا۔

''آپ کو عالی بھائی سے محبت ہو گئی ہے......؟'' وہ ہمدردی سے بولی......زارا نے ایک دم خود کو کنٹرول کیا۔

''وہ جینا کا نصیب ہے اور بس......'' وہ سختی سے بولی۔

''بات اس طرح بس نہیں ہوتی آپی......اور یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ آپ کو عالی بھائی سے محبت ہو گئی ہے......وہ ایک ایک لفظ پر زور دے بولی......اور آپ تین سال سے اس محبت میں جل رہی ہیں۔ اکیلے ہی......کسی کو بتایا بھی نہیں......میں اتنی غیر ہوں کیا......؟'' اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

''بتانے والی کوئی بات ہوتی تو بتا دیتی......'' زارا مستحکم لہجے میں بولی......میں بلاوجہ شور مچانے والوں میں سے نہیں ہوں......جس خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بارے میں پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟''

''تو یہ خواب ہے آپ کا......'عالی بھائی کا ساتھ ایک خواب ہے......اور خواب دیکھنا آپ کو پسند نہیں۔ شور مچانا آپ کا شیوہ نہیں۔ یہ ساری

خصوصیات تو سارا کی ہیں...... بائی داوے محبت میں نفع نقصان کس نے سوچا ہے آج تک...... اور رہی نصیب کی بات تو کیا نصیب تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ جوڑیاں تو وہی بناتا ہے...... آپ مایوس کیوں ہوتی ہیں...... جینا تو یوں بھی کسی اور سے محبت کرتی ہے اور بقول آپ کے اس کی محبت سچی لگی آپ کو...... میں جانتیہوں آپ کیریکٹرز کی بہت اچھی ہیں...... اور جینا اپنی محبت کو یوں آسانی سے نہیں چھوڑنے والی...... ویسے وہ آج کل ہے کہاں......؟''

''اسٹڈیز کے لیے کسی فارن یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اس نے...... زارا کی آواز بے حد دھیمی اور اداس تھی...... سارا نے غور سے اسے دیکھا...... محبت کی تپش سے کندن بنا چہرہ اس کی حقیقت بڑی آسانی سے واضح کررہا تھا۔

''یہ انگوٹھی بھی عالی بھائی کی طرف سے تحفہ ہے......''

''لیکن یہ تحفہ جینا کے لیے تھا......''

''لیکن انہوں نے آپ کو دیا...... جینا کو وہ نہیں جانتے تھے۔ اسے دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے جس ہستی کو دیکھا پسند کیا اور یہ انگوٹھی پہنائی وہ آپ ہیں......؟''

''نہیں سارا وہ ہستی جینا ہے۔ یہ انگوٹھی جینا کی امانت ہے......''

''پھر آپ نے ابھی تک انگوٹھی انہیں کیوں نہیں دی...... ان کی امانت میں خیانت کیوں کی۔ آپ کی ہمت کیوں نہ ہوئی کہ آپ اس انگوٹھی کو خود سے جدا کریں...... بتائیے مجھے'' سارا مستحکم آواز میں بولی۔ زارا جو اتنا عرصہ اس آگ میں جل رہی تھی ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔

''میں کچھ نہیں جانتی سارا پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو...... میں تمہارے سوالات کی متحمل نہیں ہوسکتی...... میں اپنے دل پر اختیار نہیں رکھتی۔ میں خود کو عالی کے بارے میں سوچنے سے نہیں روک سکتی...... وہ اگر کسی اور کا نصیب ہے تو کوئی بات نہیں...... محبت صرف پالینے کا نام نہیں ہے۔ محبت دل کو آباد کرنے کا نام ہے۔ محبت روشنی پھیلانے کا نام ہے اور میرا وجود میرا دل اور میرا انگ انگ اس روشنی میں نہا چکا ہے...... میرے دل سے اس روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں...... اگر میرے دل کے کسی کونے میں احساس محرومی کا اندھیرا ہ گیا تو یہ روشنی اس اندھیرے کو خود میں جذب کرلے گی...... اور اب واپس آنے تک تم عالی کے بارے میں کوئی بات نہیں کروگی۔''

''میں بات نہیں کروں گی اگر آپ انہیں یاد نہیں کریں گی......''

''تم کچھ نہیں کہوگی......''

''او کے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ اگر آپ ان کے بارے میں نہیں سوچیں گی اور آپ جانتی ہیں آپ جب سوچیں گی تو مجھے پتہ چل جائے گا کیونکہ جب آپ کوئی خاص بات سوچتی ہیں تو آپ کے چہرے پر ایک خاص روشنی پھیل جاتی ہے اور مجھے پتہ چل جاتا ہے۔''

''او سارا پلیز چلنے کی تیاری کرو' چلو سب سامان گاڑی میں رکھیں''

زارا تنگ آکر بولی۔

''آپ تو رہنے دیں، میں اور شیری رکھ لیں گے۔ کسی کی سوچوں نے پہلے ہی نڈھال کررکھا ہے آپ کو...... آخر یہ نازک سا تن کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے......'' سارا کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ زارا خاموش رہی کہ خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔ ورنہ لفظوں کی جنگ میں وہ کبھی سارا سے نہیں جیت سکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ان کا قافلہ منزل کی طرف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رواں دواں تھا سب چہک رہے تھے۔ بس زارا ہی خاموش تھی۔ اسے یاد آیا پچھلے دو سال میں کئی بار ایسا فون آیا تھا کہ فون اٹھانے پر کوئی نہیں بولا تھا۔ یا پھر بابا جانی اور امی جان کے اٹھانے کی وجہ سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ وہ سخت بدمزہ ہوگئے تھے۔ ''آج کل کی نوجوان نسل راہ سے بھٹکتی جارہی ہے۔ ہر وقت کرینک کالز آتی ہیں شاید اس کوشش میں کہ کوئی لڑکی فون اٹھائے تو وہ فضول باتیں کرسکیں۔ اس ملک کا جانے کیا بنے گا...... تیز رفتاری سے تنزلی کی طرف گامزن ہے......''

بابا کو بے حد افسوس ہوتا تھا لیکن آج وہ سوچ رہی تھی کہ شاید پہلے بھی عالی نے کال کی ہو۔ اور بابا جانی کی آواز سن کر سمجھ نہ سکا ہو کہ کیا کہے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے لیکن اگر ایسا ہے تو وہ کال کیوں کر رہا ہے...... اسے تو جینا سے راہ و رسم بڑھانی ہے۔ اس کے پاس تو انکل جواد کا ایڈریس اور فون نمبر ہوگا پھر ہمارے گھر میں کال کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ سخت کنفیوز تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کوئی گتھی سلجھ کر نہیں دے رہی تھی۔

''ہماری بیٹی کیوں اتنی خاموش ہے...... آج سفر کے دوران چہک نہیں رہی......''

''بابا جان وہ کچھ سوچ رہی ہیں......'' سارا مونگ کے چھلے ہوئے دانے چباتے ہوئے شوخی سے بولی۔

''کیا سوچ رہی ہے؟'' امی جان نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''یہ تو ہمیں پتہ نہیں......'' اس نے شانے اچکائے اور شوخی سے زارا کی طرف دیکھا۔ ابھی زارا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا...... وہ پہاڑی علاقہ کراس کرکے نشیبی علاقوں میں پہنچ چکے تھے۔ ابھی گاؤں پہنچنے میں پورا گھنٹہ تھا۔ تبھی شہری کمزور آواز میں بولا۔

''بابا جانی گاڑی روکیے...... مجھے متلی ہورہی ہے۔''

''کیا ہوا چھوٹے نواب......؟'' بابا جانی نے سائیڈ پر گاڑی روک دی۔

''میرا خیال ہے سب باہر نکل کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرلیں۔ ٹھنڈی ہوا ہے۔ پھوار بھی ہے۔ چھوٹے نواب کی طبیعت ٹھیک ہوجائے گی...... اگر کہو تو لیموں کا رس دوں بیٹا؟''

''دے دیجیے......'' وہ گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ زارا اور سارا بھی باہر نکل آئیں......اور ادھر باہر ٹہلنے لگیں۔ امی جان ایک پتھر پر بیٹھ کر لیموں پانی تھرمس سے نکالنے لگیں......

''اوہ مائی گاڈ...... بابا جانی......ادھر دیکھیے......اتنا سارا پانی''

''اوہ گاڈ! اتنی تیزی سے پانی آرہا ہے۔'' پانی کی چادر کی مانند۔ سب متوحش ہوکر ساکت نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''شاید بڑے دریا کا بند ٹوٹ......بابا جان کو جملہ پورا کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ پانی چیختا چنگھاڑتا کسی دیوہیکل عفریت کی مانند آیا اور سب کو تنکوں کی طرح بہالے گیا......زارا نے ایک کمزور تختے کو ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے سب کو دیکھنے کی کوشش کی۔ آنکھوں میں گھستے پانیوں کی اوٹ سے اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں ہراساں وہ جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھی۔ اپنے جان سے پیارے رشتوں کو کھودینے کے خوف سے وہ بے ہوش ہوگئی...... بے ہوشی میں بھی اسے سارا، شہری اور ماں باپ کے لیے بیٹھتے گلے کے ساتھ چیخنے کا احساس ہورہا تھا۔

......☆......

جانے کتنی دیر کے بعد وہ ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آئی۔ ایک لمحہ کو تو کچھ سمجھ میں نہ آیا......

دماغ خالی تھا۔خالی خالی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا...... وہ ایک بلند چوڑا ٹیلا تھا اور ٹیلے کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ ٹیلے کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا پانی...... پانی کی سطح پر بے شمار چیزیں تیر رہی تھیں۔درخت۔ٹوٹا ہوا فرنیچر۔ٹوٹے ہوئے برتن اور جانے کیا کچھ...... وہ ایک طرف میلی سی چادر پہ لیٹی تھی۔لمحوں میں ہی خود پہ گزری قیامت کی دل فگار یادیں دماغ کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں...... وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی...... سب کی نظروں کا احساس ہوا تو اپنی چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔صبر نہ ہوا تو چیخ پڑی۔ بابا جانی...... شہری...... امی جان...... سارا کہاں ہیں سب؟ کیا ہوا ان کے ساتھ......اوہ میرے خدا کہاں ہیں وہ...... میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ ایک بوڑھی خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''صبر کرو بیٹی...... یہاں سب ایسے ہی ہیں۔ سب کا کوئی نہ کوئی پیارا ان سے بچھڑا ہے۔سب کے دل پہ گھاؤ ہے......صبر کرو...... ایک دوسرے کا دل بہلاؤ......دکھ بانٹو...... پانی اترے گا تو پھر کچھ ہو سکتا ہے...... ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بس صبر ہی اکلوتا راستہ ہے......''

''نہیں......'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب نکل آیا۔ مجھے اپنے بابا جانی کے پاس جانا ہے...... مجھے امی جان کو ڈھونڈنا ہے۔ سارا اور شہری پتہ نہیں کس حال میں ہوں گے مجھے سب کو ڈھونڈنا ہے......''

''تو کیا کرو گی بیٹی؟ کہاں جاؤ گی؟ کیسے جاؤ گی؟؟ یہ چاروں طرف پانی کا طوفان دیکھ رہی ہو اور پھر بارش صبح تک ہوتی رہی ہے۔ابھی لگتا ہے اور بھی ہوگی۔ بادل دیکھو آسمان پہ کیسے بدمست ہاتھیوں کی مانند پھر رہے ہیں۔ کسی بھی لمحے بارش کی توقع ہے......''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بس ان کی خبر مل جائے...... وہ زندہ ہیں یا نہیں...... مجھے تب تک صبر نہیں آئے گا اماں...... میں مر جاؤں گی ماں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو......اگر میں یہاں ہوں تو وہ یہاں کیوں نہیں پہنچے......وہ کہاں گئے......؟''

''بیٹی بہتے پانی کی مرضی ہے کہ وہ کس کو کدھر لے کر جاتا ہے۔ان منہ زور لہروں کے سامنے سب بے بس ہیں......بس دعا کرو اپنے رب کو یاد کرو۔ ان کی خیریت کی دعا کرو......اللہ رحم کرے......''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی...... سر میں درد کا احساس جاگا......شاید سر کسی چیز سے بے ہوشی میں ٹکرا گیا تھا۔ پاؤں پہ کٹ لگا تھا...... بے اختیار اس کی نظر پاؤں پر گئی...... زخم کے ساتھ ہی پائل بھی نظر آ گئی...... اس نے جلدی سے ہاتھ کی طرف دیکھا۔انگوٹھی بھی موجود تھی۔

''اوہ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میری متاع عزیز سلامت رکھی...... پھر خود ہی شرمندہ ہوگئی۔ مجھے معاف کر دینا میرے مولا۔ میری اصل متاع تو میرے پیارے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں...... یہ تو سب آنی جانی چیزیں ہیں۔خدایا انہیں سلامت رکھنا۔''

''بیٹی یہ روٹی کا ایک ٹکڑا ہے کھالو...... پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا پڑے...... زندہ رہنے کے لیے تو ضروری ہے نا''

''نہیں اماں...... میں کچھ نہیں کھا سکوں گی...... مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں بس یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں...... مجھے اپنے عزیزوں کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہے......'' وہ سخت خوفزدہ اور ہراساں تھی...... ان کی خوشگوار زندگی کو پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی تھی۔تھوڑی دیر میں روتے روتے وہ پھر بے ہوش ہو کر ایک طرف کو لڑھک گئی۔

پھر کتنے دن گذر گئے۔ پانی چیونٹی کی رفتار سے اتر رہا تھا۔کوئی مدد کہیں سے نہیں آ رہی تھی۔

سب کے پاس جو تھوڑا بہت موجود تھا وہ ہی آپس میں بانٹ کر کھا لیتے ...... کم سے کم کھاتے تا کہ زیادہ دیر تک لاسٹ کرے۔

زارا کو بخار تھا اماں تجربہ کار تھیں ...... ادھر ادھر سے بوٹیاں اکٹھی کر کے پیس کر اسے دیں۔ دوسرے دن بخار اتر گیا۔ وہ گم سم سی ہو گئی تھی۔ ٹیلے پر موجود کنارے پر ایک بڑے درخت کے تنے کی اوٹ میں چادر اوڑھے پڑی رہتی ...... دل میں کوئی آس کوئی امید نہیں رہی تھی۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی حکومت کی طرف سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔ نہ ہی حکومت کا کوئی نمائندہ دلاسہ دینے آیا ...... سب وقت گزاری کے لیے آپس میں ہنس بول لیتے تھے لیکن اس کے لبوں کو مسکراہٹ چھو کر نہ گزری تھی۔ دل ہر وقت بھرا رہتا آنسو ہر وقت پلکوں کی نوک پر رہتے جیسے ابھی برسے کہ ابھی ...... ٹیلے پر آٹھ دس اور افراد تھے۔ جو اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے لیکن اسے جیسے کسی سے سروکار نہ تھا ہر وقت اپنے پیاروں کی شکلیں آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتیں اور وہ پھر نئے سرے سے آنسو بہانے لگتی۔ دس دن گزر گئے ...... نہ تو کہیں سے کوئی خبر آ رہی تھی اور نہ ہی رسد کا سامان پہنچ رہا تھا۔ تھوڑا بہت جو لوگوں کے پاس تھا وہ بھی ختم ہونے کو تھا ...... سب فکر مند تھے کہ اب کیا ہوگا؟

گیارھویں دن فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی سب کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں ...... شاید مدد آ رہی ہے ...... شاید کھانے پینے کا سامان آ جائے ...... شاید لوگوں کو یہاں سے نکالنے کا کوئی بندوبست ہو جائے لیکن زارا ہر بات سے بے نیاز اسی بڑے درخت کے تنے کی اوٹ میں بیٹھی اپنی بازیب پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔

......☆......

پچھلے سال سیلاب سے بھی حکومت نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مستقبل کے لیے تو کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ اس سال سیلاب میں اور بھی شدت تھی ابھی تو پچھلی بار کے متاثرین واپس اپنے گھروں کو نہیں جا سکے تھے۔ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور دوبارہ تعمیر کی استطاعت نہیں رکھتے تھے حکومت نے زبانی کلامی وعدوں کے علاوہ کچھ نہیں کیا سب ابھی تک کیمپوں میں کسمپرسی کی حالت میں رہ رہے تھے۔ پچھلی بار عالمی امداد کی منصفانہ تقسیم نہ ہو سکی یوں تو عالمی امداد کی منصفانہ تقسیم اس ملک کے لوگوں کی قسمت میں ہی نہ تھی۔ لیکن سیلاب متاثرین کے لیے آئی گئی امداد کی مراعات یافتہ طبقوں کی جیبوں کے علاوہ کہیں نہ جا سکی۔ غریب بے چارہ مزید غریب ہو گیا جسم و جان کا رشتہ استوار رکھنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ مالی امداد کے علاوہ اشیائے ضروریات اور اشیائے خورد و نوش اور نئے خوبصورت خیموں پر بھی خود غرض لوگوں کی رال ٹپک پڑی ...... اور وہ لوگ جن کو ضرورت تھی ان تک یا تو یہ سامان پہنچ ہی نہ سکا یا پھر انہیں پرانی اور بوسیدہ چیزوں پر ٹرخا دیا گیا۔ خوراک کی تقسیم کے معاملے میں بھی بڑی بے قاعدگیاں اور کرپشن کے واقعات سامنے آئے ہر چیز کی قیمت کو بڑھا چڑھا کر لکھا گیا یوں خود غرض طبقے نے اپنا کاروبار خوب چمکایا ...... لیکن یہ نہیں کہ صرف خود غرضیوں کے واقعات ہی سامنے آئے بے غرض لوگوں نے بھی سنہری مثالیں قائم کیں اپنی جیبوں سے پیسے خرچ کر کے مخیّر حضرات نے کھانے کی دیگیں پکوا کر سیلاب زدگان میں تقسیم کیں۔ لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ خوب دھکم پیل ہوئی۔ لائن بنانے اور اپنی باری کا انتظار کرنے کا تو یہاں رواج ہی نہیں ہے۔ کبھی سکھایا ہی نہیں گیا البتہ اس دریا دلی سے کچھ کاہل اور کام چور لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا جو ضرورت مند تو نہیں تھے لیکن مال مفت دل بے رحم کے

مقولے پر عمل کرتے ہوئے کھانے سے خوف مستفید ہوئے۔

لیکن اس سال پچھلے سال کی کارکردگی اور حکومت کی بے حسی دیکھتے ہوئے عالمی برادری کے زیادہ تر ممالک نے مدد سے ہاتھ اٹھالیا اور صاف کہہ دیا کہ اپنے ملک کے اندر سے ہی قدرتی آفات سے نمٹنے کی گنجائش پیدا کی جائے چند ایک ممالک کے سوا کوئی بھی مدد کو نہ پہنچا سیلاب سے متاثرین اس بار اور زیادہ برے حال میں تھے۔ کوئی پرسان حال نہ تھا جو جہاں پھنس گیا تھا کئی کئی دن تک وہیں محصور رہا۔ غیبی امداد کا منتظر رہا۔ اس ٹیلے پر رہنے والے افراد بھی اب مایوس ہو چکے تھے...... کھانے کو کچھ نہ تھا...... پینے کو کچھ نہ تھا اور جن کپڑوں میں بہتے بہتے وہاں پہنچے تھے تن پہ ابھی تک وہی کپڑے تھے۔ زارا کے کپڑے بھی حالات کی مہربانیوں کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے لیکن وہ خود کو بڑی سی چادر میں چھپائے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھلے آسمان کے نیچے پڑی آنسو بہاتی رہتی۔ اس کی جان تو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں میں اٹکی ہوئی تھی کاش کوئی ان کی خبر لا دے مجھے کوئی بتا دے کہ وہ زندہ ہیں تو سکون آئے...... زندہ ہوئے تو ملاقات ہو ہی جائے گی اسے کسی اور چیز کا ہوش نہیں تھا...... اردگرد کے ماحول اور لوگوں سے کوئی مطلب نہ تھا کھانے پینے کی خواہش نہ تھی...... پورے دن میں معمولی سی چیز اس کے منہ میں جاتی جس سے جسم و جان کا رشتہ بحال تھا۔

گیارہویں دن ہیلی کاپٹر عین ان کے اوپر پرواز کے دوران چند پیکٹ پھینک کر چلا گیا...... وہ لوگ چیلوں کی طرح جھپٹتے ہوئے ایک ایک پیکیٹ کے لیے لڑ رہے تھے ایک دوسرے کا منہ نوچ رہے تھے...... لیکن وہ خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے اس چھینا جھپٹی کو دیکھ رہی تھی جب سب نے اپنا اپنا حصہ ہتھیا لیا تو خاموشی چھا گئی...... تھوڑی دیر بعد اماں کچھ چیزیں لیے اس کے پاس آئیں۔ وہ بریڈ کے دو پیس اور پنیر کے دو ٹکڑے...... دو بسکٹ کے پیکٹ تھے اور ایک جوس کا پیکٹ تھا......

''دیکھو بیٹا اس طرح تو گزارا نہیں ہوگا...... میں جانتی ہوں تمہیں اپنے خاندان کی فکر ہے لیکن یوں بھوکا رہنے سے کیا وہ مل جائیں گے تمہیں...... انہیں ڈھونڈنے کے لیے تمہارا زندہ رہنا بھی تو ضروری ہے۔ زیادہ تو یوں بھی ہمارے پاس نہیں ہے بس زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی چیزیں ہیں۔ یقین کرو اگر مجھے امید ہوتی کہ کچھ نہ کھانے سے میرے پانچوں بچے مجھے مل جائیں۔ گے تو میں ایک دانہ بھی حلق سے نیچے نہ اترنے دیتی......''

زارا کی بڑی بڑی آنکھیں بے تحاشا کھل گئیں

''پانچ بچے ...... آپ کے پانچ بچے لاپتہ ہیں؟''

''ہاں بیٹی......'' اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن میں صبر وشکر سے یہاں بیٹھی اوپر والے سے دعا کرتی ہوں...... تم بھی دعا کرو...... تمہارے پیارے یقیناً تمہیں مل جائیں گے...... لیکن اس سے پہلے یہ تھوڑا سا کھالو...... بس زندہ رہنے کے لیے جتنا ضروری ہے۔''

زارا نے بمشکل پنیر کا ایک ٹکڑا بریڈ کے ساتھ کھایا...... جو حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا...... پانی موجود نہیں تھا اور جوس کا پیکٹ وہ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی...... اس نے بے بسی سے چاروں طرف کھڑے پانی کی طرف دیکھا۔ سبز آلودہ غلیظ بیماریوں سے بھرا پانی

Water water every where but
not a drop to drink

''بیٹا ...... تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو...... اس دنیا میں وحشیوں

کی کمی نہیں ہے۔اس لیے غم میں اتنی بے خبر نہ رہا کرو اردگرد اسے...... چوکنی رہو۔اپنی حفاظت تمہیں خود ہی کرنی ہے...... ورنہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے...... وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی اصلیت دکھانے سے باز نہیں آتی...... یوں تو میری نظر ہر وقت تم پر رہتی ہے ......تم میری بیٹی راشدہ کی طرح ہو...... میں تمہاری حفاظت کروں گی تو خدا میری بیٹی پہ بھی مہربانی کرے گا۔''

زارا دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی......

یہاں تو سب ہی دکھی تھے...... ہر کسی کا کوئی پیارا بچھڑ گیا تھا...... لیکن وہ کتنی خودغرض بن رہی تھی...... اس نے تو کسی کی طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ کسی کا غم جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس خود ترسی کا شکار ہوتے ہوئے اپنے بارے میں سوچتی جارہی تھی۔ لیکن وہ اس اجاڑ بیابان کی مانند جگہ پر چند اجنبیوں کے درمیان رہ کر کیا کرسکتی ہے۔ جہاں کسی کی مدد کے لیے کوئی چیز میسر نہیں تھی......

ہمدردی کے دو بول بھی بعض اوقات معجزہ دکھادیتے ہیں۔ دل جیت لیتے ہیں روح پہ چھائے ہوئے بوجھ کو ہلکا کردیتے ہیں نئے سرے سے جینے کی امنگ پیدا کردیتے ہیں...... لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی بھی بات کرنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا ...... کچھ سوچتی تھی تو آنسو آنکھوں کو دھندلا دیتے تھے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ درخت کے تنے سے لپٹ لپٹ کر روئے...... کاش کوئی کشتی کسی طرح تیرتی ہوئی آئے اور وہ اس پر سوار ہوکر بابا جانی اور باقی سب کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہو۔ ہوسکتا ہے وہ بھی میری طرح کسی دوسری ایسی جگہ پر محصور ہوکر رہ گئے ہوں اور میرے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہورہے ہوں۔

''خدایا...... ان کا درد کم کردے...... انہیں سکون عطا فرما...... اور انہیں جلدی مجھ سے ملادے۔''

دعائیہ کلمات نے اس کی زبان کا ساتھ نہ چھوڑا...... دعا ہی ہر مصیبت کا حل ہے۔ دعا ہی غیر ممکن کو ممکن میں تبدیل کرسکتی ہے...... وہ بے تحاشا روتے ہوئے پھر سے دعاؤں میں مشغول ہوگئی۔

......☆......

کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آبیٹھے...... عذرا اور جہانگیر چائے پی رہے تھے جبکہ عالی کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔فری اور زیبی کارپٹ پر بیٹھے بورڈ گیم سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

''امی آپ جانتی ہیں ناپاکستان میں آج کل شدید قسم کا سیلاب آیا ہوا ہے......''

''ہاں بیٹا خبریں سنتی رہتی ہوں۔ لوگوں کی کسمپرسی دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے یوں بے یارومددگار پڑے ہیں اور حکومت خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے کسی کو پرواہ ہی نہیں......''

''ویل...... امریکی حکومت مختلف ضروریات کے سازوسامان کے ساتھ ڈاکٹرز کی ایک ٹیم بھی بھیج رہی ہے۔ کافی ساری میڈیسنز بھی ساتھ جائیں گی۔ آپ کو تو پتہ ہے سیلاب کے بعد ڈائریا، کالرہ، ملیریا اور بہت خراب قسم کی بیشمار بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں...... پہلے میں ریڈنسی پروگرام میں تھا جو بہت سخت قسم کا ہوتا ہے۔ چھوٹی ملنی مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہوتی ہے لیکن اب میری ریذیڈنسی مکمل ہوچکی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس ٹیم میں میں بھی شامل ہوں۔

''ارے......'' عذرا نے کپ میز پر رکھ دیا''تم پاکستان جارہے ہو......؟''

''ہاں امی...... ازاٹ اوکے......؟ وہ حیران ہوا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹا......'' جہانگیر نے خوشی سے کہا''تم نہیں جانتے لوگ کتنے دکھی اور مجبور ہیں وہاں...... دکھی انسانیت کی خدمت کرنا بھی عبادت ہے اور مجھے فخر ہے کہ تم یہ خدمت نبھانے

جارہے ہو......"

"کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا وہاں....." عذرا پریشان ہوئیں "آپ جانتے ہیں آج کل دہشت گردی عام ہے وہاں۔"

"دیکھو بیگم...... میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ موت کا ایک وقت معین ہے وہ جہاں اور جس وقت لکھی ہے وہاں آ کر رہے گی اور تم اتنے بہادر بیٹے کی ماں ہو کر یوں گھبرا رہی ہو؟ حیرت ہے......!!"

عذرا کی آنکھیں بھیگ گئیں...... جہانگیر کچھ دیر چپ رہے۔

"ہم یہاں آ کر سیٹل تو ہو گئے ہیں بیٹا...... لیکن دل وہیں اٹکا رہتا ہے۔ اپنی جڑیں کوئی بھول سکتا ہے بھلا...... اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم بھی اسی مٹی کی پیداوار ہو اس کا حق ہے تمہارے اوپر...... اور اگر تمہیں یہ حق لوٹانے کا موقع مل رہا ہے تو اسے گنوانا نہیں...... میں تو بہت دکھی ہوتا ہوں وہاں کے حالات سن کر...... کاش میں وہاں کے امن وسکون کے لیے کچھ کرسکتا...... تم ضرور جاؤ بیٹا...... ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ کیوں بیگم؟"

"کیوں نہیں...... دعائیں تو یقیناً عالی کے ساتھ ہیں...... بیٹا دل سے وہاں غربت کے مارے مظلوم لوگوں کی مدد کرنا...... ہمارا سر فخر سے بلند کرنا......"

فری اور زیبی گیم چھوڑ کر قریب آ گئے۔

"بھائی آپ پاکستان جارہے ہیں......؟"

"کیوں آپ دونوں کا بھی ارادہ ہے؟"

عالی مسکرایا

"ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ جارہے ہیں تو وہاں جا کر پلیز پلیز بھابی کو ضرور ڈھونڈنا......"

عالی کا رنگ ایک لمحے کے لیے پھیکا پڑ گیا...... وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر زبردستی مسکرایا۔

"تم دونوں دعا کرنا میرے لیے کہ تمہاری بھابی مل جائیں۔"

"آپ کی فلائٹ کس دن ہے بھائی؟"

"کل ہی ہے...... کیونکہ حکومت خود سب انتظام کررہی ہے اس لیے اسپیشل پلین ہمیں لے کر جا رہا ہے......"

'امی ابو پلیز میرا بیگ تیار کردیں...... ورنہ میں کوئی ضروری چیز بھول جاؤں گا۔"

"وہاں جواد کی طرف بھی جاؤ گے......؟"

"مشکل ہے ڈیڈی...... کام بہت زیادہ ہوگا۔ سارا وقت بہت زیادہ مصروف رہیں گے...... وہاں کی افواج اس موقع پر لوگوں کی ہیلپ کررہی ہیں۔ زیادہ تر ریسکیو ورک کو ہی انجام دے رہی ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر جگہ جگہ جانا ہوگا۔ ہمارے ہیلی کاپٹرز...... وہاں آس پاس بحری بیڑے سے ہمیں جوائن کریں گے۔ ان ہی کی مدد سے ہر جگہ جانا ہوگا ورنہ ہر طرف پانی کی سطح بہت بلند ہے۔ پانی بہت آہستہ آہستہ اتر رہا ہے اور بے شمار جگہوں پر لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ آج ہی آفیسرز نے ہمیں پوری طرح بریفنگ دی ہے کہ ہمیں کس طرح اپنا آپریشن جاری رکھنا ہے......"

"تو پھر تم اسلام آباد نہیں جاؤ گے......؟"

"نہیں امی...... وہاں ہماری ضرورت نہیں ہے۔ وہ بلند علاقہ ہے وہاں پانی رکتا نہیں۔ پانی کی نکاسی کا اچھا انتظام ہے۔ ہمیں زیادہ تر نشیبی میدانی علاقوں کی طرف جانا ہوگا...... زیادہ سامان نہیں رکھیے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو وہیں سے لیا جاسکتا ہے۔"

"جیسے تم مناسب سمجھو بیٹا......" وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

رات کو جب وہ سونے لگا تو فری اور زیبی اس کے کمرے میں آ گئے

"بھائی۔ اگر بھابی کہیں نظر آ گئیں تو ہماری

طرف سے یہ گفٹ انہیں دے دیجیے گا۔‘‘
عالی نے دیکھا وہ ایک رنگ اسٹینڈ تھا نیچے بیس پہ خوبصورت سیٹ بنا تھا جس کے اوپر خوبصورت پھول نقش کیے گئے تھے۔ درمیان سے رنگ ڈالنے کے لیے ایک لمبی باریک سلاخ تھی جو ہیٹ کے درمیان سے اوپر کو جاتی تھی...... وہ بے اختیار مسکرا دیا...... اور گفٹ بیگ میں ڈال دیا...... ساتھ ہی میز کی دراز کھول کر پازیب نکالی اور اسے بھی بیگ میں ڈال دیا۔

پورے سفر کے دوران وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ابھی کوئی پندرہ روز ہوئے اس کی آواز سنی تھی...... کانوں میں جیسے رس گھل گیا تھا۔ لیکن اس کے ایک دم ریسیور رکھ دینے سے اس کے دل میں کیسے کیسے خیالات آئے تھے۔ وہ کس قدر مایوس ہوا تھا۔

اس سے پہلے کئی بار کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک دوست نے بتایا تھا کہ اگر گھر کا ایڈریس ہے تو فون نمبر معلوم ہوسکتا ہے۔ اسی دوست نے نمبر معلوم کر کے اسے بتایا تھا کئی روز تک وہ کال ہی نہ کرسکا۔ ایک تو ڈیوٹی سخت تھی۔ زیادہ تر ہاسپٹل میں ہی رات گزر جاتی۔ دوسرے وہاں دن ہوتا تو یہاں رات اور وہاں رات ہوتی تو یہاں دن۔ پورے بارہ گھنٹے کا ٹائم ڈفرنس تھا۔ پھر کافی مدت کے بعد صحیح ٹائم میسر آیا تو زیادہ اس کے فادر فون ریسیو کرتے۔ اسے سمجھ نہ آتی کہ ان سے وہ کیا کہے یوں بھی ان سے وہ بات کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔

یہ پہلی بار تھی زارا نے فون اٹھایا تھا کئی لمحوں تک تو اسے یقین ہی نہ آیا...... وہ گم سم کھڑا رہا...... اور پھر اس کی پیاری آواز سنائی دی۔

’’کیا آپ بابا جانی کے دوست ہیں...... نام بتائیے پلیز‘‘
اس نے اپنا نام لیا تو اب دم بخود ہونے کی باری دوسری طرف تھی۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا ...... شاید وہ گھبرا گئی تھی...... شاید وہ Panic کا شکار ہوگئی...... اسی لیے جلدی سے فون کاٹ دیا...... لیکن آج وہ اتنا سنہری موقع مس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کسی قیمت پر نہیں...... لیکن دوسری بار کسی چہکتی آواز نے فون اٹھایا...... تھوڑی سی شرارت پر مائل...... اور کافی زیادہ بولڈ...... اپنا تعارف بھی کروا دیا اور پھر چھٹیوں سے واپسی کے بعد بات کرانے کا وعدہ بھی کرلیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ریسیور رکھنے کے بعد سارا نے زارا کو خوب چھیڑا ہوگا ...... خوب تنگ کیا ہوگا...... وہ سوچ کر ہی زیر لب مسکرا دیا۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں عنان اقتدار تھا۔ اختیار تھا۔ ان کی بے حسی کا وہی عالم تھا۔ روزانہ پریس کانفرنسیں ہوتیں...... بلند بانگ دعوے کیے جاتے۔ جھوٹے وعدے کیے جاتے لیکن اپنی مٹھی گرم کرنے کے علاوہ کسی نے کچھ نہیں کیا...... لوگ اسی طرح مدد کے منتظر رہے۔ افواج پاکستان لوگوں کو محصور جگہوں سے نکال رہی تھیں۔ جہاں سیلاب نہیں آیا تھا لیکن ان کے رشتے دار مشکل میں تھے ناقابل پہنچ جگہوں پہ محصور تھے۔ کھانے اور پینے کی چیزوں سے محروم تھے۔ وہ سڑکوں پر نکل کر پرزور احتجاج کررہے تھے۔ روزانہ سڑکوں پر ٹائر جلائے جاتے۔ عمارتوں پر پتھراؤ ہوتا۔ گاڑیاں جلائی جاتیں۔ لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ الیکٹرونک میڈیا اپنا کام کررہا تھا۔ بے شمار ٹاک شوز تھے جن میں لوگ آتے۔ بحث و مباحثہ کرتے اور چلے جاتے۔ اس سے غریبوں کی صحت پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں تھا...... ان ٹاک شوز میں اکثر لڑائی جھگڑا۔ گالم گلوچ اور ہاتھا پائی بھی ہوجاتی۔ سب کچھ ہورہا تھا لیکن اصل مسئلے کی طرف کوئی نہیں آرہا تھا کوئی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ مستقبل کی منصوبہ

پُراسرار کہانی نمبر

'سچی کہانیاں' کا شمارہ اکتوبر 2017ء پُراسرار کہانی نمبر ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی، جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔

جناتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اِس پُراسرار نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی، روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ اور خصوصی کہانیاں بھی اِس کا حصہ ہوں گی۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں

بندی کیوں نہیں کی گئی اور آئندہ بھی ہوگی یا نہیں کیونکہ قدرتی آفات تو آتی رہتی ہیں۔انسان کی بد اعمالیوں کے نتائج میں ایسا سب کچھ تو ہوتا رہے گا۔ سیلاب آئیں گے۔کبھی خشک سالی آئے گی، قحط پڑے گا، زلزلے آئیں گے۔عالی حیران تھا کہ یہ کیسا ملک ہے کیسے لوگ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔کوئی کام سسٹم کے تحت نہیں ہو رہا تھا۔بلکہ کوئی کام ہی نہیں رہا تھا۔حکومت جانتی تھی کہ آہستہ آہستہ پانی اتر ہی جائے گا۔لوگ گھروں میں جانے پر مجبور ہوں گے۔وہاں کیا ہوگا ان کے ساتھ کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ اوپر سے گرمی، مچھر اور قیامت کی لوڈ شیڈنگ۔

عالی حیران تھا کہ سارا نظام کیسے چل رہا ہے ۔کسی کے پاس دردمند دل کیوں نہیں۔میڈیکل ٹیم نے آتے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ایک دن میں کئی محصور لوگوں کو نکالتے۔ہاسپٹلز میں ایمرجنسی نافذ تھی ، جو لوگ زخمی تھے انہیں ہسپتال پہنچاتے ورنہ باقی لوگوں کو کیمپ لے جاتے جو مختلف اسکولوں میں قائم کیے گئے تھے۔یہ سب کرتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی اس کے دل سے زارا کا خیال نہیں نکلا تھا۔جیسے ہی اس کا خیال آتا دل بے اختیار دھڑکنے لگتا۔کبھی کبھی منفی سوچیں بھی گھیر لیتیں۔خدا جانے وہ کہاں ہوگی......؟ کیا وہ کبھی مل سکے گی۔اگر پانی کے کسی خوفناک ریلے کے ساتھ بہہ کر وہ ایسی جگہ چلی گئی جہاں سے وہ اسے کبھی تلاش نہ کر سکا تو......؟ نہیں......وہ بے چینی سے فوراً ہی اس خیال کو سختی سے جھٹک دیتا۔ایسا ممکن نہیں ہے۔اس کی زندگی کی سانسیں تو عالی کے دل کے تاروں کے ساتھ جڑی تھیں۔اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو عالی کو فوراً پتہ چل جاتا......لیکن اتنے دن ہو گئے تھے اتنے لوگوں کو ان دونوں نے بچایا تھا۔ہسپتال پہنچایا تھا ......آخر وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔اس کے والدین کہاں تھے؟ وہ تو انہیں پہچانتا بھی نہ تھا۔ہو سکتا ہے اس نے ان کو بھی ہسپتال یا کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیا ہو۔ لیکن اسے علم نہ ہو۔جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی بے چینیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔کتنے ہی گاؤں انہوں نے کھنگال ڈالے تھے۔ایک وسیع علاقہ کور کیا تھا لیکن زارا اور اس کے والدین کا پتہ نہ چل سکا۔اس کی مایوسی بڑھنے لگی تھی۔

پانی کی سطح اتنی بلند ہو چکی تھی کہ زمین کا بڑا حصہ زیر آب آ گیا تھا۔کہیں کہیں وہ علاقے جو ذرا اونچے تھے وہ چھوٹے ٹیلوں کی صورت میں نظر آتے تھے۔وہ بھی زیادہ بلندی سے دیکھے نہیں جاتے تھے۔پھر بھی وہ دن رات محنت کر رہے تھے آج کل تو وہ عین اس علاقے میں تھے جہاں اسے زارا کے والدین کے ملنے کی بہت امید تھی......زارا کی نانی جان کے گاؤں سے کئی کئی میل کا علاقہ کور کرنا تھا کیونکہ پانی کے طاقت ور ریلے تو منٹوں میں انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

مائیک اور وہ سارا دن تلاش کا کام جاری رکھتے۔جہاں مدد کی ضرورت ہوتی مدد کرتے اور پھر اپنے مشن پر نکل جاتے۔کئی روز گزر گئے روزانہ رات کو وہ مایوس اپنے بستر پر لیٹتا سر کے نیچے بازو رکھے زارا کے بارے میں سوچتا رہتا۔کبھی اٹھتا اور اپنے سامان میں سے اس کی پائل نکال کر اپنی انگلیاں نرمی سے اس پہ پھیرتا۔

''کہاں ہو تم......؟ کہاں گم ہو گئی ہو......
مجھے راستہ دکھاؤ......کسی طرح مجھ سے رابطہ کرو......
ہمارا تو دلی تعلق ہے......اپنے دل سے ہی میرے دل کو پیغام بھیجو......'' اور پھر وہی پائل اپنی مٹھی میں دبا کر سو جاتا......

پھر انہیں کامیابی مل گئی۔زارا کے والدین ایک کیمپ میں مل گئے وہ اپنے مریضوں کو چیک کرنے اور انہیں دوبارہ فوڈ پیکٹس پہنچانے گئے تھے جب اس چھوٹی سی فیملی کی گفتگو اور ناموں سے اس

نے ان کو پہچان لیا۔ سارا کو وہ بہانے سے دوسری طرف لے گیا۔

''تم سارا ہو...... زارا کی بہن؟''

زارا کے نام پر سارا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں گرنے لگیں......

''میں عالی ہوں...... عالمگیر...... ڈاکٹر عالمگیر...... امریکہ سے مدد کرنے آیا ہوں حکومت کی طرف سے......''

''تو پھر آپ زارا کو ڈھونڈ دیں نا...... پلیز ڈاکٹر صاحب ہماری مدد کریں، امی جان اور بابا جان تو مر جائیں گے اگر زارا نہیں ملی تو...... پلیز میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ ہمیں زارا کو ڈھونڈ دیجیے...... ہم سب اس کے بغیر نہیں رہ سکتے...... پلیز عالی بھائی......''

''بھائی کہا ہے نا...... تو بھروسہ بھی کرو...... میں ہر قیمت پر اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے...... تم سے بھی اور اپنے آپ سے بھی......'' وہ مستحکم لہجے میں بولا

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا......؟'' اتنے دن ناامیدی کی کشتی میں ہچکولے کھاتی سارا کو یقین نہیں آ رہا تھا......

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا سارا...... تم بس دعا کرو...... اور بہت زیادہ کرو۔''

''امی جان اور بابا جانی سے ملیں گے......؟''

''ابھی نہیں...... میں زارا کے ساتھ انہیں ملنا چاہوں گا...... خوشخبری کے ساتھ ان کے پاس جانا چاہوں گا......''

''پلیز جلدی کریں...... امی جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے وہ اس کیمپ سے کسی قیمت پر نہیں جانا چاہتیں...... حالانکہ ہم آسانی سے اسلام آباد جا سکتے ہیں اور وہاں بھی انتظار کر سکتے ہیں جیسے یہاں کر رہے ہیں لیکن امی جان زارا کے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتیں......''

''ٹھیک ہے...... بس آپ لوگ یہیں رکنا...... کیا پتہ میں کس وقت زارا کو لے کر آ جاؤں......''

عالی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ تو سارا بھی اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

......☆......

دو روز اور گزر گئے پانی کافی نیچے ہو رہا تھا۔ جہاں پانی پہلے سے کم تھا...... وہ خشک ہوا تو بیماریاں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ ہیضہ، گیسٹرو اور ملیریا کے علاوہ بہت سی بیماریاں تھیں...... سارا دن وہ مصروف رہتے۔ اندھیرا ہوتا تو اپنے ٹھکانے پر آ کر آرام کرتے۔ اندھیرے میں کام یوں بھی مشکل تھا اور آخر انہیں بھی آرام کی ضرورت تھی ورنہ کام کیسے کرتے؟ عالی کے دل کا عجیب عالم تھا روزانہ ماں باپ اور بہن بھائی سے بات ہوتی تو وہ روزانہ زارا کے بارے میں پوچھتے۔ اور انکار میں جواب دیتے ہوئے اس کا دل بیٹھ جاتا۔ وہ روزانہ اسے دوبارہ تسلیاں دیتے اور وہ پھر پائل سے دل بہلاتا اور سو جاتا۔

اگلا دن بھی اسی طرح مریضوں کی دیکھ بھال میں گزرا۔ مریض زیادہ ہونا شروع ہو گئے تھے...... پانی اترنے کے ساتھ بیماریاں بڑھنے لگی تھیں...... لوگوں کے گھر تباہ ہو چکے تھے۔ ضروریات بھی زیادہ ہوتی جا رہی تھیں...... عالی اور مائیک اپنا کام کرتے رہتے۔

عالی تو اپنے ملک کی ایسی حالت پر خون کے آنسو روتا...... حکومت کو کسی چیز کا زیادہ احساس نہیں...... بس بیانات دینا۔ بڑے بڑے وعدے کرنا...... پوری فوج کے ساتھ دورہ کرنا اور واپس لوٹ جانا...... ایسے میں اسے اپنی فوج پر فخر محسوس ہوتا۔ فوج نے ذرا سی بھی کوتاہی نہیں برتی تھی۔ دن رات خود بھی محنت کی تھی اور مائیک اور عالی کو بھی ہر

ممکن مدد فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب صورت حال بدل رہی تھی۔ اب پانی سے زیادہ لوگوں کی ضروریات منہ کھولے مدد کی منتظر کھڑی تھیں سیلاب کے بعد اثرات بہت زیادہ خطرناک تھے۔ سارے کیمپس میں لوگ بیمار پڑ رہے تھے۔

تقریباً سب ہی کو اس سچویشن میں میڈیکل کیئر کی ضرورت تھی۔ اپنی ٹیم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے وہ فوج کے ساتھ مختلف جگہوں پر جاتے۔ ان کو ضروریات زندگی مہیا کرتے۔ میڈیکل چیک اپ کرتے، دوائیاں دیتے اور ساتھ ساتھ تسلیاں بھی دیتے جن کو ریسکیو کی ضرورت ہوتی۔ فوج نے ان کے لیے اپنی ٹیم بھی بنا رکھی تھی۔ عالی کے ساتھ اس وقت مائیک تھا۔ شروع سے دونوں نے ساتھ کام کیا تھا۔ دونوں میں دوستی بھی تھی۔ انہیں یہاں آئے پانچ دن ہو چکے تھے اور اس عرصے میں وہ ہزاروں لوگوں کو میڈیکل کی سہولتیں فراہم کر چکے تھے۔ آج بھی انہیں اگلے پڑاؤ کی طرف جانا تھا۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر اڑا رہا تھا اور وہ دونوں دوربینیں ہاتھ میں لیے آنکھوں پہ لگائے چاروں طرف دیکھ رہے تھے......

اچانک ہی عالی کو عجیب سا احساس ہوا...... دل یک لخت دھڑکنے لگا...... یوں جیسے اس میں زندگی کی انوکھی لہر دوڑ گئی ہو...... لہو گرم ہو رہا ہو...... سانسوں کے ساتھ بندھی کوئی ڈور اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو...... اس نے دوربین سے بغور ہر سمت دیکھا پائلٹ کو ہیلی کاپٹر تھوڑا نیچے لانے کا آرڈر دیا...... اور آنکھوں پہ پھر دوربین لگالی...... وہ ایک چوڑا ٹیلہ تھا...... اور کوئی نقطہ سا سفید کپڑا لہرا رہا تھا...... جوں جوں ہیلی کاپٹر نیچے آ رہا تھا وہ ٹیلا اور اس کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔

''مائیک یہاں لوگ ہیں...... انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ ہمیں سفید کپڑا لہرا کر بلا رہے ہیں......'' اس نے انگلش میں مائیک سے کہا

''اوکے...... پائلٹ آئی تھنک وی نیڈ ٹو گیٹ دیر۔''

پائلٹ نے ہیلی کاپٹر نیچے اتارا...... لوگوں نے سائیڈ پر ہو کر درمیان میں اس کے لیے جگہ بنا دی...... تیز رفتار ہوا کے درمیان ہیلی کاپٹر اترا...... لوگ بھاگ کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے...... ان کی شکلوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھوکے ہیں...... بیمار ہیں اور انہیں کسی مورل سپورٹ کی سخت ضرورت ہے۔

''مائیک پہلے خوراک کے پیکٹ نکالو...... دے آر سٹاروِنگ......''

مائیک نے پائلٹ کی مدد سے سامان نکالا۔ وہ عجیب سا احساس ابھی تک عالی کے ساتھ تھا۔ لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیوں ہے...... اس کا دل کیوں اس انداز سے دھڑک رہا ہے...... زندگی اور روشنی کا احساس کیوں انگ انگ میں بجلیاں بھر رہا ہے۔ سب میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ سب نے بے صبری سے بھوک سے بے حال انسان کی طرح پیٹ بھرا...... پھر عالی نے فولڈنگ چیئر اور میز درمیان سیٹ کیا اور اس کے اوپر دوائیاں سجا دیں۔

''اب سب کا چیک اپ ہوگا...... اگر کوئی خود کو زیادہ بیمار محسوس کر رہا ہے تو وہ پہلے آ جائے......''

عالی اور مائیک نے سب کو چیک کیا...... دوائیاں دیں...... جس کو انجکشن کی ضرورت تھی اسے انجکشن لگایا...... وہ جیسے ٹرانس کی حالت میں تھا کوئی سایہ ساتھ ساتھ تھا...... اور وہ خود حیران تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

''کوئی رہ تو نہیں گیا...... سب کو کھانا اور دوا مل گئی؟'' عالی نے جانے کیوں پوچھنا ضروری سمجھا ایک بوڑھی اماں قریب آئی۔

''بیٹا...... وہ خود سے کچھ نہیں کہے گی...... کھانا لینے کبھی نہیں آئے گی...... دوا کی بھی اسے پروا نہیں ہے لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے جب

سے یہاں پہنچی ہے رو رو کر اس کا برا حال ہے کچھ کھاتی نہیں...... کچھ بولتی نہیں...... بس اپنے پیاروں کے لیے روتی رہتی ہے...... آج تو مجھے لگ رہا ہے اسے بخار بھی ہے۔ لیکن وہ اپنی مخصوص جگہ سے نہیں اٹھ رہی۔ میں نے بہت منتیں کیں کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں کچھ کھالو یا کم از کم دکھا ہی دو۔ ڈاکٹر دوا دے گا تو ٹھیک ہو جاؤ گی لیکن......

عالی ایک ٹک ساکت اماں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوئی سانس بے ترتیب ہوئی۔

''کس کی بات کر رہی ہیں اماں؟'' وہ بمشکل پوچھ سکا۔

''میں اس کا نام نہیں جانتی مگر بہت پیاری بچی ہے اپنی فیملی سے بچھڑ گئی ہے...... وہ دیکھو اس درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہے......''

عالی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ میرون بڑی سی چادر میں لپٹی وہ کوئی گٹھری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اٹھا اور بے اختیار ادھر کھنچتا چلا گیا...... اس نے پوری طرح خود کو لپیٹ رکھا تھا...... کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا...... سوائے ایک پاؤں کے شاید چادر ہر چیز کو ڈھانپنے کے لیے ناکافی تھی۔ اور پاؤں پہ ٹخنے سے جھلکتی وہ ایک چھوٹی سی چیز چمکتی دیکھ کر عالی جیسے پتھر کا بن گیا...... اس کی نظریں اس پھول پہ جم کر رہ گئیں جو شاید کسی پائل کا حصہ تھا...... پوری حسیات سمٹ کر جیسے آنکھوں میں آ گئیں......

وہ کوشش کے باوجود نظریں نہ ہٹا سکا...... قدم زمین سے جم کر رہ گئے۔

''بیٹی...... دیکھو تو ڈاکٹر خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے...... پلیز کچھ کھالو اور دوا لے لو...... لیکن اس گٹھری میں جنبش نہ ہوئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر دیکھا...... وہ درخت کے ساتھ یوں لگی بیٹھی تھی جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو۔

''یہ تو شاید بے ہوش ہو گئی ہے...... ڈاکٹر تم ہی کچھ کرو...... مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......''

عالی نے آگے آنے کے لیے قدم بڑھائے

''نہیں...... میرے سامنے نہیں آئیں پلیز میرے سامنے نہیں آئیں......''

وہ منہ گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... عالی نے بے بسی سے اماں کی طرف دیکھا...... لیکن اس آواز کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی سماعت میں جم کر رہ گئی تھی۔

''اماں پلیز آپ ذرا ہمیں تنہا چھوڑ دیں...... میں ان کو سمجھا لوں گا۔''

اماں چلی گئیں تو عالی نے دکھ سے اسے دیکھا۔

''زارا...... ادھر دیکھو میری طرف...... پلیز ایک بار...... تھوڑی دیر کے لیے۔''

''نہیں...... میں نہیں دیکھ سکتی......'' وہ بڑی مشکل سے دھیمی آواز میں بولی۔

''کیوں...... کیوں نہیں دیکھ سکتیں۔''

''میری شکل رو رو کر خراب ہو چکی ہے۔ میں نے پورے پندرہ دن سے کپڑے نہیں بدلے۔ منہ نہیں دھویا...... میرے بال مٹی سے اٹے ہیں۔ جڑے ہوئے ہیں میں آپ کے سامنے نہیں آ سکتی۔''

''تم جانتی ہو...... میں کون ہوں؟'' وہ بے انتہا نرمی اور پیار سے بولا...... تم اس حالت میں بھی میرے لیے دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو...... مجھے تمہاری حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا......''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کسی کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

''اچھا نہ آؤ میرے سامنے...... لیکن یہ تھوڑا سا کھانا کھالو اور یہ ٹیبلٹ لے لو...... پلیز...... میری خاطر......''

''آپ کی خاطر کیوں؟ آپ کون ہیں

میرے؟'' وہ اس وقت بخار کی شدت میں ہوش وخرد سے بیگانہ لگ رہی تھی۔

''میں کچھ نہ سہی...... لیکن اگر تم اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ملنا چاہتی ہو تو تمہیں خود کو ٹھیک رکھنا ہوگا نا...... ورنہ اگر تم بخار سے بے ہوش رہیں تو ان سے کیسے ملو گی؟'' وہ لہجے میں دنیا بھر کا پیار سمیٹ کر بولا...... جبکہ اذیت اور دکھ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا...... وہ ایک دم پلٹ کر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں...... بخار کی شدت سے گلابی چہرہ۔ پپڑی زدہ ہونٹ اور آنکھوں میں ان کہی وحشت۔

اس نے ایک دم عالی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے...... وہ پوری جان سے کانپ گیا۔ تمام جسم میں برقی رو دوڑ گئی...... وہ حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا

''آپ مجھے لے چلیں گے نا بابا جانی کے پاس...... سارا اور شہری کے پاس۔ امی جان کے پاس...... آپ چلیں گے وعدہ کریں انہیں ڈھونڈ دیں گے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی ان کے بغیر...... آپ مجھے ان کے پاس لے چلیں پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں...... وہ ایک دم بے ہوش ہو کر گرنے لگی۔ عالی نے کسی متاع عزیز کی طرح اسے تھام لیا اور کسی شیشے کی نازک چیز کی مانند آہستہ سے گھاس پر لٹا دیا...... اس کے پھٹے لباس کو اس کی چادر سے ڈھانپ دیا۔

''مائیک انجکشن لاؤ جلدی سے۔''

عالی نے اسے انجکشن دیا اور پھر بہت احتیاط سے اسے ڈرپ بھی لگادی۔ وہ کچھ کھا نہیں رہی تھی اس لیے ڈرپ لگانی ضروری تھی...... اس سے فارغ ہو کر کتنی دیر اس کے کمزور چہرے کے محبوب ترین نقوش کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتا رہا...... کتنا انتظار کیا تھا اس کا...... کتنا سوچا تھا اسے تصور ہی تصور میں اس سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ دل کی باتیں بھی کی تھیں۔ لیکن آج عزیز ترین ہستی کا وجود سامنے دیکھ کر اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ ایک لمحے بھی اس کے پاس سے نہیں اٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے مائیک کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ یا کمزوری سے غنودگی کے عالم میں تھی۔ لیکن عالی کی بیقراریوں کو ضرور قرار آ گیا تھا۔ وہ کبھی اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر اس کا لمس محسوس کرتا۔ کبھی اس کی پائل پر نرمی اور محبت کے ساتھ انگلیاں پھیرتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہلکا سا کسمسائی...... پھر دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے عالی کا چہرہ تھا۔ اس نے بھی تو ہر لمحہ اس چہرے کو تصور میں سجایا تھا...... اس کی آنکھیں اس محبوب چہرے پر جم سی گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ نظریں ہٹا نہ پائی...... یہ اختیار میں کب تھا اس کے...... عالی دھیرے سے مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر اچانک ہوش میں آئی تو اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے سامنے یوں لیٹنا ناممکن تھا۔ فوراً اٹھ بیٹھی۔

''آپ مجھے بابا جانی کے پاس لے جائیں گے نا؟'' اس کی آنکھوں میں بھی سوال تھا۔

''کیوں نہیں...... لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے؟'' عالی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے......'' کمزوری کی وجہ سے وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

''سوچ لیجیے...... کہیں شرط کڑی نہ ہو......'' وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

''آپ پوچھیے تو......''

''آپ کو میرا نام بتانا ہوگا......'' عالی مسکرایا تو زارا کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ کیا وہ اس پوزیشن میں تھی کہ اسے کوئی امید دلاتی

''لیکن میں تو آپ کا نام نہیں جانتی...... آپ قطعی اجنبی ہیں میرے لیے......'' زارا نے جھوٹ بولا۔

عالی نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں اذیت اور بے یقینی جھلکنے لگی۔ وہ بے انتہا سنجیدہ ہو گیا...... چہرے پر سایہ سا لہرا گیا...... نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

''ٹھیک ہے میں نے سب پتہ کرلیا ہے۔ آپ کے ماں باپ اور بہن بھائی کرالا کیمپ میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک ریسکیو ٹیم آئے گی۔ میں نے انتظام کردیا ہے کہ وہ آپ کو آپ کے ماں باپ کے پاس پہنچادے'' اس کے چہرے پہ جیسے زلزلوں کے آثار تھے۔ درد کی ناقابل بیان کیفیت تھی۔

زارا رہ نہ سکی...... وہ اسے اتنا دکھ نہیں دے سکتی تھی...... بے اختیار نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا کیونکہ وہ جانے ہی والا تھا...... اس نے پلٹ کر سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا

''کوئی اور بات ہے کیا......؟''

''ہاں...... عالی...... میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں...... آپ سے ملنے کے بعد میری زندگی میں کوئی لمحہ نہیں آیا جب میں نے آپ کو یاد نہ کیا ہو...... لیکن فکر نہ کریں۔ میں اتنی خود غرض نہیں ہوں میں آپ لوگوں کے راستے میں نہیں آؤں گی...... میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں آپ سے......''

وہ ایک دم چپ ہوگئی...... یہ وہ کیا کہنے جارہی تھی۔ اسے اقرار نہیں کرنا چاہیے ورنہ مشکل ہوجائے گی۔

''کیا...... کیا کہہ رہی ہیں آپ...... کیا کہنے جارہی تھیں......؟'' وہ بے تابی سے بولا

''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں''

''اچھا...... اگر یہ بات ہے تو یہ انگوٹھی آپ کی انگلی میں کیوں جگمگا رہی ہے؟''

''یہ...... یہ تو میں نے اس لیے پہن لی تھی کہ پیچھے رہ گئی تو چوری نہ ہوجائے۔ بہت قیمتی ہے نا اور پھر جینا کی امانت ہے...... آپ نے تو جینا کو دی تھی......''

''نہیں میں نے صرف اور صرف آپ کو دی تھی......''

''لیکن جینا سمجھ کر دی تھی نا......'' وہ نقاہت کی وجہ سے دھیرے بول رہی تھی۔

''لیکن آپ جینا نہیں ہیں...... زارا ہیں۔''

''آپ میرے ساتھ جائیں گے نا ریسکیو ٹیم کے ساتھ......'' اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''میں آپ کی آنکھوں کی التجا کسی قیمت پر رد نہیں کرسکتا......'' وہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ زارا کی نظریں جھک گئیں۔

''پوچھیں گی نہیں کیوں؟'' وہ شائستگی اور محبت کی چاشنی لیے بولا۔

زارا کی کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن مسکراتے ہوئے اس کے ڈمپل عالی کے دل پر قیامت برپا کررہے تھے۔

''میں بتادوں؟''

''نہیں پلیز...... پلیز نہیں...... بعض اوقات کچھ نہ کہنا بہت کچھ کہنے سے بہتر ہوتا ہے۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کمزوری اتنی تھی کہ چکرا کر گرنے لگی۔ عالی نے جلدی سے اسے تھام لیا...... وہ شرم سے گلابی ہوگئی...... ریسکیو ٹیم پہنچ گئی تھی۔ وہ عالی کی مضبوط باہوں کا سہارا لے کر اس کے ساتھ جہاز میں بیٹھی...... اور جب کیمپ میں پہنچی تو بابا جانی اور امی جان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی...... کتنی دیر یونہی گزر گئی سارا نے زارا کے کان میں سرگوشی کی۔

''زارا یہ ہینڈسم نوجوان کون ہے......؟'' عالی نے سن لیا۔ شرارت سے بولا

'میں وہی عالی ہوں جو آپ سے فون پر بات بھی کرچکا ہے اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......''

وہ جان بوجھ کر خاموش ہوگیا

''تو آپ نے آپی کی جان بچائی ہے......
آپ نے انہیں ہم سے ملوایا ہے......کبھی گھر آیئے نا
......بابا جانی انہیں گھر آنے کی دعوت نہیں دیں گے؟''
''کیوں نہیں بیٹا......تمہارا حق بنتا ہے......تم
اپنی پہلی فرصت میں ہمارے گھر آؤ گے۔ ہم سب
شدت سے انتظار کریں گے' ابھی تو تم ڈیوٹی پر
ہونا......؟''
''یس سر...... میں حاضر ہونے کی پوری
کوشش کروں گا۔''
''کوشش تو نہیں کریں گے بلکہ لازمی آئیں
گے......'' سارا شرارت سے آہستہ سے بولی جسے وہ
صرف وہی سن سکا۔''میں سب جانتی ہوں!''
زارا کے بابا جانی اور امی جان کے سامنے وہ
ادب کو ملحوظ خاطر رکھتا ہوا خاموش رہا ورنہ اس کے
پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔شہری ایک دم آگے بڑھا اور
اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
''السلام علیکم سر......میں شہریار ہوں......اور
اپنی آپی کو ہم سے ملوانے کے لیے تہہ دل سے آپ کا
شکر گزار ہوں......ہم آپ کے مقروض ہیں اور اس
قرض کو اتارنے کی پوری کوشش کریں گے......''
عالی نے محظوظ ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''
''چھوٹے نواب! ہم انہیں چھوٹے نواب
کہتے ہیں'' سارا شرارت سے بولی
''ہاں تو چھوٹے نواب آپ کو ہمارا مشکور
ہونے کی ضرورت نہیں ہے اٹ واز مائی گریٹ
پلیژر......اصل قرض تو میرے اوپر تھا۔'' وہ اصل میں
کہنا چاہتا تھا کہ اصل میں قرض تو میری محبت پہ تھا
کہ میں زارا کی خوشی کے لیے کچھ بھی کروں لیکن ایسا
کہنا ممکن نہ تھا۔
''وہ کیسے سر؟'' شہری حیران تھا
''یہ آپ نہیں سمجھیں گے......اور اگر آپ
مجھے سر کے بجائے عالی بھائی کہیں تو ہمیں زیادہ خوشی
ہوگی۔''
''اوکے عالی بھائی......ہمیں بھی آپ کو
بھائی کہہ کر زیادہ خوشی ہوگی۔''
اس تمام عرصے میں سارا اور زارا خاموش
کھڑی تھیں۔ عالی کی نظر بار بار زارا کی طرف اٹھ
رہی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر ادھر دیکھنے سے گریز
کر رہی تھی تاکہ سب کے سامنے آنکھیں سارا راز نہ
کھول دیں......عالی کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا رخصت
ہونے کو لیکن جانا تو تھا ہی......اس نے ادب سے
رخصت چاہی......جاتے جاتے زارا کی طرف دیکھا
وہ ان نظروں کا پیام جانتی تھی دھیرے سے مسکرادی
۔عالی کو لگا ہر طرف روشنی ہوگئی ہو اس کے لیے فی الحال
اتنا ہی کافی تھا۔ عالی اور مائیک اپنے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر
رخصت ہوگئے عالی اپنی دوربین سے تب تک زارا کا
چہرہ فوکس کیے رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔

......☆......

جینا نے ناشتے کی پلیٹ ایک طرف کر دی
اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔ اس کی پر سوچ نظریں گرما
گرم چائے سے اٹھتی بھاپ پر تھیں۔ اس وقت دل
کی عجیب حالت تھی۔ خوش بھی تھی لیکن اداسی اپنی جگہ
تھی جو اس کی زندگی کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔ ابھی
کل ہی ممی اور ڈیڈی وزٹ کر کے گئے تھے ممی نے
فواد کے بارے میں ایسی خبر سنائی تھی جس سے وہ بے
انتہا خوش ہوئی تھی۔ ممی پر بے تحاشا ترس بھی آیا......
ممتا کی ماری دکھی عورت کیسے کیسے قدم اٹھانے پر مجبور
ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب انہوں نے اس کی وجہ سے
کیا تھا۔ اس سے دوری اس کی محبت سے محرومی نے
انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے کا راستہ دکھایا تھا......اوہ
ڈیڈی آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ وہ ممی سے لپٹ کر
بہت روئی تھی۔
''آئی ایم سو سوری ممی......آپ کو اپنی ممتا کو

تسکین دینے کے لیے فواد کے بارے میں جھوٹ بولنا پڑا..... آئی ایم سوری..... مائی پور ممی..... لیکن آئی ایم سو ہیپی کہ وہ میرا سگا بھائی ہے..... فواد..... فادی..... میرا اپنا بھائی ہے..... کاش میں اس سے مل سکتی۔''

''ابھی تمہیں انتظار کرنا ہوگا میری جان..... ہم اسے یہاں نہیں لا سکتے۔ اس کے دل میں ہزاروں منفی سوالات آئیں گے تمہارے بارے میں.....''

''آئی انڈر اسٹینڈ.....'' اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ یہاں نہیں آ سکتا تھا اور جینا وہاں نہیں جا سکتی تھی سو یہ ملاقات ناممکنات میں سے تھی کیونکہ فواد کے خیال کے مطابق تو وہ اسٹڈیز کے لیے باہر گئی تھی.....

بہر حال اجالا نے نانو اور نانا کے ساتھ بہت انجوائے کیا تھا۔ نانا کو دیکھتے ہی بھاگ کر ان کی گود میں چڑھ گئی تھی اور ان کے سینے سے لپٹ گئی تھی۔ دونوں کتنی دیر اس سے کھیلتے رہے۔ ممی تو اجالا کی عاشق تھیں..... اور اجالا ان کی محبت کا خوب خوب فائدہ اٹھاتی۔ وہ جب سے گئے تھے جینا اداس تھی۔ وہ جب ملنے آتے اور پھر چلے جاتے۔ جینا کی یہی کیفیت ہوتی۔

آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ بھرتے اس کے دل میں خیال آیا اگر اس طرح اجالا کو اس سے جدا کر دیا جائے جیسے مجھے ممی سے دور کر دیا گیا تھا تو کیا میں برداشت کر پاؤں گی؟

نہیں نہیں اس کے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ میں اجالا سے دوری کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی۔ میں مر جاؤں گی..... بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر آ گرے..... ممی کتنی مظلوم ہیں..... انہوں نے کتنے دکھ سہے۔ چائے ختم ہو گئی لیکن اس کی سستی ختم نہ ہوئی

..... جانے کیوں پورے وجود پہ کسلمندی سی چھائی تھی۔ دل کچھ بے چین سا تھا۔ رانی ویکیوم لے کر آئی تو جینا نے منع کر دیا

''ابھی نہیں رانی..... ویکیوم کی آواز سے اجالا اٹھ جائے گی..... تم تو جانتی ہو کچی نیند سے اٹھ جائے تو موڈ خراب ہو جاتا ہے اس کا.....''

''بعد میں کر لوں گی بی بی جی.....''

''تم نے ناشتہ کر لیا۔''

''نہیں بی بی جی..... میں نے سوچا تھا پہلے صفائی کر لوں.....''

''نہیں جاؤ پہلے ناشتہ کر لو..... دلاور خان کو بھی کرا دو..... اتنی دیر میں اجالا کے اٹھنے کا ٹائم ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے بی بی جی..... آپ کو ایک کپ چائے اور دے دوں۔ آپ نے ناشتہ بھی پورا نہیں کیا.....''

''بس دل ہی نہیں چاہ رہا کھانے کو..... ہاں چائے دے دو..... لیکن تازہ چائے بنانا۔''

''جب بھی بیگم صاحبہ اور صاحب جی یہاں سے ہو کر جاتے ہیں آپ یونہی اداس ہو جاتی ہیں۔ آپ ہفتہ دو ہفتے انہیں ادھر ہی کیوں نہیں رکھ لیتیں.....''

''رکھ تو لوں..... لیکن وہاں فواد اکیلا رہ جاتا ہے۔''

''تو وہ بھی آ جائے..... آج کل تو چھٹیاں ہیں۔''

''چل زیادہ باتیں نہ بنا اور جا کر کام کر..... اور چائے ذرا جلدی لانا۔''

جیسے ہی اس نے چائے ختم کی اجالا کی آواز آئی..... وہ بھاگ کر اندر بیڈ روم میں گئی۔

''اوہ..... میری جان اٹھ گئی'' اسے کاٹ سے نکال کر اس نے گود میں اٹھا لیا

''اور نہیں سونا ماما۔''

''او کے بیٹا..... اچھی نیند آئی'' اجالا نے

مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
واش روم سے فارغ کروا کر منہ ہاتھ دھلا کر اسے باہر لے آئی۔
''ماما دودو پینا ہے......''
''پہلے ماما کو پاری دو......'' اس نے اپنا منہ آگے کیا۔ اجالا نے ہونٹ ساتھ لگا کر پیار کیا
''ماما بھی پاری کرلے'' بڑے لاڈ سے اجازت طلب کی۔
''ہاں...... کرلیں......'' انداز بڑا شاہانہ تھا۔
جینا نے بے اختیار ہی اس کے گال پر زور سے پیار کرلیا۔ اجالا نے منہ بسورا۔
''ماما چوٹ......''
''اوہ سوری بیٹا...... ماما سے غلطی ہوگئی۔ اب آہستہ کرتی ہوں......'' ایک بار پھر جینا نے نرمی سے اس کے پھولے گال چوم لیے...... پھر اسے ہائی چیئر پر بٹھا دیا
''میں آپ کے لیے دودو لاتی ہوں'' نیم گرم دودھ کی بوتل لے کر آئی تو اجالا نے صوفے کی طرف اشارہ کیا
''ماما ادھر......''
''او کے۔ آپ کو صوفے پر لیٹ کر دودھ پینا ہے۔'' اجالا نے پھر زور سے اثبات میں سر ہلا دیا جس سے اس کے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلنے لگے۔
جینا نے اجالا کو صوفے پر لٹایا اور بوتل اس کے ہاتھ میں دے دی۔
''ماما...... میرا تکیہ......'' وہ اپنے ذاتی تکیے کے بغیر دودھ نہیں پیتی تھی۔
جینا نے اندر سے تکیہ لا کر اس کا سر نیچے رکھا...... لیکن اجالا نے ابھی بھی بوتل منہ کو نہیں لگائی......
''ماما میرا کمبل......''
''اوہو...... ماما کو یاد ہی نہیں رہتا......'' وہ پیار سے بولی پھر اندر سے کمبل لا کر اس کے اوپر ڈالا تو اجالا نے دودھ پینا شروع کیا۔ جینا ساتھ بیٹھ کر اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں چلانے لگی دل میں محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اور اجالا انتہائی سکون اور اطمینان سے دودھ پی رہی تھی۔ بے اختیار ہی بار بار اس کے گال چومنے گی۔ اجالا کو یہ مداخلت گراں گزر رہی تھی۔
''او کے...... سوری بیٹا۔ آپ آرام سے دودھ پیو۔''
اجالا کو دودھ پیتے دیکھ کر اسے ہینڈسم یاد آ گیا ، اجالا نے ایک ایک نقش اپنے باپ سے چرایا تھا۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح بے مروت نکلی ہو بیٹا۔ سارے نقوش ہی اس سے لے لیے...... ماں سے بے وفائی کی...... ایک بھی نقش نہیں لیا...... بس اجالا کی سائل جینا سے ملتی تھی۔ ورنہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ پرگننسی کے دوران اس سے پہلے۔ اس کے بعد ہر وقت اسے ہی سوچا تھا۔ اسی کی شکل نظروں کے سامنے رہی تھی پھر وہ اس کا ہر نقش کیسے نہ چراتی۔ جینا اس معاملے میں خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی اسے اجالا کی شکل میں ہینڈسم کا نعم البدل مل گیا تھا...... لیکن تمہاری کمی کیسے پوری ہوسکتی ہے...... میں کیا کروں گی ساری عمر...... تمہاری بیٹی بڑی ہوگی تو اسے کیا بتاؤں گی۔ تمہارے بارے میں...... یہی کہ بیٹا میں تو تمہارے باپ کا اصل نام تک نہیں جانتی...... وہ کیا کرتا ہے...... کہاں رہتا ہے یہ سب تو بعد کی بات ہے اور اجالا...... بڑی ہو کر میرے بارے میں کیا سوچے گی...... کہ اس کی ماما کس قدر بے وقوف ہیں۔ ایک محبت کی خاطر سب کچھ ہار گئیں...... اعتبار میں بری طرح دھوکہ کھا گئیں۔
''بی بی جی...... آپ نے تو یہ چائے بھی

ٹھنڈی کردی...... بالکل برف بن گئی ہے......"

"رہنے دو رانی......بس تم اپنا کام ختم کرو۔"

"نائیں ماما......رانی میرے ساتھ کھیلو"

"کیا کھیلوں؟"

"میرے ساتھ دوڑو۔"

"لیکن یہاں تو جگہ نہیں ہے بے بی دوڑنے کی۔ کوئی چیز ٹوٹ گئی تو آپ کی ماما مجھ سے ناراض ہوں گی...... مجھے ماریں گی۔"

"اچھا......اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں...... ماما آپ رانی کو ماریں گی......"

"نہیں بیٹا...... لیکن آپ اچھے بچوں کی طرح اس پلے سیٹ پر بیٹھ کر اپنے کھلونوں سے کھیلو......رانی کو اپنا کام ختم کرنے دو......"

"نائیں ماما......ہمیں باہر جانا ہے۔"

"نہیں بیٹا ...... ابھی ہم باہر نہیں جاسکتے......"

"کیوں نہیں جاسکتے......ہمیں باہر جانا ہے، جانا ہے" وہ زور دے کر بولی "ہمیں باہر کھیلنا ہے، باہر بال سے کھیلنا ہے، ہمیں گاڑی میں سیر کرنی ہے، ہم باہر جائیں گے۔کھان کے پاس جائیں گے پلیز ماما......"

"اچھا ابھی تھوڑا کام کرلیں ...... پھر آپ کو گاڑی میں سیر کروائیں گے۔"

"مال پہ بھی جائیں گے نئی گڑیا بھی دلائیں گے لیکن ابھی آپ اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے اپنے کھلونوں سے کھیلو......اوکے۔"

"اوکے......" وہ فوراً ہی بہل گئی اور کھیلنے لگی۔

جینا صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

آج جانے کیوں دل اتنا بے چین تھا۔دل اتنا کیوں گھبرا رہا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا۔وہ اس فلیٹ میں قید ہوکر رہ گئی ہے ہمیشہ رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اڑنے والی جینا کے پر کاٹ کر اس کو پرواز سے محروم کردیا گیا ہے......آنکھیں بھیگنے لگیں...... یہ میں نے اپنی زندگی کے ساتھ کیا کرلیا ہے یہ پہاڑ سی زندگی کیوں کر کٹے گی ...... وہ جانے کہاں ہے جو شریک سفر بنا تھا اس نے بیچ میں ساتھ چھوڑ دیا......

کیوں وہ ایسا تو نہیں تھا......اس کی ہر بات سے محبت ظاہر ہوتی تھی لیکن پھر کیا ہوا کہاں غلطی ہوگئی مجھ سے......یا پھر اس سے......اتنا لمبا عرصہ بیت گیا لیکن اس نے پلٹ کر خبر نہیں لی......آخر کیوں؟ کیا اس نے مجھے دھوکا دیا ہے یا پھر اس کے ساتھ کچھ ہوگیا ہے "اللہ نہ کرے......" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا وہ جہاں بھی ہو سلامت ہو......خدایا اگر میری محبت سچی ہے اگر اس نے واقعی مجھ سے محبت کی ہے تو اسے میرے پاس لوٹا دے۔ میں اس کے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔میں کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ اے خدا میری معصوم بیٹی کو اس کا باپ لوٹا دے۔اسے باپ کی محبت دے دے۔میں ساری عمر ماں کی محبت کے لیے تڑپتی رہی۔ ماں کے ہوتے ہوئے تو کیا میری بیٹی باپ کے ہوتے ہوئے اس کی محبت کو ترسے گی۔

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ پھر اچانک ہی اسے ایک خیال آیا وہ کورٹ سے پیپرز نکلوا کر دیکھ سکتی ہے یقیناً وہاں بھی اس نکاح کا ریکارڈ ہوگا اور اس کا اصلی نام بھی ان کاغذات میں لکھا ہوگا جو میں اپنی بے وقوفی کی وجہ سے نہ دیکھ سکی۔شاید کوئی سرا ہاتھ آجائے ہاں......وہ یکدم سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ مجھے پہلے اس بات کا خیال نہیں آیا......ممی ڈیڈی کو بھی یہ خیال نہیں آیا لیکن اس کے لیے تو اسلام آباد جانا پڑے گا......ضروری تو نہیں۔ یہ کام شاید ممی اور ڈیڈی بھی کرسکتے ہیں۔ اس کی سپرنس ہائی ہونے لگیں۔"ماما......" اجالا اس کے قریب آکر زور سے بولی۔

"جی میری جان!"

''اس ڈول کا سر ٹوٹ گیا......''
''اوہو......ادھر لاؤ...... ماما جوڑ دیں گی۔''
اس نے گڑیا کا سر فکس کر کے اسے دے دیا تو اسے دوبارہ یاد آیا کہ اسے تو باہر جانا تھا۔
''ماما آپ نے کہا تھا......''
''کیا بیٹا......؟''
''ہم باہر جائیں گے......''
''اوکے جانو......''
رانی......دلاور خان کو کہو گاڑی نکالے۔آج لگتا ہے اجالا سیر کیے بغیر نہیں مانے گی......''
''اچھا بیگم صاحبہ!''
''اور اجالا کا بیگ بھی تیار کردو......ہم مال پہ بھی جائیں گے کچھ شاپنگ بھی کریں گے اور کھانا بھی باہر کھائیں گے۔''
اس نے اجالا کے کپڑے تبدیل کیے جو کافی مشکل مرحلہ تھا کیونکہ وہ قدم پر رزسٹ کرتی تھی......حالانکہ جانتی تھی کہ یہ کام ضروری ہے...... کیوٹ سے جوتے پہنائے۔رانی نے بیگ تیار کرلیا تھا سب جانے کو تیار تھے۔اجالا بہت خوش تھی۔
''آہا......ہم باہر جارہے ہیں......آہا ہم باہر جارہے ہیں۔''
سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔آج کتنے روز بعد وہ باہر نکلے تھے اور جینا سوچ رہی تھی کہ جب سے ہینڈسم اس کی زندگی میں آیا تھا زندگی مکمل طور پر تبدیل ہوگئی تھی......چونکہ مری میں اکثر لوگ آتے رہتے تھے اس لیے وہ باہر نکلنے سے گریز کرتی تھی کہیں کوئی پہچان نہ لے کیونکہ سب جاننے والوں کے لیے تو وہ باہر اسٹڈیز کے لیے گئی ہوئی تھی۔آج بھی اس نے سر پر اسکارف لیا اور سن گلاسز پہن رکھے تھے۔

......☆......

زارا اپنے اور سارا کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی تو سارا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھی۔

''کس کا فون تھا سارا......؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔''ان کا نہیں جن کا آپ کو بے تابی سے انتظار ہے......'' وہ شرارت سے مسکرائی۔زارا نے گھور کر اسے دیکھا۔
''مجھے گھور کر دیکھنے سے کام نہیں چلے گا......اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے آپ کو ان کے فون کا انتظار نہیں ہے......''
''کن کے فون کا......؟'' وہ تجاہل عارفانہ سے بولی۔''اوہ تو آپ نام سننا چاہتی ہیں ان کا۔واہ رے بیتابی......''
''تم پٹو گی مجھ سے اب۔''
''پیٹ لیجیے......یہ حسرت بھی پوری کرلیجیے......دوسری حسرت تو پوری ہو نہیں رہی......'' سارا کہاں چھوڑنے والی تھی۔
''اور وہ دوسری حسرت کون سی ہے؟''
''توبہ ہے......آپی اپنی زبان سے کچھ نہیں کہیں گی۔میرے منہ سے ہی ان کا نام سننا چاہتی ہیں......کیا اتنا مشکل کام ہے ان کا نام لینا۔آپ تو اٹھارویں صدی کی ہیروئن کی طرح بی ہیو کررہی ہیں یا پھر سکھ عورتوں کی طرح......سکھ عورتیں کسی زمانے میں اپنے شوہروں کا نام نہیں لیتی تھیں......پتہ ہے سبزی کی دکان پر اگر پیاز خریدنا ہو تو دکان سے پیاز طلب نہیں کرتی تھیں بلکہ کہتی تھیں بھائی پوکاں والا دے دے......آپ کو پتہ ہے گرین پیازوں کے پیچھے جو لمبی سی ہری ہری ڈنڈیاں ہوتی ہیں ان کو پوکاں کہتے ہیں وہ ایسا کیوں کہتی تھیں بھلا کیونکہ ان کے شوہروں کے نام گنڈا سنگھ ہوتے تھے۔گنڈا پنجابی میں پیاز کو کہتے ہیں نا......تو بات ہورہی تھی عالی بھائی کی......آپ بے فکری سے ان کا نام لے سکتی ہیں۔وہ کون سا ابھی آپ کے ''وہ'' بنے ہیں۔یوں بھی یہ ماڈرن زمانہ ہے آج کل تو ڈارلنگ' سویٹ ہارٹ' ہنی یا پھر اگر آپ نے اپنی زبان ہی زبان کو عزت بخشنی ہے تو جان من کہہ کر مخاطب کرسکتی ہیں......''

''ختم ہو گئی تمہاری تقریر...... باتوں میں تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔''

''تقریر تو ختم ہو گئی لیکن فائدہ تو کوئی نہیں ہوا نا، میں جو سننا چاہتی تھی آپ کے شیریں لبوں سے وہ نکلا نہیں، ویسے فون نانو کا تھا، وہ اپنی مزیدار کہانی سنا رہی تھیں کہ کس طرح جب ہم وہاں وقت نہیں پہنچے تو وہ فکر سے آدھی ہو گئیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے...... پھر جب انہیں پتہ چلا کہ دریا کا بڑا والا حفاظتی بند ٹوٹ گیا تو ان کی جان ہی نکل گئی، حالانکہ یہ بھی ممکن نہیں ہے، ایسا ہوتا تو وہ ابھی فون پر مجھ سے بات نہ کر رہی ہوتیں۔ پھر تو انہوں نے حکام بالا کا ناک میں دم کر دیا، حالانکہ یہ تو بالکل ہی ممکن نہیں آج تک تو حکام بالا ہی غریب عوام کا ناک میں دم کرتے رہے ہیں لیکن خیر نانو کہتی ہیں تو مان لیتے ہیں اور جب انہیں ہماری خیریت کا علم ہوا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہاں یہ بات بھی ممکن ہے، اور وہ کچھ دنوں میں ہماری خیریت دریافت کرنے آئیں گی میرا خیال ہے یہ بات بھی ممکنات میں سے ہے۔''

''اوہ خدایا...... تم کتنی باتونی ہو سارا......؟''

''اور آپ کتنی ناشکری ہیں ایک تو میں نے آپ پر اتنا کرم کیا کہ پوری بات تفصیل سے بتائی اتنی حسین منظر کشی کی اور جواب میں آپ الزام تراشی فرما رہی ہیں......''

''کون سی الزام تراشی......؟'' زارا حیران تھی

''یہی کہ میں باتونی ہوں...... حالانکہ میں کم سے کم الفاظ میں پوری تفصیل بیان کر دیتی ہوں......''

''تم سے تو خدا ہی سمجھے......''

''تو بات ہو رہی تھی عالی بھائی کی...... کیا آپ اب بھی ان کے بارے میں نہیں پوچھیں گی...... آخر ان کا فون آیا یا نہیں...... وہ آ رہے ہیں یا نہیں...... اور اگر آ رہے ہیں تو کب آ رہے ہیں اور اگر نہیں آ رہے ہیں تو کیوں نہیں آ رہے......؟''

''مجھے کیا فرق پڑتا ہے جب بھی آئیں......'' وہ جان بوجھ کر بے نیازی سے بولی۔

''رئیلی......'' سارا حیرت سے چیخی......

''آپ کو واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا...... پھر تو بے چارے عالی بھائی مفت میں مارے گئے...... کیا بنے گا ان کا......؟''

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں......''

''پتہ ہے مجھے......'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی ''فکر کرنے کا اعزاز سارے کا سارا آپ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں...... بلکہ اپنا حق سمجھتی ہیں......''

''کون جانے یہ حق کس کا ہے......اور......اور''

''بس یہ سیلف پٹی رہنے دیں......اب آپ خواہ مخواہ جینا کو بیچ میں لانے کی کوشش کریں گی...... جبکہ آپ جانتی ہیں وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے...... اور آپ کو کیا یاد نہیں آپ نے اس کے لیے کیا رول پلے کیا تھا...... یا وہ ملاقات حافظے سے غائب ہو گئی ہے...... میں تو پکا پکا جانتی ہوں کہ عالی بھائی آپ ہی سے محبت کرتے ہیں اور جناب کوئی ایسی ویسی محبت نہیں...... میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا ہے وہ آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں...... کچھ بھی۔''

''یو تھنک سو سارا......'' اچانک زارا نے سنجیدگی سے سارا کی طرف دیکھا...... کیا واقعی تمہیں پکا یقین ہے کہ عالی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔''

''کیا آپ کو نہیں ہے......؟'' سارا نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے سوال پہ سوال کر دیا...... زارا کی نگاہیں بے اختیار جھک گئیں چہرے پہ رنگ سا آ گیا۔

''ابھی یہ رنگوں کی قوس قزح کسی مناسب وقت کے لیے بچا کر رکھیں۔ عالی بھائی فی الحال آپ کے سامنے نہیں بیٹھے ہیں۔ یہ میں ہوں خاکسار۔ سارا بلال۔''

وہ شرارت سے بولی ''آپ کو ان کی فون کال کا تو انتظار ہے نا بے تابی سے یہ تو مانتی ہیں نا۔''

(جاری ہے)

افسانہ

عائشہ نور عاشا

مجبوری کے دھاگے

لڑکیاں بہت سمجھ دار ہوتی ہیں ... زویا بھی صرف اپنے گھر والوں کی خاطر زندگی میں شامل زہر پینے کو تیار تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ شکست اس کا نصیب ہے۔

عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد زوہا اور آمنہ چھت پر ایسے چہل قدمی کر رہی تھیں جیسے ڈھلتی شام دریا کے کنارے چل رہی ہوں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی صحن میں موجود درخت کی شاخیں جھوم جھوم کر زندگی کا پتہ دیتے ہوئے موسم سرما کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

''ویسے تو محبت کو ناپنے کے لیے کوئی آلہ ہونا چاہیے تھا۔'' آمنہ نے کہا تو زوہا نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں پھر آسانی سے پتہ چل جاتا تھا آیا محبت ہوئی بھی کہ وہم تھا۔''

''ویسے بہت ساری لڑکیوں کو خود پر یقین ہی نہیں آتا کہ محبت ہوگئی ہے۔'' آمنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک بار بلال سے پوچھا تھا کہ محبت کیسے ہوتی ہے مطلب...... کیسے پتہ چلتا ہے کہ محبت ہوگئی ہے۔'' زوہا نے کچھ عرصے سے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ہمیشہ کی طرح غم نہ خوشی، محبت نہ نفرت، اس کے الفاظ میں جملوں کی جوڑ توڑ میں مجبوری واضح تھی مگر اسے کوئی نہیں جان سکا۔

''تو کیا کہا بلال بھائی نے؟'' آمنہ نے فوراً سوال اٹھایا۔

''وہ کہتے ہیں جب کوئی بات بات پر یاد آئے اور زیادہ سے زیادہ یاد آئے..... تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے محبت ہوگئی ہے۔'' زوہا نے کہا تو آمنہ کو مذاق سوجھا۔

''اس کا مطلب جب بچے اپنا سبق یاد کرتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ انہیں اس سبق سے محبت ہوگئی ہوتی ہے ہاہاہا!''

''بات انسان کو انسان کے یاد کرنے کی ہو رہی ہے نہ کہ لفظوں کی۔'' زوہا نے سنجیدگی کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے کہا۔

''واہ...... لفظوں کا استعمال اور جملے بنانا کوئی تم سے سیکھے۔'' آمنہ نے دل سے داد دی۔

ہر شام زوہا اور آمنہ کی گفتگو کا مرکز انسانی جذبات ہوا کرتے کبھی وعدے تو کبھی دعوے نفرت، کبھی محبت، دوست تو کبھی رقیب، غصہ تو کبھی پیار، مجبوری اور کبھی آزادی گو، ہر انسانی جذبے کو وہ کئی کئی بار الفاظ جملے اور پھر کہانیوں کا رنگ دے چکی تھیں۔ آج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

''سنو آمنہ!''

''ہوں......''

''جب آپ تپتے صحرا میں ہوں اور کسی کے آنے کا امکان بھی ہو اور ساتھ یہ یقین بھی ہو کہ آنے والا آپ کے لیے سایہ دیوار ہوسکتا ہے یا کم سے کم یہ گمان کہ آنے والا آپ کے لیے پانی کے دو گھونٹ لے کر آئے گا کہ لمحہ بھر کو سہی کوئی مہربان تو ہوگا۔''

''ہوں!'' آمنہ مکمل توجہ سے سن رہی تھی زوہا نے پھر بات شروع کی۔ تو وہ آپ کی امیدوں کے بالکل برعکس ہو بلکہ تشنگی کو بڑھا کر صحرا کے سفر عذاب کو مزید طویل کردے تو...... تو کیا کیا جائے۔''

''اس کا سر پھوڑ دیا جائے اور رکھائی سے کہا جائے'' تو آیا کیوں ہے چل بھاگ۔'' آمنہ نے سہولت سے حل پیش کیا۔

''پاگل اگر سر پھوڑنے جرات یا گلہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں تپتے صحرا اور تشنگی کی بات ہی کیوں کرتی۔''

''زوہا تمہیں کیا ہے؟'' آصفہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' زوہا نے بیدردی سے کہا۔

''کچھ تو ہے تم خود ہی کہتی ہو ناں کچھ باتیں، الفاظ اور سوچیں ہر ایک پر واضح نہیں ہوتیں تو پھر یہ سب نارمل تو نہیں جیسے تم کہہ رہی ہو صحرا، کوئی امید، سایہ، کوئی مہربان اور پھر اس کے برعکس طویل سفر عذاب..... کیا ہے یہ سب۔''

''ہاہاہاہا! پاگل یہ سب الفاظ ہیں! فقط الفاظ۔'' اس لمحے زوہا کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

''زوہا کوئی پرابلم ہے تو شیئر کرو بے شک تم سے چھوٹی ہوں مگر تمہاری بہن ہوں اور تم بخوبی واقف ہو کہ میں تمہاری بات سن کر سمجھ بھی لوں گی۔''

''ہاں یہ تو میں جانتی ہوں...... اچھا آمنہ یہ بتاؤ اگر تم میری جگہ ہوتی تو کس بات پر خوش ہوتیں مطلب کون سی بات تمہیں خوش رہنے میں مدد دیتی۔''

ہمیشہ کی طرح آج بھی آمنہ زوہا کے دیے ہوئے سوالوں کی پٹری پر چل پڑی پچھلے کو بھول کر اگلے سوال کی طرف اور پھر جواب میں سے ایک نیا سوال نکل پڑتا بھلا کسی کو کھوجنے کا سفر ایسے کب مکمل ہوتا ہے۔

''سب سے پہلے یہ انسان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہم سفر کا انتخاب ہوتا ہے تو ابو جی نے بلال بھائی کو تمہارے لیے منتخب کیا گو یہ ان کی دنیا کی سب سے بڑی خوشی اور خواہش تھی۔''

''ان کی یہ خوشی اور خواہش ہی تو عزیز ہے مجھے۔'' زوہا نے اعتراف کیا اور آمنہ نے اپنی بات جاری کی۔

''اور تم اس منگنی پر بہت خوش تھیں بلال بھائی صورت اور سیرت کے بھی اچھے ہیں ان فیکٹ ان میں کوئی کمی نہیں۔'' آمنہ خوبیاں گنوا رہی تھی اور زوہا خود کو مضبوط رکھنے کی وجوہ گن رہی تھی۔

''ہاں'' دل میں زوہا نے سرد آہ بھری تھی۔

''اور اب ابو جی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بلال بھائی نے ہمارا کتنا خیال رکھا ہمیں فرض سمجھ کر ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے ہیں، ہمیں خوش رکھتے ہیں بلکہ بلال بھائی نہ ہوتے تو ابو کے بعد دوبارہ زندگی کی طرف آنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوتا۔ تمہیں اتنا اچھا ہم سفر ملا ہے تمہیں تو رشک کرنا چاہیے اپنی قسمت پر...... اس کے باوجود تم یہ سب باتیں کرو تو عجیب تو لگے ناں......''

''آمنہ ابو نے سارا کاروبار بھی تو بلال کو دیا ہے اگر کسی اور رشتے دار کو دیا ہوتا تو شاید وہ بھی ہمارا اتنا ہی خیال رکھتے۔'' زوہا نے اسے سمجھانا چاہا مگر آمنہ تو بس بلال بھائی کے گیت گائے جا رہی تھی۔

''پھر بھی...... زوہا تمہیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ بلال بھائی ابو کے کزن کے بیٹے ہونے کے باوجود ہمارا...... ہمارے چچا تایا کے بیٹوں سے بڑھ کر خیال رکھتے ہیں کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارا کوئی بھائی بھی ہوتا تو امی نے پھر بھی بلال بھائی سے ہی زیادہ پیار کرنا تھا۔''

''کوئی کیا جانے میری جان وہ یہ سب فرض سمجھ کر کرتا ہے یا قرض...... جو ہمارے والد نے ہمیشہ اس کی فیملی کے لیے کیا...... اس کی خاطر یا ہماری محبت کی خاطر...... یا دنیا کی نظر میں سرخرو ہونے کی غرض سے......'' زوہا نے دل میں سوچا تھا۔

''اب کہاں کھو گئی۔'' آمنہ نے زوہا کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''یہیں ہوں!''

''کیسے لگے میرے فلسفہ جات...... ویسے حقیقت بھی یہی ہے۔''

'ہاں اگر ایک لمحے کو بھی بتا دوں کہ وہ کتنا اچھا انسان ہے تو تم سب کے چہرے کی خوشی اور دل کا سکون ہوا ہو جائے، جو میں مرتے دم تک کوشش کروں گی برقرار رہے اسی لیے میں آج تک چپ ہوں...... خیر وہ اتنا اچھا انسان ہے کہ ایک وہی تھا جو ابو کے بعد ہماری زندگی میں خوشی لایا اور اسی لیے تم سب خوش ہو پرسکون ہو اور میں...... میں مطمئن ہوں لیکن اس نے مجھے جس صحرا میں بنا سائے کے یہ کہہ کر تنہا اور آزاد چھوڑ دیا کہ

''میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی کیونکہ تم

سے منگنی سے پہلے میں کسی کو پسند کرتا ہوں اور اس سے کبھی شادی بھی کرلوں گا یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہوسکتا اب تمہیں جو کرنا ہے کرسکتی ہو میں خود سے یہ رشتہ ختم نہیں کرسکتا کیونکہ خاندان اور اپنے گھر والوں کے سامنے مجبور ہوں......''

''اب کوئی مجھے بتا سکتا ہے صحرا میں کسی کا سفر عذاب طویل ہوا ہے کس کی تشنگی کو روندا گیا ہے۔ کس کی امیدیں ٹوٹ گئی ہیں کس کا سایہ دیوار اسی پر لمبے دنوں کے سورج کی طرح آگ برسا رہا ہے۔''

زوہا کے آنسو ٹوٹ کر برس رہے تھے......

''اور میں ہوں جو پگھل پگھل کر بھی خود کو کمپوز کرنے کی سعی میں ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں بھی مجبور ہوں اپنی بوڑھی ماں کی خوشی کے لیے اپنی بہن کی مسکراہٹ کے لیے اور اپنے باپ کی عزت کی خاطر...... جو میں نے سب کی نظر میں بلال کو معتبر بنا رکھا ہے ورنہ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں اسے معتبر رکھنا بھی چاہتی ہوں یا نہیں۔''

زوہا یہ ساری باتیں دل کی زبان سے دل کو ہی سنا رہی تھی یہی دل کی زبان سے مضبوط رہنے میں مدد دیتی تھی اور آمنہ نجانے کب کی ماں کے بلانے پر نیچے جا چکی تھی۔

زوہا نے اپنے روانی سے گرتے آنسو صاف کیے۔

''کبھی تو میری آزمائش ختم ہوگی۔ ویسے بھی میرے قریبی رشتے مجھ سے خوش ہیں اور وہ ذات جو شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب ہے۔ اس ذات کے ہوتے ہوئے تنہا کیسے ہوسکتی ہوں جو میرے نصیب میں لکھا گیا ہے مجھے وہ مجبوری میں نہیں اللہ کی محبت میں قبول ہوگا۔''

دھاگے ہیں مجبوری کے ورنہ
خوشی پہ حق ہم بھی رکھتے ہیں

غزل

نورِ شمع نور

پھر زیست کسی حلقۂ الزام میں آئی
عزت بھی کسی بخششِ دشنام میں آئی

ہم حلقہ بگوشانِ رہِ کارِ زیاں ہیں
سو موت کسی کوچۂ گمنام میں آئی

بھٹکی ہوئی تقدیر مری جانے کہاں تھی
وہ صبح کی بھولی ہوئی اب شام میں آئی

دھوکے سے جو کرنے لگے پتھر کی پرستش
کیا تیری شباہت انہی اصنام میں آئی

کب روپ بدل لیتا ہے یہ دشتِ تمنا
گم گشتہ خوشی برقعِ آلام میں آئی

بدنام ہوئی کیوں سرِ بازار زلیخا
کیوں یوسفِ دلدار کے نیلام میں آئی

ہم ربطِ مسلسل کا سرا ڈھونڈ رہے تھے
فرقت بھی اسی دھوکہء ابہام میں آئی

یہ اس کا کرم نور جسے چاہے نوازے
کیا موت ہے جو حالتِ احرام میں آئی

افسانہ

نیر شفقت

ایک خط!

محبوب کا خط محبوبہ کے نام
مگر اس نے کبھی اپنے آپ کو اس کی محبوبہ نہ مانا......

''قابل صد احترام زارا صاحبہ

السلام علیکم!

اللہ کرے کہ آپ سب بخیریت ہوں بھابھی عالیہ بھی ہم سے جدا ہوگئیں یقیناً ہمیں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہے۔ کوئی آج گیا، کوئی کل اور تو کوئی پرسوں۔ یہی نظام قدرت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

بھائی جان کی رحلت پر میں آپ سے تعزیت کرنا چاہتا تھا اور ایک محبت کرنے والی بہن کی جدائی پر آپ کا دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔ کہنے کے لیے میرے دل میں بہت کچھ تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہمارے ساتھ ان کی شفقت میری والدہ کے ساتھ ان کی انڈراسٹینڈنگ، شاعری سے لگاؤ، مطالعہ کا شوق، کتب بینی، غرض کہ ان کی ہزاروں صفات جن کا ذکر میں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو اور بہت ساری باتیں آپ سے شیئر کرنا چاہتا تھا مگر!

آپ کی صرف ایک ہی بات نے میرا مان ہی خاک میں ملا دیا۔ پہلے میرے ذہن پر بھابھی جان کی موت کا صدمہ طاری تھا مگر بعد میں آپ کے محبت بھرے پیغام نے تو میرا ذہن ہی ماؤف کر کے رکھ دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟

مجھے آپ کی حیثیت سے انکار نہیں۔ یقیناً آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ مجھے کچھ بھی کہیں پہلے بھی تو کہتی رہی ہیں لیکن میں نے جواب میں کبھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ خاموشی ہی اختیار کی ہے۔

آپ نے پہلے تو مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا اور پھر وہاں سے نیچے زمین پر پٹخ دیا۔ اس طرح گرنے سے مجھے بہت چوٹ لگی لیکن میں نے پھر بھی کبھی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ شاید میری یہ برداشت ہی آپ کے لیے ناقابل برداشت بن گئی ہو سکتا ہے اسی لیے آپ نے اپنے اظہار نفرت کے لیے تیسرے شخص کا انتخاب کیا اور وہ بھی روشنی کا۔ آپ کو پتہ نہیں کہ اس نے کتنی حیرت سے مجھے آپ کا پیغام پہنچایا کہنے لگی۔

''چاچو مجھے بتائیں کہ آپ نے ایسی کیا بات کی ہے جو زارا خالہ نے آپ کے لیے ایسے سخت کلمات بولے ہیں۔ وہ تو آپ کی بہت عزت کرتی تھیں پھر انہوں نے آپ کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کیوں کیا۔ کیا وہ آپ سے کسی بات پر ناراض ہیں۔''

پروفیسر صاحبہ اب آپ ہی بتائیں کہ میں اسے کیسے مطمئن کروں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بے حد ذہین اور عقلمند خاتون ہیں لیکن کاش آپ نے یہ تو سوچا ہوتا کہ روشنی میرے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئی ہے آپ کو میرے ساتھ اس کے رشتے کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے تھا جو لڑکی مجھے باپ کا مقام اور احترام دیتی ہے اس کی نظروں میں میری کیا حیثیت رہ گئی۔ کیا سوچتی ہوگی وہ میرے بارے میں۔ وہ کئی بار مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ چکی ہے اور میں سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکا کہ ''بیٹا آپ کی خالہ پاگل ہے اور اس کا دماغ خراب ہے۔''

حالانکہ آپ تو ماشاء اللہ بہت باصلاحیت خاتون ہیں۔ کبھی بغیر سوچے سمجھے کوئی بات نہیں کرتیں۔ میرے لیے آپ نے جن الفاظ کا انتخاب

کیا ہے وہ یقیناً آپ کی ذہن سوچ کا غماز ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ نے ایسا کرنا ہی تھا تو 57 سال سے پہلے یہ بات کیوں نہ کی تضحیک، دل آزاری اور نفرت کی صفات سن 2000 میں ہی کیوں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ آپ کو تو شاید یاد نہ ہوگا وہ خط جس نے میرا انجر پنجر تک ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں سچ کہتا ہوں کہ اتنا تکلیف دہ اور صبر آزما وقت تو میرے لیے 29 مئی 1990 کا بھی نہیں تھا جب لاہور ائیر پورٹ کے لاؤنج میں آپ خدا حافظ کہہ کر گم ہوگئی تھیں اور جسے میں آج تک تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔

اپنے آخری خط میں آپ نے جو انگارے مجھ پر پھینکے تھے میں آج بھی ان سے جھلس رہا ہوں لیکن میں چپ رہا شاید آپ میری اس کمزوری سے بخوبی واقف تھیں کہ آپ کے معاملے میں نہ تو میں expressive ہوں اور نہ ہی Agressive لیکن اس بار تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ "I dont like to call him" یہی الفاظ تھے نا آپ کے پیغام کے یہ نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے تیر نہیں تو اور کیا ہیں جو آپ نے مجھ پر پھینکے۔ اور وہ بھی روشنی کے ذریعے۔

کیا یہ کام براہ راست ممکن نہ تھا یا یہ کہ آپ خود کو بہت اعلیٰ اور ارفع خیال کرتی ہیں۔ چند سال پہلے میں نے آپ سے متعلق ایک برا خواب دیکھا تو عالیہ بھابھی سے اس کا ذکر کر دیا تو یاد ہے نا آپ نے فون پر کیسے ناراض ہوئی تھیں۔ آپ نے فرمایا تھا ''کیا میں نے کبھی کسی سے اس طرح تمہارا ذکر کیا؟''

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کا ذکر آئے تو آپ کی بہن کو بھی پتہ نہ چلے اور میرا ذکر آئے تو بچوں کے ہاتھوں ذلیل کروائیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ آپ کی منشاء کیا ہے آپ چاہتی کیا ہیں۔ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں تو بھلے کرتی رہیں لیکن ہر کام کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔

آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اپنے آخری خط میں کیا لکھا تھا ''اگر میں دوسری شادی کرتی تو بھی وہ تم نہ ہوتے۔'' کتنا زور دار تھپڑ تھا جو آپ نے میرے منہ پر مارا تھا۔ میرے پاس اگرچہ آپ کی حقارت کا جواب تھا لیکن کیا میں نے اف بھی کیا؟

''کیا یہ انتہا نہیں ہے میرے صبر اور آپ کے احترام کی۔ جی ہاں! میں اس محترم خاتون کی بات کر رہا ہوں جس کو میں نے آج تک ''تم'' کہہ کر بھی مخاطب نہیں کیا۔ پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں۔

میں کیا ہوں......

تجھ کو خبر نہیں ہے کہ مرنے کے بعد بھی
برسوں تمہاری یاد میں روتے رہے ہیں ہم

لیکن آپ کیا جانیں کہ محبت کیا ہوتی ہے اور چاہت کسے کہتے ہیں یہ بات یاد رکھیے گا کہ جذبۂ محبت اضطراری ہوتا ہے اختیاری ہرگز نہیں۔

میں نے آپ کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو پریشان سا ہو جاتا ہوں کہ نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہم نے کیسے گزارا۔ اس عرصے میں تو لوگ ساتھ نبھا کر اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھ کر ملک عدم کو بھی سدھار جاتے ہیں اور ہم ہیں کہ آج تک تو کون۔ میں کون۔ سے ہی باہر نہیں آسکے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا آپ سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تعلیم میں، عقل میں اور شکل میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ قدرت کا ایک حسین شاہکار ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آپ میں تکبر آجائے۔ میں بیشک غریب ہوں لیکن بے حس اور بے ضمیر نہیں ہوں۔ آپ کا پرستار ہوں۔

ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہوں گا لیکن عزت اور وقار کے ساتھ۔

آپ ذہن پر ذرا زور دیں تو آپ کو یاد آجائے گا کہ برسوں پہلے میں نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا:

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے

بالکل ٹھیک ہے یہ میری آرزو ضرور تھی مگر اس شعر کے دوسرے مصرعے سے میں متفق نہیں کہ

آئے تو سہی بر سر الزام ہی آئے

بلکہ بات تو تب بنتی ہے کہ آئے اور بصد احترام آئے یہ نہیں کہ ہم آپ کی نمازیں پڑھیں اور آپ ہمارے لوٹے توڑیں۔

بہر حال آپ کے ساتھ آپ کی سوچیں میرے ساتھ میرے تخیلات۔ تاہم یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی آپ کی عزت میں کمی کا تصور تک نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کی عظمت کو سلام کیا ہے۔ اگر ان سب باتوں کے باوجود بھی میں آپ کے دل میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں بنا سکا تو کوئی بات نہیں۔ اسی کو مقدر کہتے ہیں۔ ہر شخص کو اس کا گوہر مقصود نہیں ملا کرتا۔ مجھے بھی نہیں ملا تو کیا ہوا کم از کم آپ کی یہ خواہش تو ضرور پوری ہو جانی چاہیے کہ "I dont like to call him" لیکن خدا را دعا کو دغا مت پڑھا کریں۔

آپ کے اس حکم کی تعمیل حسب سابق آپ کے شایان شان ہی ہوگی۔

آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ میں تو وہ ہوں جس نے 57 سال آپ کی راہ گزر میں بیٹھ کر گزار دیے۔ اب تو زندگی بھی آخری دموں پر ہے۔ مزید صرف چند دنوں یا مہینوں کی بات ہے۔ آپ کے بغیر ماضی کی طرح یہ بھی گزار ہی لیں گے۔ اپنے سینے پر وہ میڈل سجائے جس پر آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا

''سفیر! تم میرا مان ہو۔''

آپ کو اجازت ہے کہ جاتے وقت مجھ سے اپنا سب کچھ لے جائیں۔ وہ گزرے دن، سہانی یادیں اور پرانی باتیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ یہ یادیں میرے پاس رہیں۔ یہ یادیں میری روح اور میرے خون میں رچی بسی ہوئی چاہت کی وہ معراج ہے جو تا ابد میرے پاس رہے گی۔ اس کی موجودگی میں مجھے دنیا بھر میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی میری زندگی کا حاصل ہے اور یہ یادیں ہی میری متاع حیات ہے۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو مجھ سے میری کائنات چھین کر دکھا دیں۔

میں نہیں جانتا کہ مستقبل میں کبھی آپ کی میری ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اس کا انحصار آپ پر ہے۔ مجھے آنے والے وقت پر شبہ ہے۔ ہو سکتا ہے میرا جنازہ اٹھ جائے اور آپ وضو ہی کرتی رہ جائیں۔ اس لیے میں ماضی کی ہر اس بات کے لیے جس سے آپ کو مجھ سے، میرے رویے سے یا کسی بھی طرز عمل سے دکھ پہنچا ہو، دل آزاری ہوئی ہو یا صدمہ پہنچا ہو۔ دست بستہ اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ آپ سے متعلق میرے اختیار میں کبھی کچھ نہیں تھا اور نہ آج ہے۔ آپ ہمیشہ ہی میرے لیے بہت زیادہ قابل احترام رہی ہیں۔ میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔ آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ آپ کو میری کوئی خبر مل جائے تو صرف دو آنسو میری نذر کر دیجیے گا۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو!

اللہ آپ کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔ ☆☆

افسانہ

چوزن ون

زندگی نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ اللہ پر یقینِ کامل ہی انسانیت کی معراج ہے اور پھر جگنو کی دعائیں بھی قبول ہونے لگیں......

''یہ تمہاری دعاؤں کا ثمر ہے جگنو..... تم نے کہا تھا ناں کہ جو خدا مریمؑ کو عیسیٰؑ اور ذکریاؑ کو یحیٰؑ دے سکتا ہے وہ مجھے بھی اولاد دے سکتا ہے..... تم نے سچ کہا تھا جگنو..... اس نے مجھے عبداللہ دے دیا..... اللہ نے مجھ بانجھ کو اولاد دے دی..... جگنو تمہاری سن لی اس نے.....'' فریال نے ممتا سے چُور لہجے میں ننھا عبداللہ جگنو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ جگنو کی آنکھیں ساون تھیں۔ وہ کبھی عبداللہ کو شدت سے چومتا اور کبھی آسمان کی طرف تشکر بھری نگاہ کرتا۔ ''اسے دعا دو جگنو اسے دعا دو۔'' فریال نے جذبات کی شدت سے جگنو کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور جگنو نے لرزتے ہاتھ پھر سے اٹھا لیے۔

جگنو کبھی ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت الگ تھا پر اب اس کے دامن میں اپنی دعاؤں سے لوگوں کو دی گئی سوغاتوں کے موتی ہی موتی تھے ...... ہرے سفید سچے موتی..... اس کی ہر دعا جانے کیوں قبول ہو جاتی تھی..... لوگ اس کے پاس دعاؤں کے لیے آتے۔ وہ ستم رسیدہ لوگوں کو اپنی دعا کی امید دینے کے بعد رات بھر مصلیٰ پر بچھا کر دعا مانگا کرتا اور کبھی خالی ہاتھ نہ رہتا۔ اس کی بستی کے پرانے ساتھی رانو اور ستارہ اکثر اس کے پاس بیٹھے حیران ہوتے کہ ان کی دعائیں تو قبول نہیں ہوتیں جگنو کی کیسے ہو جاتی ہیں؟

جگنو کو یاد تھا بہت پہلے جب وہ جوان تھا ایک بڑھیا نے اپنے بیمار بیٹے کی صحت یابی کے لیے اس سے دعا کا کہا تھا اور اس نے طنزیہ ہنس کر اسے کہا تھا یوں کہ لفظ لفظ کرب میں ڈوبا ہوا تھا:

''ارے چھوڑ ری اماں ...... ہم تو خود سوئی ہوئی تقدیر لے کر آتے ہیں ہماری دعائیں وہ سنتا تو ہم ایسے تھوڑی ہوتے ...... ارے ہمیں کیا واسطہ دعاؤں سے۔''

پر اب جگنو کی کوئی دعا خالی نہیں جاتی تھی۔ خدا جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ اللہ نے اسے بھی چن لیا تھا صراط مستقیم پر، استقامت کے ساتھ چلنے کے لیے......

''چلتی ہوں جگنو..... آتی رہوں گی...... اپنا خیال رکھنا'' فریال اپنے آنچل میں ڈھیروں ستارے سجائے چلی گئی تھی۔ اس کی آسودگی کے پردے پر جگنو کو ماضی کے کئی دروا ہوتے نظر آرہے تھے۔

سانسوں کی مالا سمروں میں پی کا نام
میرے دل کی میں جانوں پی کے دل کی رام

وہ جھوم جھوم کر ناچ رہا تھا اس کی انگڑائیاں ٹھمکے آس پاس کھڑے شریفوں کے نفس کو حرام رزق مہیا کیے جاتے تھے۔ اس کے گھیرا ڈالنے پر منچلے جھوم اٹھے تھے۔ مدہوش ہو کر اس نے گھیرے میں تیزی لائی ہی تھی کہ چھپاکے سے آنکھوں کے سامنے وہ لہرا گئی۔

''مجھے تم سے گھن نہیں آتی نہ نفرت ہوتی ہے..... نہ ترس ...... مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری زندگی پر..... تم اس لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ اللہ نے تمہیں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ پہچانو۔''

ناچتے ناچتے گڑبڑا کر وہ لڑکھڑا گیا۔ منچلوں کے کلیجے کٹ گئے۔ بدحواس سا کچھ دیر انہیں دیکھتا وہ ناچ چھوڑ کر جھنجلاہٹ میں وہاں سے نکل آیا۔

یہ اب ہر بار ہونے لگا تھا۔ وہ جب کبھی کسی جگہ ناچنا شروع کرتا حفصہ نور اپنی عجیب سی باتیں لیے اس کے ذہن کے پردوں میں آبراجمان ہوتی۔ بڑی مصیبت ہی ہو گئی تھی۔ کئی دن بعد وہ دوپہر کے وقت میک اپ سے لیس لال پیلے کپڑے پہنے بھیک مانگتا بس اسٹاپ پر آپہنچا تھا۔ وہیں اس نے حفصہ نور کو دیکھا تھا۔

''اے بی بی..... کچھ دے ناں..... اللہ کے نام پہ دے ناں.....'' ہاتھ نچا کر اس نے تالی بجائی تھی اور پھر دایاں ہاتھ بھیک مانگنے کے انداز میں اس کے

سامنے پھیلا دیا۔ حصہ نور مسکرا اٹھی تھی۔
''بیٹھو'' اس نے اسے ابرو اٹھا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیران سا ہوا تھا آج سے پہلے کبھی کسی نے اسے اس طرح بیٹھنے کا نہیں کہا تھا۔ لوگ مزاق اڑاتے، ڈانٹتے، طنز کرتے، چھیڑتے لیکن اس طرح جانے کیا تھا حفصہ نور کے لہجے میں۔ وہ حیران پریشان سا بیٹھ گیا۔
''کیوں مانگتے ہو بھیک؟''
''مانگیں نہیں تو پیٹ کا دوزخ کیسے بھریں گے بی بی جی......'' اس نے پلو انگلی کے گرد لپیٹتے سر جھکا کر کہا۔
''اللہ نے رزق دینے کا وعدہ توڑ دیا ہے کیا؟''
عجیب سا سوال تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
''جب رزق کا وعدہ اس کا ہے تو بھیک مانگ کر، ناچ گا کر اپنی ذات کی نفی کر کے کیا اسکا کرم مل جائے گا؟''
''ذات...... رے کون سی ذات؟...... جانتی نئیں ہے کون ہوں میں...... چھکا ہوں چھکا...... اری ہماری کوئی ذات نہیں ہوتی ہاں......'' وہ بگڑ ہی تو گیا تھا۔
''کیوں تم انسان نہیں ہو، تمہیں اللہ نے نہیں بنایا؟ تم دنیا آخرت حلال وحرام کے اصولوں سے مبرا ہو گیا؟ کیا یہ سب تمہیں جنت دے گا یا پیٹ کا ایندھن بھرتے بھرتے تم جہنم کا ایندھن بننا پسند کرو گے؟''
''اری او بی بی جی، ہم جیسوں کے لیے دنیا ہی جہنم ہے کیا سمجھی ہاں!'' ہاں کو لمبا سا کھینچ کر ہاتھ نچاتے وہ بولا۔
''تمہارے لیے دنیا جہنم ہے تو آزمائش کیا ہے پھر؟ تمہارے اس طرح ماننے سے تم سزا و جزا سے بچ جاؤ گے؟ اللہ کا سامنا نہیں کرو گے کیا؟ وہ تمہیں ایسے ہی چھوڑ دے گا کیا؟ کچھ پوچھے گا نہیں تم سے؟

مرتے ہی سیدھے جنت میں پاؤں ہوں گے تمہارے کیا؟
سوال تھے کہ طمانچے...... عجیب طرح سے لگتے تھے روح پر...... وہ بوکھلا گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا پر الفاظ اس کے لبوں کا ساتھ دینے سے انکاری ہو گئے تھے وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اسے لگا تھا وہ آئندہ حفصہ نور کی شکل نہیں دیکھے گا لیکن جانے کیا ہوا تھا کہ اگلے دن وہ اسی بس اسٹاپ پر اسی وقت آن موجود ہوا۔ پر حفصہ نور اسے نہ ملی۔ جانے کیوں وہ بے چین سا ہوا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرنے لگا لیکن اس دن وہ نہ آئی پھر اگلے کتنے ہی دن وہ وہاں آتا رہا پر حفصہ نور اسے نہ ملتی۔ اس کی بے چینی عجیب طور پر بڑھ چکی تھی۔ وہ ان تمام دنوں میں حفصہ نور کو اور اس کی کہی گئی باتیں سوچتا جاتا رہا۔ اتنے دن وہ نہ کسی تقریب میں ٹھیک طرح سے ناچ سکا نہ کہیں بھیک مانگنے جا سکا۔ اس کے گرو نے بھی اسے سخت سنائی تھیں۔
''ارے مت ماری گئی ہے تیری ہاں...... رنے جے رب سوہنے کو ہم سے ذرا وی محبت ہوندی تو ہمیں ایسے بناتا کیا؟ رے ہم پر تو خدا کا غضب ہماری ماؤں کے پیٹ میں ہی شروع ہو جاتا ہے ہاں...... ہمارے لیے تو یہی دنیا جہنم ہے، رہن دے مت سوچ چھوکری کی باتوں کو...... دھندے پر دھیان دے۔ بھوکا مرے گا ناں تو وہ چھوکری نہیں آئے گی تجھے کھلانے۔ وہ جانے خدا جانے، ہمارا تو روزی روٹی سے واسطہ ہے بس!''
پر اسے کہاں سمجھ آنی تھی؟ اس دوپہر وہ پھر موہوم سی آس لیے مرے مرے قدموں چلتا بس اسٹاپ کی طرف آ رہا تھا اس کی امید دم توڑ چکی تھی کہ حفصہ نور اسے پھر کبھی ملے گی لیکن اس دن وہ پھر اسے بس اسٹاپ پر نظر آ گئی۔ وہ ہانپتا دوڑتا اس کے پاس پہنچا۔

''کہاں تھی رے تو..... کہاں مرگئی تھی؟

''بیٹھ جاؤ اور سانس لے لو۔'' حفصہ نور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیڑھے میڑھے منہ بناتا دھپ سے بنچ پر ڈھے سا گیا۔ ''تمہیں میرا انتظار تھا اللہ کو بھی تو انتظار ہے تمہارا، تمہارے لوٹ آنے کا'' نیلے آسمان پر اڑتے سفید پرندے کو دیکھتے ہوئے حفصہ نور نے کہا تھا۔

''وے بی بی جی......'' وہ اس کے قدموں میں گر کر ہاتھ باندھ کر رونے لگا......

''ارے بی بی کیا بولے ہے تو؟ کیوں کر رہی ہے تو ایسا...... کیا مل رہا ہے تجھے غریب کی زندگی برباد کر کے...... تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں بی بی جی...... مت کر ایسا...... تجھے مجھ سے گھن نہیں آتی رے؟''

حفصہ نور نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور واپس بنچ پر بٹھا دیا۔ ''مجھے تم سے گھن نہیں آتی نہ نفرت ہوتی ہے...... نہ ترس...... مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری زندگی پر...... تم اس لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ اللہ نے تمہیں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے پہچانو!''

وہ خالی خالی نم آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔

تمہیں میری باتوں کی سمجھ آ گئی ہے...... تم سمجھنا چاہتے ہو میں جانتی ہوں...... اور اگر میں ٹھیک ہوں تو تم آؤ گے میرے ساتھ ورنہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد تمہارا میرا سامنا نہیں ہوگا۔ یہ کہتے ہی حفصہ نور اٹھی تھی اور ایک جانب چل دی تھی۔ جگنو کچھ لمحے اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر تیزی سے پلو سمیٹتے اس کے پیچھے بھاگا۔ اس کے کندھے سے کندھا ملا تھا یوں کہ جیسے ایک نئی منزل پر جگنو نے قدم ڈال دیئے تھے

اس دن حفصہ نور اسے مولانا عبدالکریم صاحب کے پاس لے گئی تھی۔ شہر کی مرکزی مسجد کے خطیب اور امام، اسلامی سینٹر کے واعظ و مالک۔

حفصہ نور انہی کے اسلامی سنٹر میں پڑھتی تھی مولانا صاحب کو دیکھ کر جگنو پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہوگئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ وہ اس طرح کسی مولانا سے مل رہا تھا۔ مولانا صاحب کا وعظ جاری تھا:

''اور نہیں پیدا کیا خدا نے کوئی بھی ذی روح بے مقصد...... وہ جسے چاہے بیٹے دے اور جسے چاہے بیٹیاں اور جسے چاہے ان دونوں کے درمیان میں۔ ہر ایک اپنے رب کا محتاج ہے ہر ایک کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ ہر ایک دنیا میں کیے گئے اعمال کا جوابدہ ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ اس کے بتائے گئے رستے کے مطابق زندگی گزار کر اس کے انعام کا حق دار ٹھہرے یا اس کے طریقوں سے انحراف کر کے اس کے غضب کو آواز دے۔''

وہ یہ سن کر عجیب سے حال سے دوچار ہوا تھا۔ وعظ کے بعد مولانا صاحب اس سے ملے تھے۔ وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔

''بادشاہو ہم تو ناں مرد ہیں نہ عورتیں۔ ہم سے آخرت دین کا کیا لینا دینا؟'' اس نے تھکے سے لہجے میں سوال کیا تھا۔ مولانا عبدالکریم صاحب مسکرائے تھے۔

''تم انسان نہیں ہو؟ تمہارے اندر روح نہیں ہے؟ تمہیں اللہ نے پیدا نہیں کیا؟ دوسرے انسانوں کی طرح تمہارے لیے بھی اس کی ہر نعمت کھلی ہے یا نہیں؟ تمہیں اس کے پاس لوٹ کر نہیں جانا؟ ان سوالوں کے جواب اگر دوسرے مردوں عورتوں کی طرح تمہارے لیے بھی ایک سے ہیں تو دین اور آخرت کا لینا دینا ہے تم سے......''

وہ چپ سا ہو گیا تھا۔ اس دن مولانا صاحب نے جگنو کی دلجوئی کی اور ادھر ادھر کی کئی باتیں کیں۔ وہاں سے واپسی پر جگنو خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا پھر یہ روز ہونے لگا۔ جگنو ہر روز ان کے پاس آنے لگا۔ مولانا صاحب نے اسے نماز سکھا دی

تھی۔ وہ ان سے قرآن پاک کا درس بھی لے رہا تھا اور ان کی دینی مجالس میں بھی شامل ہوتا تھا۔ وہ ان کے وعظ سنتا تو اس کی روح جیسے کسی اور جہاں کو تسخیر کر رہی ہوتی وہ وہاں مکمل مردانہ حلیے میں رہتا اور وہاں سے واپسی پر وہ اپنے پرانے حلیے میں لوٹ آتا۔ اس نے بھیک مانگنا یکسر طور پر چھوڑ دیا تھا لیکن اب بھی وہ کبھی کبھار کسی شادی سالگرہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ناچ گا لیتا تھا لیکن اب اسے اس سب سے گھن آتی۔ اسے نفرت ہوتی اپنے آپ سے۔ وہ کھلم کھلا اس کا اظہار اپنے ساتھیوں سے کرتا رہتا۔ اس کا گرو اور ساتھی اسے سمجھاتے پر وہ جیسے ان سنی کر دیتا۔ تنگ آ کر اس کے ساتھیوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بھی ان ہی کے پاس رہتا۔ وہیں کھاتا پیتا۔ ان لوگوں کی ایک بات اچھی تھی وہ اپنے جیسوں کو دھتکارتے نہیں تھے ہر حال میں انہیں قبول کرتے تھے۔ اپنے ساتھ رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ وہ انسانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے پاس تقدیر کوئی چوائس نہیں چھوڑتی۔ وہ ایک دوسرے کا سہارا تھے اور ایک دن جسم سے روح کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ جانتے ہیں پھر کیا ہوتا ہے؟ پھر امتحان شروع ہوتا ہے۔ اصل امتحان...... جو کچھ آپ نے دنیا میں کیا اچھا یا برا...... اس کا انعام یا صلہ دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ہوتی ہے قبر پھر حشر...... قبر میں الگ سزا جزا حشر میں الگ، انسان ذرا سوچے تو آخرت جو کہ حقیقی زندگی ہے اور جو قبر کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں آزمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ...... ہاں گناہ گاروں کے لیے، نیکوکار تو پل صراط پار کر جائیں گے۔

مولانا عبدالکریم صاحب جانے اور کیا کیا کہتے رہے تھے کہ اس سے نہ سنا گیا۔ وہ وحشت زدہ سا وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ وہی دن تھا جب اس نے اپنی بستی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا گرو رانو، ستارہ سب اسے سمجھاتے رہے پر وہ رکنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنا مختصر سا سامان باندھا اور جانے کے لیے نکلا......

''پنچھی ڈار کے ساتھ ہی اچھا لگے ہے رے جگنو۔''

''اب بھی رک جا......'' گرو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آخری کوشش کی۔ ''جانے دے مجھے گرو......'' وہ روتا ہوا گرو کے گلے لگ پڑا...... ''جانے دے مجھے مت روک...... میرا راستہ کچھ اور ہے اب...... میں یہاں مر جاؤں گا۔''

''وے تو کھائے گا کہاں سے؟ مر جائے گا وے تو......'' ستارہ نے روتے روتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ آنسو پونچھتا گرو سے الگ ہوا اور ستارہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''ری اصحاب صفہؓ کو اللہ سوہنے نے بھوکا نہیں مارا...... مریم کو بند کمرے میں رزق دیا...... جانتی ہے کیوں؟ وہ رب سوہنے پر توکل کرتے تھے۔ وہ اللہ مجھے بھی بھوکا نہیں مارے گا۔ رزق دے گا۔''

اس کی بات سن کر سب چپ ہو گئے اور پھر روتے سب نے اسے جانے دیا تھا وہ وہاں سے خواجہ کے آستانے پر آیا تھا اور یہیں پر اس نے مستقل ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

''تم جگنو ہو ناں...... میرے بیٹے کے لیے دعا کر دو، اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ سنا ہے تمہاری دعائیں اللہ قبول کرتا ہے۔ دعا کرو میرے بیٹے کے لیے ایک عورت بلکتے ہوئے اسے جھنجوڑ کر دعا کا کہہ رہی تھی۔ وہ چونک کر ماضی سے حال میں واپس آ گیا تھا۔

اس نے عورت کی جانب چشم تر سے دیکھا۔ بے بس تڑپتی ہوئی ماں...... اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ''بی بی میں تو دعا کروں گا تو بھی یقین کے ساتھ اپنے رب سے مانگ وہ تیرے بیٹے کو ضرور شفا دے گا۔'' کیونکہ یہ جگنو ہی جانتا تھا کہ اللہ پر یقین کامل ہی تو ہے جو انسان کو انسانیت کی معراج عطا کرتا ہے، دو آنسو لڑھک کر اس کی ہتھیلی میں جذب ہو گئے۔ ☆☆

ناول

زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

قسط 13

ان کرداروں کی کہانی جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے

ثمن کچن میں کھڑی شادو اور شمو کے ساتھ مل کر ناشتے کے لوازمات تیار کروا رہی تھی۔ انعم ابھی سو کر اٹھی تھی اور کچن میں اپنے لیے ناشتے کا کہنے آئی تھی۔ ناشتہ تیار دیکھ کر اس کا مزاج یکدم خوشگوار ہو گیا۔ اسی لیے چہک کر پوچھنے لگی ''واہ...... آج تو بڑا اہتمام کیا ہے۔ کس کی خاطر داری ہو رہی ہے ثمن بھابھی...... کوئی آ رہا ہے کیا ؟'' ثمن اس کی مداخلت پر چونک کر متوجہ ہوئی۔ وہ ٹرالی میں سے کیک رسک اٹھا کر کھانے میں مصروف تھی۔

''اروی کی امی اور بھائی آئے ہیں انہی کے لیے ناشتہ بنا ہے۔ تمہیں کیا چاہیے؟'' ثمن نے فرائنگ پین میں آملیٹ کا آمیزہ ڈالتے ہوئے معمول کے لہجے میں پوچھا۔

''وہ لوگ کیوں آ گئے......؟ انعم کا مزاج یکدم بدل گیا...... اور ان لوگوں کے آنے جانے کب تک رہیں گے۔ اپنے گھر میں چین نہیں ہے ان کو۔''

اروی اپنی امی اور بھائی کو گیسٹ روم میں چھوڑ کر یہ سوچ کر کچن کی طرف آئی تھی کہ ثمن کی ناشتہ بنانے میں کچھ مدد کر دے۔ اصعم کے اٹھنے کا امکان ابھی نہیں۔ اس لیے وہ اسے جگانے بھی نہیں گئی تھی۔ انعم کی آواز نے اسے کچن کے باہر ہی رکنے پر مجبور کر دیا۔ تکلیف کا شدید احساس اس لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی اس کی آنکھوں کو جلن دے کر گزر رہا تھا۔ دل کو چیر کر بڑھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی سنسناتا تیر کسی نے بڑی دور سے اس کی جانب پھینکا ہے۔ درد کی شدت سے ذہن و دل ہی نہیں روح بھی بلبلانے لگی تھی۔ شادو اور شمو نے بے ساختہ

چونک کر انعم کا چہرہ دیکھا تھا۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے کچھ غلط کہا ہے کیا؟ جب دیکھو منہ اٹھا کر چلے آ رہے ہیں یہاں آنے کا تو انہیں بہانہ چاہیے۔ بیٹی کے ٹھاٹ دیکھ کر للچاتے ہوں گے۔ وہ بھلا یہاں آنے کا موقع چھوڑیں گے۔'' انعم کا کٹیلا لہجہ اروی کے لیے نا قابل برداشت تھا لیکن اسے برداشت کرنا تھا۔ اس نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔
''انعم کیسی فضول باتیں کر رہی ہو تم؟ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اروی کے گھر والوں کا یہاں آنا ان کا حق ہے۔ تمہیں اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہتر ہوگا تم اپنے خیالات اپنے تک رکھا کرو۔'' ثمن کو بھی اس کا انداز و لہجہ برا لگا تھا۔
''مجھے پتہ ہے آپ کو کیوں برا لگ رہا ہے..... شمو میرا ناشتہ میرے کمرے میں لے کر آؤ۔'' وہ ثمن سے زیادہ نہیں الجھتی تھی اس لیے منہ پھلا کر کچن سے نکل گئی۔ اروی جو آنکھیں اور مٹھیاں بند کرے کھڑی تھی اسے انعم کے آنے کا پتہ نہیں چلا۔ انعم اسے دیکھ کر تیزی سے بڑھتی ٹھٹک کر کھڑی ہو کر بڑے طنزیہ انداز میں بولی۔
''اوہ تو چھوٹی بھابھی صاحبہ کو کن سوئیاں لینے کی بھی عادت ہے.....'' انعم کی تیز دھار آری سی آواز و لہجہ نہ صرف اروی کی سماعتوں کو چیرتا ہوا محسوس ہوا بلکہ ثمن بھی انعم کی آواز پر فوراً لپک کر آ گئی۔ انعم مزید کہہ رہی تھی'' سب سے کہوں گی سبھی محتاط رہیں۔ ان کی یہ عادت گھر میں بڑے بڑے فساد کرانے والی ہے۔''
''انعم..... کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ وقت اور حالات کا تو خیال کر لیا کرو؟'' ثمن نے بے ساختہ مداخلت کی۔ اروی کا چہرہ سفید، فق ہو رہا تھا۔ وہ ان کہی اذیت سے گزر رہی تھی۔ انعم مزید ڈھٹائی آمیز دلیری سے بولی ''ثمن بھابھی آپ کو نہیں پتہ یہ پہلے بھی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہیں۔ آج بھی یہاں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ پوچھ لیں ان سے میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔''
''ثمن بھابھی..... میں تو ابھی آئی ہوں..... اور میرے گھر والے ایسے بے غیرت نہیں ہیں کہ یہاں عیش و آرام ڈھونڈنے آتے ہوں۔ ان کا یہاں آنا ان کی مجبوری ہے ورنہ.....'' اروی کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اور وہ ایک دم کھانسنے لگی۔ ثمن نے بڑھ کر پہلے اسے سہلایا ''شمو پانی کا گلاس لے کر آؤ.....'' شمو فوراً پانی لے کر آ گئی۔ ''اروی..... اروی اس کی باتوں کا خیال نہیں کرو خود کو سنبھالو..... میں بی بی جان سے بات کروں گی۔ ابھی تم خود کو سنبھالو پلیز۔'' ثمن نے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگاتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔
اروی کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے گھر والوں کے لیے کیسی حقارت تھی انعم کے لہجے میں۔ جیسے وہ بہت ہی کمتر ہوں۔ کمتری کا احساس اسے ذلت و بے عزتی محسوس ہو رہا تھا۔ انعم نخوت سے سر جھٹک کر وہاں سے جا چکی تھی۔ ثمن کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ ''اروی اس وقت تمہاری امی اور بھائی آئے ہوئے ہیں۔ دیکھو انہیں محسوس نہیں ہونے دینا ورنہ..... انہیں بہت تکلیف ہوگی۔''
''ثمن بھابھی مجھے معلوم ہے..... تبھی تو پہلے دن سے یہ سب برداشت کر رہی ہوں۔'' اروی نے ایک گھونٹ پانی لے کر خود کو سنبھالا تھا۔ ثمن نے حوصلہ افزا مسکراہٹ سے اسے دیکھا ''تم بہت بہادر ہو اروی..... بیٹیوں کو ایسا ہی صابر اور حوصلہ مند ہونا چاہیے۔''

وہ بس دیکھ کر رہ گئی۔ کیا جواب دیتی کہ صبر اور حوصلے کے لیے اللہ ہی توفیق دیتا ہے۔ ورنہ اس کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ''ناشتہ تیار ہو گیا ہے اروی۔ تم بھائی اور امی کو چاہے تو ڈائننگ روم میں بلا لو یا پھر شمو وہیں گیسٹ روم میں ناشتہ لگا دیتی ہے۔''

''ثمن بھابھی آپ کو جو مناسب لگتا ہے کریں۔ میں کیا بتاؤں۔'' اروی نے اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کیا۔

''چلو ٹھیک ہے تم جاؤ میں وہیں ناشتہ بھجواتی ہوں۔'' ثمن نے ایک بار پھر اسے تھپتھپا کر رخصت کیا۔

اروی کمرے میں اصتم کو دیکھنے کے لیے آئی تو وہ سو رہا تھا۔ واش روم میں جا کر اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر خود کو مزید بہتر محسوس کرانے کی کوشش کی۔ آج اس کے ذہن و دل میں بالکل الگ احساسات بیدار ہوئے تھے۔ وہ خود کو اس منفی اثر سے باہر لانا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

شمو نے ثمن کی ہدایت پر ناشتے کے لوازمات کی ٹرالی گیسٹ روم میں پہنچائی۔ اروی بھی اپنے کمرے سے آ گئی تھی۔ ثمن بھی میزبانی نبھانے آئی تھی۔

''آنٹی...... خود کو مہمان مت سمجھیے گا۔ کچھ چاہیے ہو تو بلا تکلف بتا دیجیے گا۔'' زہرہ متاثر و ممنون سی ہو کر بولیں ''بیٹا تکلف تو آپ نے کیا ہے، بخدا ان سب کی اشتہا نہیں ہے۔''

''آنٹی...... اس طرح تو نہ کہیں۔ میں نے بڑے دل سے آپ کے لیے ناشتہ بنایا ہے۔ پلیز آپ سب کچھ لیں گی۔ اروی اب یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔ آنٹی اور بھائی کو سرو کرو۔ میں ذرا ہاسپٹل فون کر کے خیریت معلوم کر لوں۔'' ثمن اپنی کہہ کر مہمان خانے سے نکل گئی۔ ثمن کے جاتے ہی زہرا نے توصیفی انداز میں کہا ''بڑی اچھی فطرت ہے تمہاری جیٹھانی کی۔ جب بھی ملتی ہے محبت سے دل موہ لیتی ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی۔ ثمن بھابھی کو دیکھ کر ہی دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہ یہاں نہ ہوتیں تو میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہو جاتا۔'' اروی نے بے ساختہ دل سے اظہار کیا۔ زہیر فوراً ٹھٹھک کر پوچھنے لگا۔ ''کیا مطلب؟ تمہیں یہاں کوئی پرابلم ہے اروی۔''

''آں......'' وہ بھی بھائی کی توجہ اور لہجے پر چونکی۔

''نن...... نہیں بھائی!'' زہرا بھی آملیٹ اور پراٹھے کا کچھ حصہ پلیٹ میں رکھے ہمہ تن متوجہ بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

''پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ ''وہ'' نہ ہوتیں تو تمہیں بہت مشکل ہوتی۔'' زہیر نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''ایسے ہی کہہ دیا بھائی......'' اروی نے مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ''اس کے کہنے کا مطلب ہے کہ سسرال کے نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں ثمن کی وجہ سے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔''

''جی امی...... میرے کہنے کا یہی مطلب ہے۔ ثمن بھابی واقعی بہت اچھی ہیں۔ اچھا آپ آرام سے ناشتہ کریں۔ یہ باتیں چھوڑیں۔'' اروی نے ان کا دھیان بٹایا۔

''ہاں ابھی ہمیں اصتم سے بھی ملنا ہے اور پھر تمہاری ساس کو بھی ہاسپٹل دیکھنے جانا ہے۔'' زہرا نے بھی بات ختم کی۔ اروی نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

☆......☆......☆

سبرینہ ہاسپٹل سے آ گئی تھی۔ اپنے لیے چائے کا مگ لے کر وہ انعم کے کمرے میں چلی آئی۔ اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اروی کی امی اور بھائی آئے ہیں۔ انعم بھی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی ''آپ کہاں تھیں صبح سے؟'' سبرینہ کو دیکھتے ہی انعم نے بے اختیار پوچھا۔

''میں ہاسپٹل گئی تھی...... کیوں؟ خیریت؟'' سبرینہ اس کے بیڈ پر آرام سے بیٹھ گئی۔

''خیریت کہاں؟ آج تو میں نے اروی بی بی کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے ہیں۔'' انعم نے قدرے اترا کر کہا۔

''اچھا!! ایسا کیا ہوا؟'' سبرینہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔

''ہونا کیا تھا۔ صبح صبح اس کے بھائی اور اماں پھر ٹپک پڑے۔ میں ثمن بھابھی سے بات کر رہی تھی اور وہ چھپ کر باہر کھڑی میری باتیں سن رہی تھی۔''

''اچھا...... ؟ کیا اس نے کچھ کہا، میرا مطلب ہے تمہاری باتیں سن کر تو وہ پھٹ پڑی ہوگی۔'' سبرینہ حیران ہوئی۔

''اس کی اتنی مجال؟...... میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ وہ بول سکتی تھی؟ میں نے اسے رنگے ہاتھوں، کان لگا کر باتیں سنتے پکڑا ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں اس بارے میں اصم بھائی سے بات کروں۔'' انعم جوش میں بولی۔ سبرینہ کافی محظوظ دکھائی دے رہی تھی ''اگر اس نے اصم کو پہلے ہی چار لگا کر بتا دیا تو!''

''بتاتی ہے تو بتا دے'' انعم کو جیسے کوئی پرواہ نہیں تھی

''سوچ لو...... کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے۔ اگر اس نے اصم کو بھڑکا دیا تو...... ایسی عورتوں کا کیا بھروسہ؟ اصم کو تمہارے خلاف کر سکتی ہے۔'' سبرینہ نے اپنے طور پر ہمدردی جتائی حالانکہ دل سے وہ چاہتی یہی تھی۔

''اصم بھائی میرے خلاف نہیں ہو سکتے......! اور پھر اروی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اصم بھائی سے کچھ کہے۔'' انعم نے منہ بنا کر بڑے زعم سے بات مکمل کی۔

''ہمت تو خیر اس میں بہت ہوگی۔ وہ جس ماحول سے آئی ہے ناں وہاں سسرال والوں سے نمٹنے کی فل ٹریننگ دی جاتی ہے۔ تم کسی بھول میں نہ رہنا۔'' سبرینہ نے اسے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔

''پھر آپ مجھے بھی نہیں جانتیں رینا بھابھی۔ میرے آگے اس کی دال نہیں گلے گی۔'' انعم کے تیور دیکھ کر سبرینہ کے چہرے پر بڑی محظوظ سی کیفیت ابھر آئی تھی۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اس کا کام خود بخود آسان ہونے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اصم اٹھنے کے بعد ناشتہ کر چکا تو اروی نے اپنی امی اور بھائی کو اوپر ہی بلا لیا۔ رسمی دعا سلام اور خیر و عافیت کے بعد اصم شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''آنٹی میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ آنے سے پہلے بتا دیجیے گا۔ ڈرائیور پک کر لیتا۔ آپ کیوں فارملٹیز میں پڑی رہتی ہیں۔''

''ایس...... ی، کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ زہیر کو بھی میرے ساتھ آنا تھا اس لیے آنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔'' زہرا نے قدرے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔ ان کی جھجک میں خوف بھی تھا کہ کہیں ان کی کوئی بات

داماد کو بری نہ لگ جائے۔

''پھر بھی آنٹی..... گھر میں کتنی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں..... اگر.....''

''اصم بھائی اگلی بار آنا ہوگا تو آپ کو ضرور انفارم کردیں گے۔ ابھی تو اچانک پروگرام بنا اور ہم آ گئے۔ آنٹی کے ہاسپٹلائز ہونے کا بھی ہمیں یہیں آ کر پتہ چلا۔''

زہیر نے بھی بڑے سبھاؤ سے بات کا رخ بدلا۔

''ہاں! بی بی جان کو بھی اچانک ہی کچھ ہوگیا۔ اروی..... بی بی جان کی کیا کنڈیشن ہے۔ اب ان کے پاس کون ہے؟'' بی بی جان کے لیے وہ یکدم فکرمند ہوگیا۔ اروی جو اپنے کسی احساس میں گم تھی یکدم چونک اٹھی انعم کی باتیں اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''جی..... جی..... کیا بات.....'' اس کی غیر حاضر دماغی پر زہرا اور زہیر تو حیران تھے ہی اصم بھی حیرت کے ساتھ چڑ اٹھا..... ''کہاں گم ہو تم؟ میں نے تم سے بی بی جان کے بارے میں پوچھا ہے۔ اب وہ کیسی ہیں ان کے پاس کون ہے؟'' اصم نے حتی الامکان کوشش سے اپنی اندرونی کیفیت و چڑ کو قابو کیا تھا۔

''انہیں ابھی ہوش تو نہیں آیا..... لیکن ثمن بھابی بتا رہی تھیں اب وہ بہتر ہیں اور بی بی جان کے پاس اب نیلم ہے۔'' اروی نے ماں اور بھائی سے نظریں چرا کر جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اصم بھی سن کے جیسے مطمئن ہوگیا۔ اسے خود بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ اچانک چڑنے اور جھنجلانے کیوں لگتا ہے۔

''اور سناؤ زہیر کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

''ایسا کچھ خاص نہیں۔ اسی ہفتے سی ایس ایس کے ایگزام ہونے والے ہیں'' زہیر نے قدرے جھجک کر بتایا۔ ''او..... ہاں! اروی نے شاید بتایا تھا مجھے۔ Best of luck..... یار اس کے بعد کیا ارادے ہیں۔ اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کرو گے یا سول سروس جوائن کرو گے؟'' اصم اب نارمل ہو کر بات چیت کر رہا تھا۔ اروی کے چہرے پر یک گونا اطمینان بکھرنے لگا۔

''ابھی ایگزام کے بعد رزلٹ تو آ جائے.....'' زہیر بھی بمشکل خود کو جھجک سے نکال سکا۔

''پھر بھی کچھ تمہاری پلاننگ بھی تو ہوگی۔''

''میری پلاننگ تو یہی ہے اصم بھائی کہ جلدی سے جاب پر لگ جاؤں اور اپنے گھر والوں کو بہترین لائف اسٹائل دوں۔'' زہیر نے پہلی بار بلا جھجکے کہا۔

''بیٹا اللہ کا شکر ہے۔ ہم ابھی بھی لاکھوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔'' زہرا نے جیسے سرزنش کی۔

''امی..... بہتر سے بہترین کی خواہش تو ہر انسان کو ہوتی ہے اور پھر مجھے معلوم ہے بھائی یہ باتیں ورده کی وجہ سے کر رہے ہیں۔'' اروی نے بھائی کا دفاع کیا۔ زہرا نے بیٹی کے لہجے میں کچھ محسوس کیا تھا۔ مائیں اکثر بیٹیوں کی باتیں بنا کہے بھی سمجھ جاتی ہیں۔ انہیں کچھ حیرت ہوئی۔

''ہاں..... صحیح کہہ رہی ہو۔'' زہیر نے فوراً بہن کی تائید میں کہا ''اس نے تو مجھ سے وعدہ بھی لے لیا ہے کہ ٹریننگ کے بعد جاب لگتے ہی آپی کے شہر میں گھر لے لوں..... میں نے بھی کہہ دیا کہ اگر یہاں جاب لگے گی تو یہیں گھر لے لوں گا۔ اس دن سے وہ رات دن دعائیں کر رہی ہے۔'' زہیر نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔ اس

کے چہرے پر بہن کی محبت جگمگا رہی تھی۔

''یہ تو اچھا ہو جائے گا بھائی...... میں بھی آپ لوگوں سے جلدی جلدی مل لیا کروں گی۔'' اروی کے لہجے میں بولتی حسرت پر اصم نے بے ساختہ چونک کر اروی کی جانب دیکھا۔ زہرا اور زہیر کے لیے یہ اس کی کوئی بڑی معصوم سی خواہش تھی۔

''ہاں...... بس پھر تم بھی دعا کرنے میں لگ جاؤ۔ انشاء اللہ میری کوشش رہے گی کہ میری اے کلاس پوزیشن ہو......''

''انشاء اللہ۔ ضرور بھائی آپ کا رزلٹ ہمیشہ کی طرح شاندار ہوگا۔'' وہ جیسے بھول ہی گئے تھے کہ اصم بھی ان کے درمیان موجود ہے۔''

''اروی تم پر کوئی پابندی تو نہیں ہے تم ابھی بھی جب چاہو ملنے جاسکتی ہو۔''

اصم نے اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ تینوں کو ہی شدت سے محسوس ہوا کہ شاید اصم کو برا لگا ہے۔

''بیٹا...... وہ...... اروی کے کہنے کا مطلب تھا کہ ایک ہی شہر میں ہونے کی وجہ سے ہم لوگوں کو آسانی ہو جائے گی۔'' زہرا نے مصلحت سے بات سنبھالتے ہوئے بیٹی کا دفاع کیا۔ اور زہیر کو بھی سنجیدگی سے دیکھا۔

''جی...... جی...... اگر ابو مانے تو ایسا ممکن ہوگا۔ وہ نہ تو ارلی ریٹائرمنٹ لیں گے اور نہ ہی اپنا ٹرانسفر کرانے پر راضی ہوں گے۔'' زہیر نے بھی اپنی بات سے ماحول کے تناؤ کو کم کرنا چاہا۔ اروی یکدم خاموش ہوگئی تھی۔ اسے بھی لگ رہا تھا کہ وہ بے وقت بے موقع بات کر گئی ہے۔ ان کے واپس جانے تک اروی نے تو کچھ خاص بات نہیں کی البتہ اصم نے انہیں ٹھہرنے کے لیے ضرور اصرار کیا تھا جس پر زہرا نے بڑے سبھاؤ سے معذرت کرلی۔

''بیٹا۔ وردہ گھر پر اکیلی ہوگی۔ دن تو وہ گزار لے گی۔ رات کو اسے مشکل ہوگی۔ زہیر کے ابو کو بھی دیر سے آنا ہے۔''

''چلیں Next time آپ کا کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا...... بلکہ آپ وردہ کو بھی لے کر آیئے گا۔ اروی میری وجہ سے نہیں جاتی۔ آپ لوگ ہی اس سے ملنے آجایا کریں۔''

اصم بالکل پہلے کی طرح بات کر رہا تھا۔ زہرا کے دل سے بوجھ ہٹ گیا۔ اصم نے ڈرائیور کو کال کر کے خصوصی ہدایت کے ساتھ ہاسپٹل کے بعد ٹرانسپورٹ اسٹیشن تک چھوڑ کر آنے کی تنبیہ کی۔ حنیف چچا (ڈرائیور) کو ہاسپٹل میں ہمہ وقت موجود تھا۔ یہ آفس ڈرائیور تھا۔ اروی اندر ہی اندر خجالت کا شکار تھی، اسی کیفیت میں وہ ماں اور بھائی کو رخصت کرنے چلی آئی۔

☆......☆......☆

نیلم بی بی جان کے پاس صبح سے بیٹھی تھی۔ بی بی جان کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹرز نے رات تک ہوش میں آنے کی نوید دی تھی۔ زہرا اور زہیر جب زبدہ شریح کی عیادت کو پہنچے تو وہ اونگھ رہی تھی۔ شریح خان ابھی کچھ دیر کے لیے وہاں سے گھر کی جانب گئے تھے۔ پرائیویٹ روم میں موجود نرس نے زہرا کی آمد پر نیلم کو متوجہ کیا ''بی بی آپ کے مریض کی عیادت کو کچھ لوگ باہر آئے ہیں۔ آپ بولیں تو انہیں آنے دوں یا......''

''ہاں، ہاں آف کورس آنے دو۔ گھر سے یقیناً کوئی آیا ہوگا۔'' وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ اپنے بال سمیٹ کر کپڑوں کو نادانستہ درست کیا۔ نرس نے دروازہ کھول کر زہرا کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ زہرا کو دیکھتے ہی نیلم بے ساختہ ان کی طرف لپکی۔ ''آ...... نٹی...... آ...... پ؟ السلام...... علیکم!'' زہرا کی آمد اس کے لیے حیران کن تھی اور پھر ان کے ساتھ زہیر کو دیکھ کر وہ یکدم جھجک کر فاصلے پر ہی رک گئی۔ زہیر سے پہلی بار سامنا ہوا تھا اسی لیے وہ جھجک رہی تھی۔

''وعلیکم السلام...... ہمیں یہاں آکر زبدہ بھابھی کی طبیعت کا علم ہوا۔ اب کیا کنڈیشن ہے ان کی؟'' زہرا نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

''ڈاکٹرز تو کہہ رہے ہیں کہ بی بی جان ٹھیک ہو جائیں گی...... مگر انہیں تو ابھی ہوش ہی نہیں آیا......'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ صبح سے طرح طرح کے خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

''بیٹا پریشان نہیں ہوتے۔ انشاء اللہ تمہاری بی بی جان جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ دعا کرتے ہیں، گھبراتے نہیں۔'' انہوں نے ایک بار پھر اسے دلاسہ دیا۔

'پتہ نہیں آنٹی...... بی بی جان کو اچانک کیا ہو گیا۔ وہ تو کبھی بیمار ہی نہیں ہوئی تھیں۔'' وہ تقریباً رو دینے والی تھی۔ زہیر خاموشی سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ درمیان میں بولا ''مائیں اکثر اپنے بچوں سے اپنی تکالیف چھپا جاتی ہیں یا پھر بچے اپنے بڑوں کے دکھ اور بیماری کا احساس ہی نہیں کر پاتے۔'' زہیر نے تو ایسے ہی ایک بات کی تھی وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔ زہرا نے بھی چونک کر بیٹے کو دیکھا۔

''بیٹا اس کے کہنے کا مطلب ہے والدین اپنے بچوں کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے ان سے اپنی تکالیف وغیرہ چھپا لیتے ہیں۔ اچھا تم فکر نہیں کرو تمہاری بی بی جان جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''آمین...... آنٹی آپ بھی دعا کیجیے گا۔'' نیلم کو اپنی بیقراری سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاید ہاسپٹل کے ماحول نے اس کی سوچوں کو منفی کر دیا تھا۔

''یہ کہنے کی بات تو نہیں ہے بیٹا۔ تم آرام سے بیٹھو، میں انشاء اللہ پھر چکر لگاؤں گی۔'' زہرا نے اسے تھپتھپا کر ایک بار پھر تسلی دی۔ چند لمحے زبدہ خان کے بیڈ کے پاس کھڑی ہو کر انہیں دیکھا وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر تھیں۔ ان کے دل سے یکدم دعا نکلی۔

''یا اللہ انہیں جلد تندرست کر دے۔ میری بیٹی پر ان کی بیماری کا الزام بھی نہ آجائے۔ اور نہ جانے کیوں پریشان ہے۔'' زہیر ان سے پہلے کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ باہر آئیں تو انہیں آنکھیں پونچھتے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

''امی......؟ آپ کو کیا ہوا......؟''

''کہ...... کچھ نہیں......'' وہ یکدم سنبھل گئیں۔

''کیا بات ہے آپ بھی کچھ چھپا رہی ہیں ہم سے۔''

زہیر نے جیسے کریدا ''میں کیا چھپاؤں گی۔ بچی کی ماں کو پریشان دیکھا تو دل بھر آیا۔ اللہ سے دعا کی کہ زبدہ بھابی کو کچھ نہ ہو۔''

''وہ بچی ہے؟...... امی وردہ کی ہم عمر تو ہوگی...... اور پھر ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹھیک ہو ہی جائیں گی۔فضول کے وہم۔عجیب بچکانہ رویہ تھا اس ''بچی'' کا......

''تم تو بس رہنے ہی دو۔تمہیں کیا پتہ بیٹیوں کے لیے مائیں اور ماؤں کے لیے بیٹیاں کیا ہوتی ہیں؟'' وہ ٹالتی ہوئی آگے بڑھیں۔

''اور بیٹوں کا کوئی حق نہیں ہوتا ماؤں پر......'' وہ بھی ساتھ چلتا ماں کو جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

''بس!...... یہ بحث یہاں نہیں ہوگی...... دیکھو ڈرائیور کہاں ہے ہماری کوچ کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' زہرا نے اسے چپ کرا دیا وہ بھی ہنستا ہوا قدم اٹھاتا کاریڈور سے جلدی جلدی نکلتا چلا گیا۔زہرا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

☆......☆......☆

اروٰی کی امی جانے سے پہلے ثمن سے مل کر اس کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے گئی تھیں۔ساس کی غیر موجودگی میں بھی اس نے انہیں جو عزت و احترام دیا تھا وہ اس کی معترف تھیں حالانکہ سبرینہ اور انعم اس کی امی سے رسماً بھی ملنے نہیں آئی تھیں اس بات کا اسے افسوس بھی تھا اور ملال بھی۔گویا یہ بات ثابت تھی کہ اس کے گھر والوں کی ان دو کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ثمن نے شاید جا کر اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا تھا تو وہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق اس کے پاس چلی آئی۔وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں پر ہی کھڑی تھی۔

''اروٰی...... یہ تم کیا ہر کسی کی شکایتیں لگاتی پھر رہی ہو؟'' سبرینہ کا موڈ اور لہجہ بے حد خراب تھا۔

''میں...... میں نے؟...... کے...... سی...... شکایتیں...... میں سمجھی نہیں سبرینہ بھابھی؟'' وہ بے حد حیرت سے بولتی دیکھتی پہلی سیڑھی سے ہی واپس نیچے اتر آئی۔''اتنی ناسمجھ تم ہو نہیں جتنی تم بھولی بنتی ہو۔تمہیں اتنا ہی شوق تھا اپنی امی کو مجھ سے سلام کروانے کا تو ڈائریکٹ میرے پاس آجاتیں۔ثمن بھابی کو بھڑکانے کی کیا ضرورت تھی۔'' سبرینہ کی نیند خراب ہوئی تھی۔اسی لیے اس کی چڑچڑاہٹ عروج پر تھی۔

''آ...... پ...... کیا بات کر رہی ہیں؟ میں نے ثمن بھابھی سے کچھ نہیں کہا'' اروٰی روہانسی ہوگئی۔اسے معاملے کا صحیح اندازہ ہی نہیں تھا۔ثمن بھی آوازیں سن کر آگئی تھی۔

''سبرینہ...... اروٰی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔میں تو خود تمہیں اپنے طور پر سمجھا رہی تھی کہ اس گھر کی بہو ہونے کی حیثیت سے تمہارا زہرا آنٹی سے آکر ملنا ضروری تھا۔'' ثمن نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''بس! بس!...... ثمن بھابی اب آپ اس کی حمایت تو نہ کریں۔'' وہ ثمن سے بھی الجھ کر بولی۔

''اس میں حمایت کی کیا بات ہے جب اروٰی نے کچھ کہا ہی نہیں تو تم اس سے کیوں الجھ رہی ہو؟''

''میں الجھ رہی ہوں؟...... آپ نے آکر لیکچر سنا دیا۔مجھے فرشتوں نے خبر تو نہیں دی تھی کہ اس کی امی آج ہی آکر آج ہی چلی جائیں گی۔پہلے کی طرح رکیں گی نہیں۔'' سبرینہ نے خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔سبرینہ بھابھی میری امی کب یہاں رکی ہیں؟ میرے ساتھ ہاسپٹل میں رہی تھیں اور پھر اسی دن واپس چلی گئی تھیں۔'' اروٰی کے لہجے میں بھی ذرا سی تلخی گھل گئی۔

آج دوسری بار اس کے میکے والوں کی آمد و رفت پر اعتراض اٹھا تھا۔ اس کا لہجہ بدلنا ہی تھا۔ ثمن نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ بھی کیا نہ بولنے کا۔ ثمن نہیں چاہتی تھی کہ گھر کی فضا خراب ہو۔ بی بی جان کی غیر موجودگی میں اس قسم کے معاملات سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

''تو اس میں کیا ہمارا قصور ہے وہ رکتیں تو ملاقات ہو ہی جاتی۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''سبرینہ ختم کرو اب یہ قصہ میں تو تم سے کہہ کر پچھتا رہی ہوں۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ رات کو بی بی جان کے پاس شاید تمہیں ٹھہرنا پڑے۔'' ثمن بھی زچ ہو اٹھی تھی۔ اروی کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اس سے پہلے ثمن اسے کچھ کہتی وہ چہرہ موڑ کر آنسو چھپاتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سبرینہ بھی اپنے خراب موڈ کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ثمن کھڑی اپنی غلطی پر پشیمان سی تھی۔

☆......☆......☆

سبرینہ اپنے خراب موڈ کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے سیل فون کی رنگ ٹون بج رہی تھی۔ اس نے اپنے اسی موڈ کے ساتھ بنا اسکرین فون دیکھے کال ریسیو کی۔

''ہیلو......! کون ہے اس وقت؟''

''ہیلو!!...... بھئی میں شہری...... پہچانا نہیں مجھے۔ میرا نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟'' دوسری طرف سے شہرینہ کو سن کر اسے یکدم اپنے لہجے کا احساس ہوا ''سوری یار...... بس' میرا موڈ خراب تھا' اس لیے تمہارا نام ہی نہیں دیکھا۔'' بہن کے لیے اس کا مزاج یکدم ہی تبدیل ہوا تھا۔

''موڈ کو کیا ہوا......؟ خیریت......؟''

شہری نے بہن کو کریدا۔

''جب سے اصم سے شادی ہوئی ہے، یہاں سے خیریت تو رخصت ہی ہو گئی ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت سر پر سوار رہتی ہے۔'' سبرینہ نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''اب کیا، ہو گیا؟'' شہرینہ نے تجسس ظاہر کیا۔

''ہونا کیا ہے۔ اصم کی بیوی نے گھر میں اچھا خاصہ ڈرامہ Create کر رکھا ہے۔''

''ڈرامہ......؟ کیا مطلب؟ تمہاری ٹکر پر آ گئی ہے۔'' شہری نے بہن کو یونہی چھیڑا۔

''اونہہ میری ٹکر......! میرے مقابل تو وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔'' وہ نہایت نخوت سے بولی۔

''پھر ایسا کیا ہوا...... جو تمہارا موڈ خراب کر گیا۔'' شہرینہ کو ایسی خاص دلچسپی تو نہیں تھی بس بہن کے لیے دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔

''بس اسی وجہ سے آج ثمن بھابی مجھ سے الجھ پڑیں۔ خیر انہیں تو میں سنبھال لوں گی تم بتاؤ تم نے آج اس وقت کیسے کال کی۔'' شام ہونے والی تھی وہ عموماً رات گئے بات کیا کرتی تھی سبرینہ کی نگاہ روم کلاک پر تھی

''بس ویسے ہی بور ہو رہی تھی سوچا تم سے گپ شپ کر لوں۔''

''سنو چندا...... اپنی بوریت فائق کو کال کر کے دور کیا کرو۔ تمہارے پاس یہ ایک ہی چانس ہے اسے مس مت کرو۔'' سبرینہ نے فوراً ہی بہن کو صلاح دی۔

''سبرینہ آئی ڈونٹ نو مجھے فائق کے سر پر سوار ہونا اچھا نہیں لگ رہا۔'' شہری کشمکش میں تھی۔

''یہ سوچتی رہیں تو پھر فائق کو بھول جاؤ۔ پاگل لڑکی...... میں یہاں تمہارے لیے پاپڑ بیل رہی ہوں اور تم ہو کہ......'' سبرینہ نے زچ ہو کر اسے جھاڑا۔

''سبرینہ...... فائق شاید میری طرف Attract ہی نہیں ہونا چاہتا اس کی نظر میں صرف انعم ہے۔ مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''تم کوشش تو کرو...... اور انعم کو تو تم بھول جاؤ۔ وہ فائق کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی اور فائق بھی ایسا مجنوں نہیں ہے جو اس کے آگے پیچھے پھرے گا تم بس فائق کو اپنی محبت کا احساس دلاتی رہو۔''

دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شہری کسی سوچ میں تھی۔ سبرینہ نے اپنی بات دہرائی۔

''سن رہی ہو نا میری بات...... اب فون بند کرو اور فائق کو کال کرو۔'' سبرینہ نے پھر خود ہی رابطہ منقطع کر کے فون بیڈ پر اچھال کر رکھا۔

''بے وقوف...... پاگل...... میں کس مشکل سے یہ سب کر رہی ہوں اور وہ اپنی Feelings میں ہے'' سبرینہ نے بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ بستر پر جگہ سنبھالی۔ اسے ابھی کچھ دیر سونے کی تمنا تھی۔ اس نے ہر خیال ذہن سے جھٹکا۔

☆......☆......☆

ارویٰ کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ وہ اوپر آتے ہی بے اختیار ہو گئی۔ اصم جو فیصل سے فون پر حال احوال کہہ سن رہا تھا اس کی آمد پر متوجہ نہیں ہوا تھا البتہ اس کی سسکیوں نے اسے ضرور متوجہ کر لیا تھا۔ وہ آدھی لیٹی آدھی بیٹھی تکیے پر منہ رکھے بے تحاشہ روئے چلی جا رہی تھی۔ اصم نے فیصل سے معذرت کر کے اپنا فون بند کر کے رکھا اور پھر اسے پکارا۔

''اروی...... کیا ہوا؟...... اروی...... سن رہی ہو۔ میں تمہیں بلا رہا ہوں'' اصم نے پہلے معمول کے لہجے میں پکارا پھر قدرے چڑ کر مخاطب کیا۔ اروی نے تکیے سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور اگلے ہی لمحے دوبارہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھی۔

''کچھ بتاؤ گی بھی سہی کہ کیا ہوا ہے؟ آنٹی زہرا پہلی دفعہ تو آ کر نہیں گئی ہیں جو تم اس طرح React کر رہی ہو؟'' اصم بھی اس کی سسکیاں سن کر جھنجلا گیا۔ اروی اس طرح اٹھی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔

''آپ کو بھی...... میری امی اور گھر والوں کے آنے جانے پر اعتراض ہے؟ تو ٹھیک ہے میں انہیں منع کر دوں گی۔''

اروی کا ردعمل اتنا شدید تھا اور لہجہ پہلی بار بلند و سخت تھا کہ اصم کی آنکھوں میں بھی بے یقینی آ ٹھہری تھی۔ اروی کا یہ روپ یہ رویہ پہلی بار دیکھا تھا اسے بے یقینی تو ہونی ہی تھی۔

''یہ کس طرح کی بات کر رہی ہو تم ہوش میں تو ہو؟'' اصم کی مردانہ انا ایک دم بیدار ہوئی تھی۔

''میں تو وہی کہہ رہی ہوں جو آپ سب چاہتے ہیں۔ ہم لوگ کمتر، کم حیثیت تھے یہ آپ نکاح کے وقت جانتے تھے۔ ہم پر ''احسان'' کرنے کے بعد میرے گھر والوں کا یہاں آنا ممنوع ہوگا یہ اسی وقت طے کر لینا

چاہیے تھا۔اب یہ جتانا کہ......!''

جوش میں بولتے بولتے اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تو وہ کھانسنے لگی۔

''بکواس بند کرو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا...... یہ خرافات تمہارے ذہن سے نکل نہیں سکتیں۔'' اصم نے بھی طیش میں بولتے ہوئے اٹھنے کی ناکام کوشش کی اس کوشش میں اس کے پاؤں نے زبردست جھٹکا کھایا تھا اور اسے لگا تھا درد کی تیز لہر سنسناہٹ کے ساتھ اس کی پورے وجود میں پھیل گئی۔اس کا رنگ تیزی سے متغیر ہوا تھا۔اروی کی نظریں اس پر تھیں اس کے حواس کھونے لگے۔سارے احساسات لمحوں میں منجمد ہو گئے، میکہ، ماں، بہن بھائی سب لمحے کے ہزارویں حصے میں پس پشت چلے گئے۔

''ا......ص......م......اصم......کیا ہوا......آپ......؟''

وہ بول نہیں پا رہی تھی لیکن فوراً لپک کر اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ کو یکدم سیدھا کیا تھا۔پلاسٹر میں جکڑی ہوئی ٹانگ کی ہڈی میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اصم نے اپنی تکلیف کی شدت کے باوجود اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹانا چاہا۔

''چ......لی......جاؤ......مت کرو......اروی نے اسے سہلانے کی کوشش کی تو اصم تکلیف میں بھی چیخا۔

''اصم......آپ کو درد ہو رہا ہے۔یہ لیں پین کلر لے لیں......'' وہ تیزی سے اٹھی اور اس کے لیے درد کی گولی اور پانی لے کر آ گئی۔

نہیں چاہیے......کچھ نہیں چاہیے۔دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

اصم نے ایک بار پھر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکا

''اصم......وہ......مجھے غصہ......انعم اور سبرینہ بھابی کو میری امی اور گھر والوں کے آنے پر شروع سے اعتراض ہے تو۔'' وہ صفائی دینے لگی

اصم اس وقت اپنی تکلیف میں تھا وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں ناں......چلی جاؤ......ورنہ......ورنہ'' اصم نے اس کا دوبارہ بڑھایا ہوا پانی ہاتھ سے دور کیا پانی سے بھرا گلاس دور جا کر گرا کارپٹ کی وجہ سے گلاس تو نہیں ٹوٹا البتہ پانی دور تک چھلک کر گیا اور اسی طرح اروی کی آنکھوں کے ساغر بھی چھلک اٹھے۔اسے اپنے عمل کے ملال کے ساتھ اصم کے رویے کا بھی دکھ تھا۔وہ آنسو بہاتی کمرے کے دوسرے دروازے سے ٹیرس پر نکل گئی۔اور کمرے کے اندرونی دروازے کے باہر کھڑی انعم اس کشمکش میں تھی کہ اندر جائے یا پلٹ کر نیچے چلی جائے۔وہ نجانے کب سے اسی ادھیڑ بن میں تھی اسی لمحے شمو نے آ کر اس کے اندر بڑھتے قدموں کو روک دیا۔

''انعم باجی خان بابا آ گئے ہیں۔آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ کو بتادوں۔'' وہ اپنی کارکردگی پر خوش تھی کہ انعم کسی طرح تو اس سے خوش ہو گی لیکن انعم کو اس وقت اس کی کارکردگی ایک آنکھ نہ بھائی۔

''بابا جان کے آنے کی تمہیں کیوں اتنی خوشی ہو رہی ہے۔جاؤ ان کے لیے جا کر چائے بناؤ یا ثمن بھابی سے کہو۔مجھے کیوں بتانے آ گئی ہو۔'' وہ چڑ کر بولی تو شمو بھی حیران ہوئی۔

'ہاہ......باجی آپ نے ہی تو کہا تھا کہ جب خان بابا آ جائیں تو میں آپ کو بتادوں۔''

''ہاں......کہا تھا......اب جاؤ اور یہاں گلا مت پھاڑو چلو نیچے'' انعم نے جھنجلاتے ہوئے دانت بھینچ کر

بات کی اور شمو کو واپسی کے لیے دھکیلا بھی اسے یکدم خیال آیا تھا کہ وہ اصم کے کمرے کے باہر عرفی ہے اروی اور اصم تک ان کی آواز جاسکتی تھی یا اروی باہر آسکتی تھی۔

☆......☆......☆

فائق آفس سے ابھی نکلا ہی تھا کہ راستے میں شہرینہ کی کال آ گئی۔ پہلے تو ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے توجہ نہیں دی لیکن شہرینہ بھی جیسے ٹھان چکی تھی کہ اس کی توجہ حاصل کر کے رہے گی تین چار بار نظرانداز کرنے کے بعد بالآخر فائق نے یہ سوچ کر کال لے لی کہ کہیں زیب خالہ کی طبیعت ہی خراب نہ ہو جو وہ مسلسل کال کیے جارہی ہے۔''

''ہیلو.....شہرینہ اینی پرابلم؟''

''فائق شکر ہے کہ آپ نے بھی میری کال ریسیو کی۔'' دوسری طرف سے بڑے مان کے ساتھ شکوہ ہوا۔

''سوری! میں ابھی آفس سے نکلا ہوں اور ڈرائیو کر رہا ہوں۔'' فائق کی معذرت میں احتیاط تھی یا بے نیازی، شہرینہ کو البتہ اچھا نہیں لگا۔

''سوری تو مجھے کہنا چاہیے جو آپ کو ڈسٹرب کیا ٹھیک ہے آپ ڈرائیو کریں۔'' شہرینہ کی آواز میں واضح ناراضگی تھی۔ فائق کو کچھ حیرت ہوئی۔ شہرینہ نے اپنی بات کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''اسے کیا ہوا؟'' وہ خود سے ہی بڑبڑایا۔ اور خود ہی اس سے رابطہ کیا۔ دوسری کوشش پر شہرینہ کی آواز سنائی دی تو فائق نے جھٹ کہا۔

''بات نہیں کرنی تھی تو کال کیوں کی تھی اور یہ تم کب سے بچوں کی طرح بات بات پر ناراض ہونے لگی ہو۔'' فائق کو بھی اپنی بے چینی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ شہرینہ کی ذرا سی خفگی پر بے چین کیوں ہو گیا۔

''جب سے لوگوں کے بدل جانے کا دکھ جھیلا ہے تب سے میں خود سے بھی ناراض ہو جاتی ہوں فائق۔'' شہرینہ کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جس کا اثر فائق پر بھی ہو رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے ''وہ'' نہ بدلا ہو۔ تم نے غلط اندازہ لگایا ہو۔ فائق کہنا کچھ چاہتا تھا مگر لفظ زبان سے کچھ اور ہی ادا ہوئے تھے۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو...... میں تو دوبارہ جی اٹھوں گی اگر ''کوئی'' یقین دلا دے کہ ایسا ہی ہے۔''
شہرینہ کی جذبوں سے لپٹی گندھی آواز فائق کی سماعتوں کو بھلی بھی لگ رہی تھی اور وہ آواز کے نشے میں ہی بہکنے کو تھا، چاہے جانے کی خواہش صرف عورت کی تمنا ہی تو نہیں ہوتی مرد بھی آرزو رکھتا ہے کہ اسے کوئی شدت سے چاہے۔ اسے یہ شدت شہرینہ کی ذات میں نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس سے ملنے کا وعدہ کرتا گھر تک پہنچا۔ انعم کی محبت کا خمار زائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

نیلم بی بی جان کی مسلسل بے ہوشی سے کچھ دل برداشتہ سی تھی گھر کا کوئی مرد بھی اس کے پاس نہیں تھا شام ڈھل رہی تھی بوجھل احساسات میں اسے چائے کی طلب ستا رہی تھی۔ وہ ہاسپٹل کے کیفے میں آرڈر تو دے سکتی تھی مگر وہ کیفے سروس سے فی الحال استفادہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے نرس کو بتایا اور خود کیفے سے نکل آئی ویسے بھی فون پر اپنے دوستوں سے واٹس اپ پر بات چیت چل رہی تھی سبھی اسے تسلیاں دلا رہے

کے علاوہ دعائیں بھی کر رہی تھیں لیکن جس سے ہمدردی کی توقع تھی ادھر سے ابھی تک کوئی دلاسہ تسلی کوئی حرف دعا بھی نہیں وصول ہوا تھا اسی لیے اس کا ذہن و دل بوجھل ہو رہے تھے نیلم بھی جس سفر پر گامزن تھی اسے اپنے ہم سفر پر زیادہ مان اور بھروسہ تھا اور یہ یقین بھی کہ وہ بنا کہے سنے اس کا درد اس کے دکھ سمجھنے کی صلاحیتیں رکھتا ہوگا اس کا یقین ٹوٹا تھا نہ ہی مان بکھرا تھا۔ بس ایک ''چاہ'' تھی کہ ''وہ'' آئے اور اس کے درد کا مداوا بن جائے۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں کاریڈور عبور کرتی کیفے کی جانب جاتی لفٹ تک پہنچ کر ابھی اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تیزی سے داخل ہوا اور اندر بڑھتے ہی بٹن کے ذریعے لفٹ کو منزل کی جانب گامزن کیا۔

نیلم پہلے تو کسی اجنبی کی مداخلت پر بوکھلائی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے حیرت زدہ بولی ''تم......؟......تم یہاں کیسے ؟'' زبان لڑکھڑائی تھی۔ بصارت پر یقین نہیں تھا۔ نظر کے سامنے جو تھا۔ وہ کوئی وہم تھا۔ گمان تھا کہ خواب...... آپ سے ''تم'' کا فاصلہ کب اور کیسے مٹا تھا نیلم کو خود بھی پتہ نہیں چلا تھا۔

''تھینکس گاڈ......تم ''آپ'' سے ''تم'' پر تو آئیں اور سوئیٹ ہارٹ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم پریشان ہو اور مجھے خبر ہی نہ ہو۔'' وہ محبت کے سحر انگیز لہجے میں بالکل کان کے قریب ہو کر بولا تو نیلم کا دل سینے میں نہیں کانوں میں دھڑکنے لگا۔ نیلم نے بے ساختہ ہاتھ کی آڑ سے چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر لفظ لبوں سے نکلنے سے پہلے لفٹ ٹاپ فلور پر رک گئی۔

ہاسپٹل کا کیفے ریسٹورنٹ اور شاپنگ ایریا اوپر ہی تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کا اجنبی آشنا اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ ''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' نیلم یکدم گھبرا گئی۔ گھر والوں میں سے کسی کے دیکھ لینے کا اندیشہ اس کی روح فنا کر رہا تھا۔ ''کیا ہے یار! یکدم ہی آنکھیں پھیر لیتی ہو۔'' ساتھ چلتے ہوئے شکوہ ہوا

''آپ کو بتایا کس نے......؟'' وہ قدم روک کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ نگاہیں ادھر ادھر بھی تھیں کہ کہیں کوئی جاننے والا تو نہیں۔ ''میری محبت پر شک نہ کیا کرو۔ تمہارے پل پل کی خبر رکھتا ہوں۔'' وہ سحر انگیز لہجے میں بولتا اس کے ساتھ کیفے کے ایک کونے میں خالی جگہ دیکھ کر آ گیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا

''م......میں، یہاں صرف چائے لینے آئی تھی۔ مجھے واپس جانا ہے۔ بی بی جان کے پاس کوئی نہیں ہے۔'' اس کی جھجک میں خوف، اندیشے تھے مگر چہرے پر اس کے ساتھ وقت کو امر کرنے کی چاہ بھی جگمگا رہی تھی۔

''میں تمہیں روک تو نہیں رہا......'' عامر اسد نے اسے نظروں کے حصار میں لے لیا اور خود کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''پلیز عامر...... مجھے مجبور مت کرو۔ کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔'' وہ نہ نہ کرتی بیٹھ چکی تھی۔ عامر اسد کی شخصیت میں کوئی سحر تھا یا وہ مقابل کو بے بس کرنا جانتا تھا۔ نیلم کو خود بھی نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کیوں اپنی ہی سوچ کے خلاف عمل کر رہی ہے۔

''نیلم......یار مجبور و بے بس تو تم نے مجھے کر دیا ہے۔ 'میری سوچ صرف تم سے شروع، تم پر ہی ختم ہوتی ہے۔'' پھر اسی لہجے میں بولا۔ بیرا آیا تو عامر نے اسے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس بھی آرڈر کیے۔ اس دوران نیلم سامنے بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ ''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں تم نے فیس بک پر اپنی بی بی جان کی بیماری کا بتایا تھا۔ کیا میں پڑھ کر بھی نہ آتا۔'' وہ یکدم سنجیدہ ہو

کر پوچھ رہا تھا یہی تو وہ چاہتی تھی کہ عامر آئے اور اس کے اندر اترتے دکھ کو بے اثر کردے۔ ایسا ہی ہوا تھا ساری بوجھل احساسات یکدم اڑن چھو ہو گئے تھے، ہر خوف زائل ہو گیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ اس کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھی اور وہ سامنے بیٹھا اپنی محبت کے منتر پھونکتا اسے مزید بے بس کرتا جا رہا تھا۔

چمن، سبرینہ، بابا جان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ انعم بھی اصم کے کمرے سے نیچے اتر کر آ گئی تھی۔ وہ نیچے آئی تو بابا جان بی بی جان کی موجودہ کیفیت و ہیت پر سنجیدہ و رنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی اس کنڈیشن کا ذمے دار کون ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آئندہ سب ہی اپنے اپنے مسائل خود حل کریں انہیں انوالو نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔'' سبرینہ ان کی بات سن کر اپنے طور پر سعادت مندی جتاتے ہوئے بولی ''مگر بابا جان...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے بی بی جان گھر کی سربراہ ہیں۔ انہیں گھر کے معاملات سے دور کیسے رکھا جا سکتا ہے انہیں دکھ بھی ہوگا، اور کم از کم مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ بی بی جان کو گھر کے معاملات سے بے خبر رکھا جائے۔''

''میں مسائل سے دور رکھنے کی بات کر رہا ہوں۔ معاملات سے نہیں اور انعم...... بیٹا آپ بھی فائق سے رابطہ کریں وہ آپ سے ملنے بھی نہیں آتا...... شاید آپ کی خالہ جان کو یہ دکھ بھی ہے۔'' بابا جان نے سبرینہ کو مزید سنجیدگی سے جواب دے کر انعم کو مخاطب کیا انعم کی آنکھوں میں حیرتیں سمٹ آئی (''تو کیا بابا جان بھول گئے ہیں کہ میں کس ''حال'' میں یہاں آئی تھی۔'') وہ انہیں یاد دلانا چاہتی تھی لیکن اسی لمحے بابا جان کا موبائل بجنے لگا اور وہ فون سننے کے لیے لاؤنج سے منسلک کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی انعم تلملائی۔

''میں کیوں اس سے رابطہ کروں۔ کسی کو سمجھ کیوں نہیں آتا کہ میں اس ظالم انسان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔''

''انعم بابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس وقت کسی ماں کے لیے اس سے زیادہ پریشانی کی کیا ہو گی کہ ان کی بیٹی بلا سبب میکے آ کر بیٹھ جائے۔'' ثمن نے اپنے بڑے ہونے کا حق ادا کیا۔ انعم مزید بھڑک گئی ''بلا سبب......؟ میرا وہاں سے آنا بلا سبب لگتا ہے آپ کو...... جو کچھ وہاں میرے ساتھ ہوتا ہے یہاں آپ کو ایک دن بھی برداشت کرنا پڑے تو پھر دیکھتی ہوں کون یہاں ٹکتا ہے۔'' وہ جوش جذبات میں بولتی دونوں کو حیران کر گئی۔

''انعم تم بلاوجہ بات بڑھانے کی عادی ہو گئی ہو۔'' ثمن نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہاں سے جانے میں ہی مصلحت سمجھی۔

''ثمن بھابی آپ کو بلاوجہ کیڑے نکالنے کی عادت ہو گئی ہے آپ یہ بھول رہی ہیں کہ یہ گھر میرے والدین کا ہے اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی ضرورت نہیں ہے میرے کسی معاملے میں دخل اندازی کی۔'' وہ اس طرح چیخ کر بولی کہ اس پر ثمن نے کوئی تیر پھینک دیا ہو۔ بابا جان فون سن کر آ گئے تھے۔ انعم کا لب ولہجہ انہیں پریشان کر گیا

''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' ثمن سبرینہ تو اپنی جگہ پر جامد ساکت ہو ہی گئی تھیں، انعم کا بھی لہو خشک ہو گیا تھا۔

''انعم...... مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ اپنی بڑی بھابی کے ساتھ تمہارا یہ رویہ۔ بے حد افسوس کی بات ہے معافی مانگو ان سے......'' بابا جان کی گونجدار آواز ٹیرس پر بیٹھی اروی کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ اپنا رونا

بھول کر تیزی سے کمرے کے بجائے دوسرے دروازے سے سیڑھیاں اتر آئی۔اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے۔دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔خدشے کچھ اور تھے مگر منظر کچھ اور تھا۔انعم کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

''با......با......با......جان'' انعم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان اس سے اتنے سخت لہجے میں بات کریں گے ''مجھے کچھ نہیں سننا......زبدہ کی غیر موجودگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس گھر کا نظام ہی الٹ دیا جائے۔بڑوں کی عزت رشتوں کا احترام ہی بھلا دیا جائے۔'' وہ سبھی کو باور کرا رہے تھے یا صرف انعم کو سمجھایا جا رہا تھا۔انعم ہٹ دھرمی سے کھڑی تھی۔

''چھوڑیں بابا جان انعم کو اگر پسند نہیں ہے کہ کوئی اسے سمجھائے تو میں آئندہ احتیاط کروں گی آپ ناراض نہ ہوں۔''

ثمن نے اپنے طور پر معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔انعم پاؤں پٹختی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔بابا جان غصے، شرمندگی وندامت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ لاؤنج سے بیرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ان کا ذہن اس صورت حال پر بری طرح الجھ رہا تھا وہ ڈرائیور کے ساتھ پھر سے ہاسپٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

''اف یہ لڑکی......کیسی نڈر ہے میری تو جان ہی سوکھ رہی تھی۔بابا جان کا غصہ......ثمن بھابی آپ کا حوصلہ ہے۔'' سبرینہ کا اپنا انداز تھا۔بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے اس نے ثمن کو داد دی یا شرمندہ کیا یہ وہی جانتی تھی اروٰی کو ایسے لگا تھا وہ ثمن کو بھی اس کی کم حیثیتی بلکہ اس کی ''اوقات'' جتا رہی ہے۔اروٰی نے اس وقت سامنے جانا مناسب نہیں سمجھا بہت آہستگی سے اس نے واپسی کے لیے قدم موڑ لیے۔

☆......☆......☆

فائق سیٹی کی دھن پر کچھ گنگناتا اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تو لاؤنج میں بیٹھی صالحہ درانی نے قدرے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔آج اس کا رنگ ڈھنگ ہی نیا تھا۔اس کی خوشی چہرے سے چھلک رہی تھی بہت دنوں بعد وہ اس قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔وہ انہیں بھی نظر انداز کرتا ہوا پاس سے گزرنے لگا تو انہوں نے بیٹے کو اپنے ہونے کا احساس دلایا ''فائق کدھر کی تیاری ہے۔ابھی تو آئے تھے تم......؟'' صالحہ کی پکار پر فائق اس طرح چونکا جیسے ان کی موجودگی سے واقعی آگاہ نہ ہو۔

''ما......ما......آپ......رئیلی مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں بیٹھی ہیں۔'' وہ پلٹ کر ان کے پاس آ بیٹھا۔

''تم آج کل مگن ہی اتنے ہو کہ نہ تمہیں ماں یاد رہتی ہے نہ اس کی کوئی بات۔'' صالحہ کا شکوہ زبان پر آ گیا ''اوہ ماما ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟'' آپ کی میری لائف میں کتنی Importance ہے یہ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے۔'' وہ لاڈ سے اس کے کندھے سے لگ گیا ''اچھا!......تبھی میری ہر بات مانتے ہو۔'' انہوں نے اسے مزید شرمندہ کرنا چاہا۔

''امی آپ جو چاہتی ہیں وہ اب پوسیبل نہیں ہے۔'' وہ ان کے کندھے سے سر اٹھا کر سیدھا ہو گیا۔

''فائق......میں تمہیں مجبور نہیں کر رہی بیٹا......صرف ماں ہونے کا فرض ادا کر رہی ہوں۔زندگی سے جڑے رشتوں کو اتنا تناؤ نہیں دیتے کہ وہ جھٹکے سے ٹوٹ جائیں۔''

صالحہ نے مصالحت کی ایک اور کوشش کی

''امی رشتے بچانے کی ڈیوٹی ایک فرد تو نہیں کرتا۔''

''جانتی ہوں بیٹا لیکن دوسرا اگر نادان ہو تو خود بھی تو نادانیاں شروع نہیں کرتے۔'' اس کی چڑچڑاہٹ پر مزید نرمی سے کہا۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔

''ابھی صرف میں یہ چاہتی ہوں کہ زبدہ بھابھی کی عیادت کے لیے تم چلے جاؤ وہ ہاسپٹلائز ہیں۔ ان کی کنڈیشن کچھ اچھی نہیں بتائی زیب نے۔ انہیں ہارٹ پرابلم ہے۔''

''میرا جانا اتنا ضروری نہیں ہے۔ آپ چلی جائیں۔'' اس نے پہلو سے اٹھتے ہوئے کہا

''تمہارا ہی تو جانا ضروری ہے فائق ...... دنیا داری کے لیے نہ سہی انسانیت کے ناطے تمہیں جانا چاہیے۔ بے شک ان کی بیٹی نے ہماری قدر نہیں کی لیکن انہوں نے تمہیں ہمیشہ عزت دی ہے اور ہمیں بھی۔'' صالحہ دلی طور پر دونوں بہو بیٹے کی خیر خواہی رکھتی تھیں۔

''میں دیکھ لوں گا، ٹائم ملے گا تو چلا جاؤں گا۔'' صالحہ کے لیے یہی بہت تھا کہ فائق اس نہج تک تو آیا۔

''ڈنر پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔ میں اپنے فرینڈز کے ساتھ ڈنر پر جا رہا ہوں۔'' یہ تو اس کی تیاری سے ہی اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کہہ کر باہر نکل گیا۔ صالحہ اسے جاتا دیکھتی ہوئیں کسی سوچ میں تھیں فائق کے رویے کی تبدیلی سے احساس ہو رہا تھا کہ ہواؤں کا رخ بدلنے والا ہے۔

☆......☆......☆

نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ اروی پلٹ کر کمرے میں نہیں آئی تھی۔ اصم کو شدید پیاس بھی لگی تھی اے سی چل رہا تھا اس کے باوجود عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ٹانگ کی تکلیف بھی بڑھ رہی تھی۔ دوا نے وقتی طور پر اثر کیا تھا۔ اصم کو اس کی غیر موجودگی سے چڑ بھی ہو رہی تھی۔ ''پتہ نہیں کہاں ہے اسے ذرا بھی احساس نہیں ہے میرا؟ ایسا میں نے کیا کہہ دیا تھا جو دوبارہ یہاں آنا گوارا نہیں کیا نہ ہی پلٹ کر پوچھا کہ مجھے کچھ چاہیے یا نہیں۔'' اصم نے غصے میں دیوار گیر ایل ای ڈی کی آواز مزید تیز کر دی انٹر کام ریسور بھی اس کی پہنچ سے دور تھا کچھ دیر تک ٹی وی پروگرام سے دل بہلانے کی کوشش کی مگر اندرونی بے چینی نے اس کی سوچوں کو جکڑ رکھا تھا۔ ''تم نے بھی تو حد کر دی تھی اصم ...... اس کے رونے کی وجہ تو جان لیتے ...... وہ بتانا چاہتی تھی تم نے سنا نہیں'' اس کے دل نے یاد دہانی کروائی۔ ......''میں تو پوچھ رہا تھا''۔

''اس طرح ......؟ اس کی امی کا حوالہ دے کر؟ شاید گھر کے کسی فرد نے اسے ہرٹ کیا ہو، تبھی وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھی۔'' ذہن و دل یکجا ہو کر اسے قائل کر رہے تھے کچھ بھی تھا دل کے گوشوں میں اروی کے لیے نرمی بھی تھی اور محبت بھی۔ وہ اس کی غمگسار بھی تھی اور ہمدرد بھی۔ اس کی مردانہ انا کسمسا کر بیٹھ گئی تو اروی کے لیے نرم جذبات بیدار ہو گئے۔ وہ اپنے دن رات کا آرام بھلائے اس کی خدمت میں مصروف رہتی تھی۔ اس کی کسمساہٹ پر بھی اس طرح اٹھتی تھی جس طرح کسی نے جھنجوڑ کر جگایا ہو۔ ادھر اصم کی انا سرنگوں ہوئی تھی اور ادھر اروی بھی پشیمان تھی۔ اصم کی حالت سے آگاہ ہو کر بھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اب اپنے ہر کام

کے لیے اس کا محتاج ہے۔ کا غصہ اس کی چڑچڑاہٹ تو کب سے ایسی ہی تھی۔ اسے ہی برداشت وحوصلہ سے کام لینا چاہیے یہ احساس گراں بار ہر اس کیفیت پر بھاری تھا جو سارا دن اس پر طاری رہتی تھی وہ کچھ دیر پہلے پنچے ہوئی ہنگامہ آرائی بھی فراموش کر کے ٹیرس سے اٹھ کر شرمندگی وندامت کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اصم بے بسی سے لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

''اب آ بھی جاؤ...... یا میری جان نکل جائے گی پھر آ ؤ گی۔'' اصم نے اس کی آمد محسوس کی اور بنا اسے دیکھے اپنی موجودہ چڑچڑاہٹ سے کہا تو اروی یکدم تڑپ اٹھی۔

''اصم!...... آج کل آپ کتنی فضول باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔'' وہ تیزی سے سامنے آ گئی۔

اصم نے بھی چہرا اس کی جانب موڑ لیا۔

''اور تم بھی اتنی ہی فضول حرکتیں...... جانتی ہو نا، میں تمہارا محتاج ہوں اسی لیے......'' وہ پھر سے بد کا۔

''اللہ نہ کرے...... آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں......'' اروی نے درمیان سے اس کی بات کاٹ دی ''تو کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ پانی تک تو میں خود سے پی نہیں سکتا۔ میری بے بسی کا اندازہ ہے تمہیں پھر بھی......'' وہ مزید تلخ ہو کر اروی کو شرمندگی کے بوجھ تلے دبا گیا۔ اروی کی آنکھیں پھر سے جھلملانے لگیں۔ روم فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''آپ نے خود ہی تو کمرے سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔'' پانی گلاس میں انڈیل کر وہ اس کے پاس آ گئی۔ ''تم واپس بھی تو آ سکتی تھیں۔'' پانی لبوں سے لگانے سے پہلے اس نے شکوہ کیا۔ ''آپ نے بھی تو میرے رونے کی وجہ نہیں جانی......'' جواب شکوہ ہوا ''وجہ ہی تو پوچھ رہا تھا......'' پانی کی تسکین نے اس کے لہجے کو ٹھہراؤ دیا۔

''نشتر چبھو کر نمک پاشی نہیں کی جاتی...... میرے گھر والوں کی آمد و رفت پر تو پہلے ہی افراد خانہ کو اعتراض ہے۔ اگر آپ کی نظر میں بھی ان کا کوئی مقام نہ رہا تو بخدا میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔'' اروی نے سارے دن کی اذیت لہجے میں سمو کر بہت آہستگی سے کہا۔ اس کے چہرے سے اس کے کرب کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اصم کو بھی احساس ہوا کہ ضرور ایسا ہوا تھا جس نے اروی کی برداشت کو آزمایا تھا۔

''کس نے...... اعتراض کیا؟'' اصم نے بھی ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

ذہن کے پردے پر انعم کا نام آیا تھا لیکن وہ اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں'' اروی کی خاموشی پر اس نے اسے اکسایا

''چھوڑ دیں اصم...... مجھے کسی سے کوئی شکوہ ہے نہ شکایت، جو بھی کرتا ہے اپنے ظرف کے مطابق بات کرتا ہے۔ آپ ٹینشن مت لیں۔'' اروی اپنے لیے پانی لے کر بیٹھ گئی۔

''نہیں اروی کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں ہرٹ کرے یا تمہاری فیملی کے آنے جانے کو اشو بنائے۔ تمہیں اگر کسی نے ہرٹ کیا ہے تو میں تم سے سوری کرتا ہوں۔''

''پلیز اصم۔ مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔ میں بھی اس وقت کچھ ایموشنل ہو گئی تھی۔ سوری تو مجھے کرنی چاہیے۔''

''Any Way ہم دونوں ہی اپنے اپنے عمل پر شرمندہ ہیں اور آئندہ ہم ایک دوسرے کی بات پہلے

سنیں گے پھر ناراضگی ہوگی اوکے۔'' اصم کا موڈ یکدم بدل گیا تھا۔ آج کل اس کا مزاج ایسے ہی پل پل بدلتا تھا ۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اروئی کے ذہن سے بھی بوجھ سرک گیا۔ کچھ بھی تھا اس کا شریک زندگی تو اس کا احساس کرنے والا تھا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا؟

☆......☆......☆

انعم نے اپنے کمرے میں آ کر وہ رونا دھونا مچایا تھا کہ الامان والحفیظ۔ ثمن کو ہاسپٹل بی بی جان کے پاس جانا تھا۔ وہ اس ہنگامہ آرائی میں اپنا فرض نہیں بھلا سکتی تھی۔ ضیغم آفس سے آیا تو انعم کی چیخ پکار پر ثمن کے روکنے کے باوجود اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بچوں کی طرح بیڈ سے کشن تکیے وغیرہ اچھال اچھال کر پھینک رہی تھی۔

''انعم ...... یہ کیا کر رہی ہو؟ بچی تو نہیں ہو۔'' ضیغم نے داخل ہوتے ہی سرزنش کی آنکھوں میں اس کے رویے پر حیرت تھی ''ہاں۔ میں بچی نہیں ہوں مگر میری اس گھر میں عزت بچوں سے بھی کمتر ہے'' وہ مزید چیخ کر بولی

''ایسا کیا ہو گیا؟ پلیز آرام سے بات کرو۔ گھر میں بچے بھی ہیں، ملازم بھی ہیں۔ کیوں تماشہ بنا رہی ہو۔'' ضیغم کو اس کا رویہ بہت برا لگا۔

''میں سب سمجھ رہی ہوں ضیغم بھائی آپ کو ثمن بھابی نے چڑھا کر بھیجا ہے۔ تماشہ تو انہوں نے میرا بابا جان کے سامنے لگوایا تھا ان کی حسرتیں پوری ہو رہی ہیں۔''

''شٹ اپ انعم! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔'' ضیغم کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ انعم کی بدتمیزی اس سے بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ثمن نازک صورت حال دیکھ کر فوراً اندر آ گئی اور ضیغم کو کھینچ کر زبردستی کمرے سے باہر لے گئی۔ سبرینہ اس سارے تماشے میں خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔

''دیکھا...... دیکھا آپ نے رینا بھابی ...... سب بدل گئے ہیں میرے ساتھ اپنی بیوی کی حمایت میں کیسے تن کر آ گئے میرا کسی کو احساس ہی نہیں۔'' وہ پہلے بھڑک کر بولی پھر زار زار رونے لگی۔

''ایسا تو نہیں ہے انعم ...... سب تو نہیں بدلے ...... اپنے غصے میں تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔'' سبرینہ کی تسلی ذو معنی تھی۔

''نہیں ایسا ہی ہے ...... بابا جان ...... بی بی جان ...... سب ہی ......!!'' اس نے سسکی لے کر کہا۔ سبرینہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''شاید تمہیں ایسا لگتا ہے مگر میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔ انعم تم گھر سے بے گھر ہو ...... فائق کی تم پر توجہ نہیں ہے۔ ہر عورت چاہتی ہے جب وہ ماں بننے کے مرحلے سے گزرے تو سسرال والے اور شوہر ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھیں مگر فائق کو پتہ نہیں کیا بیزاری ہے تم سے ...... وہ تو پلٹ کر پوچھتا ہی نہیں تمہیں'' سبرینہ وہی کہہ رہی تھی جو خود انعم کے دل میں تھا۔ اس وقت سبرینہ اس کا درد سمجھ رہی تھی وہی اس کی ہمدرد دوست تھی۔

''پھر بھی ...... پھر بھی سب چاہتے ہیں میں اس شخص کے پیروں میں گر جاؤں ...... کیوں؟ میں کیوں جھکوں اس کے آگے ...... اسے میری ضرورت نہیں ہے تو میں بھی اس کے لیے مر نہیں رہی۔'' انعم کے آنسو بھی رک گئے تھے اور نئے سرے سے فائق کے خلاف ڈٹ جانے کی ہمت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ ''ٹھیک

ہاں ٹھیک ہے..... تم وہی کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے..... لیکن میرا مشورہ ہے تم یہ وقت خاموشی سے گزار لو..... بی بی جان یا بابا جان کو پریشان مت کرو۔ پہلے کی طرح آرام سے اپنی بات منواؤ۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا......!'' سبرینہ بہت نرمی اور آہستگی سے بات کر رہی تھی۔ انعم کو بھی جیسے سمجھ آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اسپتال جاتے ہوئے بھی ضیغم کی آنکھوں کے سامنے انعم کا رویہ آ رہا تھا۔ ثمن پہلے بھی بڑی مشکل سے اسے سمجھا پائی تھی کہ وہ تحمل و برداشت سے کام لے۔

''آخر انعم کو ہوا کیا؟ آج سے پہلے وہ اس طرح بدتمیزی سے کبھی پیش نہیں آئی۔ ضیغم نے گاڑی چلاتے ہوئے پشیمانی ظاہر کی۔

''ضیغم بھلا دیں اس بات کو۔ کم عقل ہے۔ نادان ہے' بے سوچے سمجھے بولتی ہے۔'' ثمن نے اس کی سوچوں کا رخ بدلنا چاہا۔

''کم عقل اور نادان تو نہیں ہے۔ اور تم سے اس کا کیا اختلاف ہے جو وہ اس قدر ہنگامہ کھڑا کیے ہوئے ہے۔'' ضیغم کا انداز تفتیشی تھا۔

''میں نے تو اسے کبھی کچھ نہیں کہا ضیغم۔ بی بی جان نہیں ہیں گھر پر، یہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی'' ثمن نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تم کیوں اسے سمجھا رہی تھیں۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ وہ بچی تو نہیں ہے۔'' ضیغم نے الٹا بیوی سے تلخ ہو کر کہا۔

''بی بی جان گھر پر ہوتیں تو مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اروی سے الجھ رہی تھی۔ اس کے گھر والوں کے یہاں آنے پر اعتراض کر رہی تھی۔ بلکہ وہ تو پہلے دن سے ہی کر رہی ہے۔'' ثمن کو شوہر کا تلخ ہونا برا لگا تھا۔ وہ اس کے خلوص پر شک کر رہا تھا۔

''اچھا!!...... یہ تو غلط بات ہے۔ اروی کے گھر والے اپنی بیٹی سے تو ملنے آئیں گے۔ انعم کو کیوں اعتراض ہے۔'' ضیغم کو بھی بات جلد سمجھ آ گئی۔

''یہ تو وہی جانتی ہے البتہ مجھے انعم کا اروی کے ساتھ رویہ اچھا نہیں لگتا۔ وہ اب اصم کی بیوی ہے۔ ہمارے گھر سے وابستہ ہے۔ اسے عزت دینا ہم سب کا فرض ہے۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔ میں بی بی جان سے بات کروں گا۔ وہی انعم کو سمجھا سکتی ہیں۔''

''فی الحال انہیں بھی پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ انعم کا رویہ جانتی ہیں۔ آپ جلدی چلیں۔ نیلم وہاں تنہا پریشان ہو رہی ہے۔ بی بی جان کو بھی ہوش آ گیا ہے۔''

ثمن نے اس کے ارادوں سے روکتے ہوئے نیلم کا احساس دلایا۔

''بی بی جان...... جانتی ہیں......؟ پھر بھی انعم کا رویہ...... ایسا ہے۔ وہ آخر چاہتی کیا ہے؟'' ضیغم کی الجھن دور نہیں ہو رہی تھی۔ ''یہ آپ خود پوچھ لیجیے گا فی الحال انعم سے زیادہ اہم اور بھی مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہے'' ثمن نے اس بار اس کی توجہ قدرے چڑ کر انعم سے ہٹوائی وہ جانتی تھی انعم کے بارے میں جتنی بات

ہوگی اتنی ہی الجھن اور تلخی بڑھے گی ...... کیونکہ تینوں بھائیوں میں سے انعم کے لیے ذراسی تنقید کوئی ایک بھی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

زبدہ خان ہوش میں تو آ چکی تھیں لیکن انہیں اپنی سوچوں اور احساسات پر جمود سا محسوس ہو رہا تھا۔ اجنبی ماحول نرس کا اجنبی چہرہ نظروں کے سامنے تھا لیکن ..... کوئی اپنا پاس نہیں تھا۔ نرس نے بتایا کہ ان کی بیٹی پاس ہے مگر پاس تو کوئی بھی نہیں تھا...... نیلم چائے لینے گئی ہوئی تھی۔ عامر اسد کی سنگت میں اسے نہ تو وقت کا خیال رہا تھا نہ حالات کا۔ اس کی دلآویز باتیں۔ خواب سہانے سجانے پر مجبور کر رہی تھیں وہ تو عامر کی ہی بار بار آنے والی فون کالز وقت گزرنے کا پتہ نہ دیتیں تو وہ وہیں بیٹھی رہ جاتی۔

''اف ...... کتنی دیر ہوگئی ...... مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا ...... گھر سے کوئی آ گیا ہوا تو ؟......'' لفٹ کی جانب بڑھتے ہوئے اسے گھر اور دنیا کا خیال آیا'' گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تم کہہ دینا کہ چائے پینے گئی تھیں تمہارا کسی کو خیال ہوتا تو فون نہ کر لیتا۔'' عامر اسد نے لاپروائی سے مشورہ دینے کے ساتھ اس کی سوچوں کا رخ بدلنا چاہا۔

''ہاں شاید کوئی آتا تو مجھے کال کر لیتا۔'' لفٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے نیلم نے اظہار خیال کیا۔ محبت نے اسے یکدم نڈر سا کر دیا تھا۔ اپنی ہمت اور بہادری پر وہ خود بھی حیران تھی۔ مختصر وقت کی رفاقت کی لذت وہ لطافت اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

زندگی اس قدر دلنشیں ہے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔ بی بی جان کی محبت۔ ان کی فکر ان کی تربیت سبھی کچھ فراموش ہو چکا تھا۔

''پھر کب ملو گی؟'' عامر اسد وعدہ وعید پر مصر تھا۔

''جب موقع ملا تو ...... پلیز کالج نہ آیا ...... میرے گھر والوں کو خبر ہو جائے گی'' نیلم نے نگاہ لفٹ آپریٹر سسٹم پر مرکوز کی۔ فرسٹ فلور آیا ہی چاہتا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ لفٹ نامحسوس جھٹکے کے ساتھ چند لمحے کے لیے رکی۔ وہ باہر نکلی تو چند قدم کے فاصلے سے دوسری لفٹ سے ضیغم اور ثمن برآمد ہو رہے تھے۔ سارا سرور...... لذت و لطف پل بھر میں اڑن چھو ہو گئے۔ عامر اسد اس کی پشت پر کھڑا تھا اور ثمن آنکھوں میں حیرت لیے نیلم سے مخاطب تھی۔

''نیلم! ...... تم ......؟ تم کہاں گئی تھیں۔ او...... ر''

وقت تھم گیا تھا۔ یا اس کی سانسیں ...... اس کے چہرے کا رنگ لمحے بھر میں بدلا تھا۔ اس میں بولنے کی سکت تھی نہ ہی پلٹ کر دیکھنے کی۔ اسے اپنے اردگرد سبھی کچھ گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

افسانہ

حاجرہ ریحان

ایک قدم

اس نے بتا دیا تھا کہ وہ پہلے میرا تماشہ بنائے گا پھر حاضرین کے ساتھ میرا تماشہ دیکھے گا... اچھا ہی ہوا کہ تم نے مجھے چار سال پہلے ٹھکرا دیا تھا۔

بس ایک قدم کی تو بات ہے... اور ایک قدم اُٹھانے کے لئے کتنی ہمت چاہیے ہوتی ہے؟
بس تھوڑی سی طاقت... جسم کو تو محسوس بھی نہیں ہوتی یہ مشقت... ہاں کبھی کبھی دل پر بہت بھاری پڑ جاتا ہے فقط ایک قدم... تو میں قدم بڑھا لیتی ہوں... یوں بھی آگے بڑھ تو چکی ہوں...
'ہمت کرو بھئی بس ایک قدم کی تو بات ہے... آگے بڑھ کر... سامنا کرو۔' میں نے دل کو تنبیہ کی... ہاں دل کو کیونکہ... میرے پیروں میں تو اس وقت اس قدر طاقت ہے کہ اگر میں یہاں سے بھاگنے پر آؤں تو شاید چاند پر جا کر ہی دم لوں... مگر پھر یہ تو بزدلی ہوئی ناں... کیسی عجیب بات ہے... میدان چھوڑ کر تیز بھاگتے لوگوں نے بزدلی کے جواب تک نت نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں اُن سب پر بھاری ہے میرا یہ ایک بہادری کا قدم... کیونکہ یہ قدم مقابلے سے دور نہیں بلکہ عین بیچ میدان میں پہنچانے کے لئے اُٹھایا جانے والا ہے... ہائے ہائے یہ ایک قدم...
''اے خداوند... جب تو مجھے ایسی صورتحال میں ڈالتا ہے تو دل و دماغ میں ہمت بھی ڈال دیا کر میرے مالک... اس ایک قدم کے خوف سے میرا وجود تو ایسے کپکپا رہا ہے جیسے... سوکھے پتے ہوا سے ڈر جائیں... اب ہم کدھر جائیں...''
''ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''
آپا نے کمرے سے باہر نکلتے ہی مجھے دروازے کے قریب کشمکش میں کھڑے دیکھ کر پوچھا... اور جواب سنے بغیر تیزی سے کچن کی طرف چلی گئیں... حسبِ معمول اُن کی آواز حد سے زیادہ اونچی تھی اور یقیناً ڈرائنگ روم میں موجود لوگوں تک ضرور پہنچی ہو گی...
اب ڈرائنگ روم میں بیٹھے کھڑے بھرے تمام لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون ہے بھلا جو دروازے کے قریب تو ہے مگر اندر نہیں آتا... یہ کون ہے جو منزل سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر رُکا ہوا ہے... اور سوچوں میں مشغول ہے... ایک قدم بڑھا کر اپنی منزل کو نہیں چھونا چاہتا... یا ڈر کے مارے نہیں چھو پا رہا... اور ہو بھی سکتا ہے کہ آواز سنائی دیئے جانے پر بھی سب اپنی اپنی بولیوں میں مصروف ہوں... ظاہر ہے کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ ایک قدم کہ لئے ترستے ہوئے پر غور و فکر فرمائیں... اور وہ بھی ایسے موقع پر... جبکہ اُن کے درمیان 'وہ' ہو... جس کے اعزاز میں کمرے کی تین چار دن تک صفائی ہوئی تھی... فرنیچر پر پالش کروایا گیا تھا... پردے بدل کر دھلے ہوئے لٹکائے گئے تھے... اور کارپٹ کو بہت اچھے طریقے سے صاف کروایا گیا تھا... تو ''وہ'' کچھ ایسا ہی معزز ہے... مہمان... تو شاید نہیں... بقول اُس کے یہ تو اُس کا اپنا ہی گھر ہے... کئی زمانے گزرے وہ دھڑلے سے 'اپنے' اس گھر میں آتا تھا... در و دیوار سے ٹیک لگا کر کبھی کسی سے تو کبھی کسی سے گپ لگاتا تھا... بڑی اپنائیت سے... اور پھر اُس نے یہ بھی جانا کہ یہ 'اپنے' کبھی کبھی اپنے ہی گھر میں ناپسندیدہ ہو جاتے ہیں... اپنے ہی گھر میں بُرے طریقے سے بے عزت ہو جاتے ہیں... اپنے ہی گھر میں اپنی ہی در و دیوار سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں اور پھر اپنائیت نہیں رہتی... اجنبی ہو جاتے ہیں... سو اُسے اجنبی کہہ کر چلتا کر دیا گیا...
بابا جانی نے اُسے پہلی بار سمجھایا...
''تم بڑے ہو گئے ہو اور یہ ہے لڑکیوں کا گھر... بیٹا اب یہاں بہن صاحبہ کے ساتھ ہی آیا کرو...''
اور وہ ایسا گیا کہ چلا ہی گیا... آسٹریلیا... سڈنی... اُس کی والدہ جن کو ہم سب بہنیں پھوپھی جان کہتے تھے آتی رہیں... اُس کی خبریں بھی ملتی رہیں مگر وہ دوبارہ نہ ملا... اُس کے دن پلٹ گئے...

وہ بھی پلٹ آیا اور وہ اپنے اس گھر میں بے عزت ہونے کے بعد بہت معزز ہو گیا... جیسے کوئی ہر دل عزیز... پیارا... دلارا... آنکھ کا تارا... اور میں؟

میں مکمل طور پر اُس کے رحم و کرم پر آ گئی... وہ دل کا اچھا ہے... مار کر چھاؤں میں ڈالے گا بس... اس سے زیادہ اچھائی کی مجھے کوئی اُمید نہیں... میں چاہتی بھی نہیں... اُس کا بھی تو حق ہے... وہ بدلہ لے... لیتا ہی رہا ہے گزر چکے صرف ایک ہفتے کے دوران ہی اُس نے مجھے اچھا خاصا نڈھال تو کر ہی دیا ہے... بس اب یہ آخری وار ہے جس کے بعد میں بھی خاموش ہو جاؤں گی اور یہ دل بھی... اور بس ایک قدم... میں کمرے میں جا پہنچوں... وہ اپنا کام مکمل کرے... کھیل ختم ہو... پردہ گرے اور ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں لوٹ جائیں... اس بات سے بے خبر کے اس کے بعد میرے پاس لوٹنے کے لئے زندگی رہتی بھی ہے یا نہیں... زندہ تو خیر میں اُس وقت بھی نہیں رہی تھی جب اُس کی وفاداری... محبت... خلوص کو جان بوجھ کر ٹھکرایا تھا... میں سوچتی ہوں کہ اپنے غلط فیصلوں کو کس کے سپرد کروں...؟ ہے کوئی جو لے لے مجھ سے میرا جذبات میں اُٹھایا ہوا ایک قدم... غصے میں کیا گیا فیصلہ... اور محبت کو ٹھکرانے کا گناہ... نہیں نہیں... ہم سب یہ بوجھ خود اُٹھائیں گے... یہ بوجھ جو وقت کے ساتھ ساتھ بھاری ہوتا جائے گا... کیونکہ وقت آہستہ آہستہ اس بوجھ میں ادراک کے پتھر بھرتا جاتا ہے... ہم نظرِ ثانی کرنا شروع کرتے ہیں... احساس ہوتا ہے اپنے اکھڑ... بے جا... خود غرضی کی حد تک کئے گئے غلط فیصلوں کا... پھر ہم جھکنے لگتے ہیں... اس قدر بوجھ دل پر پڑتا ہے کہ کمزور ہو جاتا ہے... بات بے بات دھڑکتا ہے... دھڑکن بھولنے لگتا ہے... میں بھی بھول جانا چاہتی ہوں... بس اب اس ایک قدم کے بعد سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں... میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں... میں خود کو آج ہی نہیں کئی سالوں سے اس غلطی کی سزا دیتی آ رہی ہوں... مگر پھر بھی کہیں کوئی سرگوشی کرتا تھا کہ یوں نہیں... اتنی آسانی سے نہیں... تمھاری سزا... تمھارے اپنے ہاتھ میں نہیں... آئے گا وہ ایک دن... تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے... اُس کے بعد ہی سزا مکمل ہو گی... ہاں سزا کے بعد آزادی تو ہو گی... مگر زندگی کی کوئی ضمانت نہیں... چلو یوں بھی ٹھیک ہے... اب وہ آ گیا ہے تو اُس کو اُس کا حق دیا جائے... راستہ ہموار کیا جائے... وہ وار کرے... اپنا بدلہ لے... میں اُسے اختیار دیتی ہوں... مگر بس گزارش اتنی ہے کہ اپنا طریقۂ کار بدل لے... یہ جو اُس نے رات مجھے فون کر کے بتایا کہ جس دن کے وہ انتظار میں اتنے سالوں سے جلتا رہا ہے آخر کار اُس کی گرفت میں آ چکا ہے... میں نے اُس کے ساتھ جو کیا وہ بھول نہیں سکا... ابھی تک ایک ایک لمحہ اُس کے دل و دماغ پر نقش ہے... اور اب وقت آ گیا ہے کہ وہ میرا احاطہ کرے گا... مجھے قابو کرے گا... اُس نے بڑے بے رحم انداز میں مجھے اپنا طریقہ کار بتایا... وہ پہلے میرا تماشہ بنائے گا پھر تمام حاضرین کے ساتھ میرا تماشہ دیکھے گا... شروع سے آخر تک... پھر کہیں جا کر اُس کے دل میں ٹھنڈک پڑے گی... میں مایوسی سے سر ہلاتی رہ گئی... جواب میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میں بھی راہِ نجات نہیں چاہتی... بس کوئی ذرا سی دیر کو اس مشکل گھڑی میں ساتھ دے دے... میں آسانی نہیں چاہتی بس کھلی سانس چاہتی ہوں... کس قدر عجیب بات ہے کہ جب غلط سلط فیصلے کر رہے ہوں تو کئی لوگ آپ کے اردگرد بکھرے پڑے ہوتے ہیں جیسے کسی ریس میں بھاگنے والے گھوڑے پر سٹہ لگائے بیٹھے ہوں... اور جیسے ہی فیصلہ مکتا ہے سب چاہنے والے بھی غائب ہو جاتے ہیں... غلطیوں کا بوجھ اکیلے ہی اُٹھانا پڑتا ہے... میں اُسے کچھ نہ کہہ

سکی اور وہ اپنی سُناتا گیا... پورے ایک ہفتے سے آیا ہوا تھا اور پورا ہفتہ گزار لینے کے بعد پہلی بار اُس نے پچھلی رات مجھ سے بات کی تھی... حیرت تو اس بات پر تھی کہ آپا کس قدر خوش اخلاقی سے اُس کا فون آنے پر مجھے ریسیور پکڑا کر خود کمرے سے باہر چلی گئی تھیں... میں پریشان ہوگئی... پہلے تو یوں آپا نے اُس کو اتنی عزت نہیں دی تھی... بلکہ وہ تو جب گھر آتا آپا اُس سے اپنے باہر کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کچھ ایسی نخوت سے کراتیں کہ جیسے وہ ہمارا زر خرید غلام ہو... میں نے اُسے کئی بار ٹوکا... احساس دلانے کی کوشش کی...

''کیوں؟ شرم نہیں آتی تمھیں؟ کتنی بے عزتی کرتیں ہیں آپا تمھاری... مگر مجال ہے کہ تم کچھ جواب دے دو... آتے ہی کیوں ہو یہاں؟ بس آپا کی چاکری کرنے کیوں؟''

کئی بار آپا کی طیش میں آ کر بک بک جھک جھک پر میں اُس کی طرف داری پر مجبور ہو جاتی... مگر وہ مجھے اُس کے لئے آپا سے لڑتے دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہ ہوتا... بے حس کہیں کا... اور اب جو چار سال بعد آسٹریلیا سے لوٹا ہے تو آپا تو جیسے اُس کے سامنے بچھی بچھی جا رہی تھیں... اور وہ ایک دن بھی گھر نہیں آیا... بس یونہی آپا سے کبھی کہیں جاتے ہوئے گلی میں یا پھر پھوپھی جان کے گھر پر ملاقات کرتا رہا... ہاں بابا جانی سے ایک دن ملنے آیا تھا... مگر ڈرائنگ روم سے ہی لوٹ گیا تھا... اس پورے ہفتے جب بھی آپا اُس سے ملیں... تعریف کے پُل باندھ دیتیں... میں اپنا سا منہ لئے ادھر اُدھر پھرتی رہتی... گو میرے غلط فیصلے میں آپا کا بہت بڑا ہاتھ ہے مگر اب وہ کچھ اس طرح ظاہر کر رہی تھیں کہ جیسے یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے... اوپر سے میری سزا کے لئے بہت خوش و خرم گھر میں انتظام بھی کر رہی تھیں.. ٹھیک ہے میں بھی کوئی بچی تو تھی نہیں... آپا نے ایک مشورہ دیا تھا... نہ مانتی تو آج کو سزا نہیں انعام کی حقدار ٹھہرتی... لوگوں میں میرے شعور اور دور اندیشی کی دھاک بیٹھ جاتی... مگر میں اس قدر عقلمند ہوتی تو پھر کیا بات تھی...

میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا... پورا لاؤنج شام کے وقت گھر میں بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی سائیں سائیں کر رہا تھا... کیونکہ سب کے سب اپنے ''معزز'' کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں براجمان تھے... ناشتے کے برتنوں کی جھلملاتی آوازوں کے ساتھ ہلکے ہلکے کھلکھلاتے جملے لاؤنج تک سنائی دے رہے تھے... میں نے ایک بار پھر اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں... آپا ہاتھ میں کسٹرڈ کی قنچی بھری ہوئی ڈش لئے نمودار ہوئیں...

''ارے کیا ہو گیا تمھیں... ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟''

وہ میرے پاس سے گزرتے پھر اپنی مخصوص اونچی آواز میں پوچھتی آگے بڑھ گئیں۔ اُن کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی چند واہ واہ کے جیسے الفاظ سُنائی دیئے یعنی کچھ لوگوں کو کسٹرڈ کا انتظار تھا... اور انتظار تو اُسے بھی ہے... اُس نے فون پر بتایا تھا کہ اُسے بھی میرا بڑی بے چینی سے ڈرائنگ روم میں انتظار رہے گا... جہاں اُس کے ساتھ میرے خاندان کے بڑے بوڑھے... اچھے بُرے... چھوٹے بڑے... سب جمع ہوں گے... پھر وہ تماشہ... ہوگا... سوچ کی کوئی حد نہیں ہوتی... میں نے جھنجھلا کر سوچا... پچھلے چند سالوں میں نے صرف اپنی سوچ کے ذریعے تو خود کو سنبھالا ہے... سارا دن سوچتے چلے جانا... پوری رات سوچنا... جو وقت بچ جائے اُس میں بھی سوچتے رہنا... میں نے دوبارہ سے سوچا کہ میں یہاں لاؤنج میں بنی سنوری کیوں کھڑی ہوں... ہاں یاد آیا... مجھے ڈرائنگ روم میں طلب کیا گیا ہے... اور میں کتنی ہی دیر سے ڈرائنگ

روم سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہی ہوں... میں نے گہری سانس لے کر ہمت بحال کی اور وہ ایک قدم اُٹھانے ہی لگی تھی کہ وہ... ہمارا... معزز آتا دکھائی دیا... میں گڑبڑا گئی۔ اب کہاں بھاگ لوں... دل نے بڑی تیزی سے طنز مارا... ہونہہ... بھاگ لوں... ایک قدم تو اُٹھایا نہیں گیا؟

وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا... مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر اور قریب آیا تو واضح ہوگیا... دل تو ہوا کہ جھٹ شکایت کر ڈالوں... اتنے دن سے آئے ہوئے ہو... ملنے کا ایک دن بھی خیال نہیں آیا؟

کافی بدل گیا ہے... میں نے اتنی ہی دیر میں کن انکھیوں سے اُس کا جائزہ لے لیا تھا... اب تو صحت مند جسم اور... صاف رنگت پر گلابی ہونٹ لئے کوئی بہت ہی جاذب نظر انسان لگ رہا تھا... کپڑے بھی معیاری تھے... اُس کے چہرے اور لمبے قد کاٹھ پر جچ رہے تھے... اور پاس سے اُٹھتی وہ مسحور کن خوشبو... میں زیرِ لب مسکرا گئی... ایسے خوبرو کے ہاتھوں بے عزتی بُری نہیں لگتی...

''یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟''

اُس نے آپا کے مخصوص انداز میں شرارت سے پوچھا... میں چونک گئی...

'ڈر لگ رہا ہے؟' اُس نے پھر پوچھا

میں نے سر جھکا لیا... اعتراف اپنی غلطی کا ہو یا بزدلی کا... دونوں ہی بڑے جان لیوا ہوتے ہیں.. میں نے بڑی ہمت کر کے اُس سے رحم کی التجا کرنے کی کوشش کی...

''کیا یہ سب ضروری ہے؟ وہ بھی سب کے سامنے؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا... اُس نے آنکھیں نکالیں...

''کیوں؟ تم نے وعدہ کیا تھا بولو کیا تھا کہ نہیں؟ اب اپنا وعدہ نبھاؤ!''

پھر وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا...

''ہاں تم اگر یہیں کہیں بزدل کی طرح گر پڑ جاؤ اور کوئی بیماری کا ڈرامہ رچا کر سامنے نہ آؤ تو اور بات ہے... تم سے کچھ بھی بعید ہے۔'' اُس نے وثوق سے کہا تو میں چڑ گئی...

'اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے... میں تو بس ذرا اپنے بال اور دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی اسی لئے یہاں کھڑی تھی...'' وہ طنزیہ ہنسا...... ''تو ہو گئے آپ کا دوپٹہ... اور بال... ٹھیک؟ یا مزید چار سال چاہتی ہو؟''

...طنز گہرا تھا... میں کچھ نہ بول سکی... دل تو چاہا کہ اُسے کھری کھری سُنا دوں... کیوں یہ کیا کم ہے کہ میں اپنے وعدے کے مطابق یہاں تک آ گئی ہوں... اب تک اس ایک وعدے کو نبھانے کے لئے خود کو کتنے امتحانوں سے گزارتی رہی ہوں... اپنے آپ کو قربان کرتی رہی ہوں... مگر اُسے تو جیسے میری کوئی قربانی نظر ہی نہیں آ رہی... شکل سدھر گئی... حالت بھی بدل گئی مگر ابھی بھی ویسا ہی بے حس کا بے حس ہی ہے... میں نے تاسف سے سوچا...

''ویسے ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ تم نے مجھے چار سال پہلے ٹھکرا دیا تھا... اب تمہاری حالت دیکھ رہا ہوں تو اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنے بڑے نقصان سے بچ گیا تھا...''

اُس نے لاپرواہی سے پچھلے ایک ہفتے والا بے رحم رویہ اپناتے ہوئے کہا... میں خود پر قابو نہ کر سکی اور بے اختیار میری نظر اُٹھ کر اُس کی آنکھوں سے جا ملی... دوسرے ہی لمحے چھلک کر جھک گئی... میری حالت کو دیکھ کر وہ شاید کچھ اور قریب آیا تھا... یا پھر میرا وہم تھا...

''ہم لڑکیاں ایسی ہی نازک ہوتی ہیں...

ایک ہی غم میں ڈھل کر کیا سے کیا ہو جاتی ہیں۔''
میں نے جواب دیا... وہ میری بات ان سُنی کر کے تھوڑا اور آگے بڑھا تھا یا یہ پھر سے میرا وہم تھا...
''فکر مت کرو... زیادہ تکلیف نہیں ہوگی... ویسے بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں برداشت کی کافی صلاحیت آچکی ہے... تمھاری سزا کے لئے یہ وقت بالکل ٹھیک ہے...''
''معاف کر دو ناں پلیز... میں بہت شرمندہ ہوں... تم جانتے بھی ہو کہ آپا نے مجھے کتنا ڈرا دیا تھا پھر... پھر تم بھی تو... اُس وقت محض...''
میں نے آخر کار اُس کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا...
''ہاں بولو بولو... میں سب سُن لوں گا... مگر سزا تو تمھیں ہی ملے گی سمجھیں تم... ناسمجھ... نااہل... نالائق ہو تم... انسان جب محبت کرتا ہے تو پیسہ دولت نہیں دیکھتا... ارے تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا تھا... میں کوئی تمھیں ایسے ہی پتھو فقیر کی طرح بیاہ کر لے جاتا؟ منگنی کی خواہش ظاہر کی تھی کہ کہیں آپا میرے جاتے کے ساتھ ہی تمھیں رفو چکر نہ کرا دیں... اور تم ...سب جان کر بھی... عین وقت پر مکر گئیں؟ غضب خدا کا...''
''مجھے یاد کرانے کی کوئی ضرورت نہیں میں وہ دن، وہ واقعہ جیسے دل پر نقش کر چکی ہوں... اتنی بار دل ہی دل میں دہرا چکی ہوں کہ جیسے کوئی پسندیدہ فلم بار بار دیکھتا ہو... اور ہر بار نئے سرے سے تکلیف اُٹھاتی ہوں... بھولی نہیں ہوں... پھوپھی جان نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا... کہ وہ آسٹریلیا جانے سے پہلے مجھ سے منگنی کرنا چاہتا ہے... بابا جانی نے مجھ سے پوچھنے کے لئے سب کے سامنے ہی بلوا لیا تھا اور پھر کس طرح آپا کے سکھائے جانے پر میں نے بابا جانی اور پھوپھی جان کو انکار کر دیا تھا... اور جیسے ہی انکار کا فقرہ میری زبان سے ادا ہوا تھا مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا... میں اب تک کس کس طرح خود کو سزا دیتی رہی ہوں. ..آپا کے لائے گئے رشتوں کو ٹھکراتی رہی ہوں... یہاں تک کہ خود کو ایک خول میں بند کر کے بہت سی سوچوں میں گھری میں بالکل ایک روبوٹ کی طرح زندگی گزارنے لگی ہوں... اور اب اس عمر میں آ کر جب شاذ و نادر ہی کوئی ہمارے گھر پھٹکتا ہے... جب مجھے اپنی ذات سے کوئی اُمید نہیں رہی تو تابوت کی آخری کیل ٹھونکنے یہ بھی پہنچ گیا... کتنی دور کی مسافت طے کر کے آیا... مگر کتنے صحیح موقعے پر سزا مکمل کرنے... جو اُس نے جانے سے پہلے میرے لئے تجویز کی تھی اور میں نے دل و جان سے قبول کر لی تھی... سزا جو اُس وقت مجھے بہت عامیانہ لگی تھی... مگر اب سوچ سوچ کر دہل رہی تھی... پہلے مجھ سے نکاح کی خواہش کا اظہار کرے گا... قبول کئے جانے پر گھر پر اپنی والدہ کو لے کر آئے گا... جب ہم سب اکٹھے ہو کر نکاح کے لئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں گے تو مولوی صاحب کے نکاح شروع کرنے سے پہلے وہ انکار کر کے تماشے کا پردہ گرا جائے گا... میں لرز گئی... بابا جانی اس عمر میں... آپا کس قدر خوش دلی سے کئی روز سے گھر پر نکاح کی تیاری کرتی رہی ہیں... اور میں... میں اس وقت کتنی سجی بنی دلہن کی صورت سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈرائنگ روم میں جانے کو تیار کھڑی ہوں... شاید اندر اُس کی غیر موجودگی اور میرے باہر ہی کھڑے رہنے کو محسوس کر لیا گیا تھا...
پھوپھی جان اور آپا آتی نظر آئیں...
پھوپھی جان کی نظروں میں پیار چھلکا جاتا تھا...
''ماشا اللہ... ہے ہی پیاری...''
پھوپھی جان نے مجھے محبت سے گلے لگا لیا تو میں بھی سسک پڑی... پھوپھی جان دلاسہ دینے

لگیں...

''ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' آپا نے سختی سے پوچھا۔

''لگتا ہے پوری کہانی میں آپا کو صرف ایک ہی ڈائیلاگ دیا گیا ہے؟''

وہ جھٹ سے بولتا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا... آپا قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں...

''اچھا میرا بچہ فکر نہ کرو چلو تم یہیں بیٹھ جاؤ... ہم مولوی صاحب کو یہیں لے آتے ہیں۔''

پھوپھی جان نے مجھے لاؤنج میں رکھے ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے سکھ کا سانس لیا... یہ بھی بہت غنیمت ہے... وہ نکاح سے جیسے چاہے انکار کرے بس میں موجود نہ ہوں... پھوپھی جان اور آپا ڈرائنگ روم میں لوٹ گئے... اور تھوڑی ہی دیر میں مولوی صاحب سمیت بابا جانی... ماموں جان اور سہیل بھائی کے ہمراہ آ گئے...

''اف میرے خدا... یہ کیا مجھ سے نکاح نامے پر دستخط کرا کر انکار کرے گا؟ یہ چاہتا کیا ہے؟

''میں لرزتی جاتی تھی مولوی صاحب معمول کے مطابق نکاح پڑھانے میں مشغول تھے... میرے دستخط لئے گئے اور پورا مجمع پھر سے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا... اور پھر... مبارک ہو مبارک ہو... جیسے نعرے سُنائی دینے لگے...

'شاید غم سے میرا دماغ چل گیا ہے... اپنے ہی مطلب کی بات سنائی دے رہی ہے... کہ اتنے میں پھوپھی جان خوشی سے پلیٹ میں کچھ مٹھائی سجائے میرے پاس چلی آئیں...

''لو منہ میٹھا کر لو... مبارک ہو!''

انہوں نے محبت سے ایک چنکی لڈو میری طرف بڑھایا... اور اُسی وقت اُن کے دوسرے ہاتھ میں دبا موبائل فون بجنے لگا... انہوں نے مسکرا کر فون میری طرف بڑھا دیا...

''ہیلو... ہیلو...'' وہ ڈرننگ روم کے شور ہنگامے میں بیٹھا اونچی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

''جی... میں... بات کر رہی ہوں۔''

میں نے پھوپھی جان کی طرف دیکھتے ہوئے مظلومیت سے جواب دیا۔

''ہاں ہاں میں نے ہی امی سے کہا کہ تم سے بات کروا دیں... اچھا سنو...؟''

وہ شاید اب کسی کونے میں کھڑا بات کر رہا تھا کہ اب آواز قدرے صاف سُنائی دے رہی تھی... وہ پھر گویا ہوا...

''وہ اصل میں بات یہ بتانی ہے کہ میں نے تمہاری سزا کو بدل دیا ہے...... پہلے میں ایک ہی جھٹکے میں پھانسی دے کے فارغ ہو جانا چاہتا تھا مگر اب...!''

میرا خون خشک ہو گیا... میں نے گھبرا کر پوچھا...

''اب؟ اب؟''

اُس کا ہلکا سا قہقہہ سُنائی دیا...

''اب میں پھانسی کے بجائے تمہیں عمر قید کی سزا سُناتا ہوں... رخصتی کے لئے تیار رہنا... باقی بدلے تب ہی لوں گا...''

میں دم سادھے بیٹھی رہ گئی... شاید پھوپھی جان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون بند ہو چکا ہے، انہوں نے آہستگی سے میرے ہاتھ سے فون لے لیا... اتنے میں آپا باورچی خانے سے جھنجلائی ہوئی آئیں:

''ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں... کب تک اسی طرح بت بنی بیٹھی رہو گی... چلو میرے ساتھ کھانا لگوانے میں مدد کرو۔''

☆☆☆

ناولٹ

پلکوں پہ سجے جگنو

معاشرے کی بے حسی پر لکھی ایک خوبصورت تحریر...... صنوبر جینا چاہتی تھی، خوش رہنا چاہتی تھی مگر گندی ذہنیت کے لوگ اس کو جینے نہیں دے رہے تھے۔

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اسٹاپ پر کھڑی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں اس کا وجود کسی کو نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر دل خوف سے دھڑک رہا تھا عجیب خیالات اور وسوسے سے آ رہے تھے اسے ...... اندھیرے سے خوف بھی آ رہا تھا...... اور اس وقت وہ اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ بڑی دیر بعد اسے ایک ٹیکسی نظر آئی۔ اس کا ڈرائیور ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ قرآنی آیات کا ورد کرتی ٹیکسی میں سوار ہوگئی۔ اس نے اپنے لیے سارے راستے بند کر لیے تھے سارے رابطے توڑ ڈالے تھے اب وہ کہاں جائے اور پھر اچانک اسے کے تصور میں ثریا [illegible]یہہ آ گئی اور وہ اس کے گھر کی طرف چل پڑی وہ ٹیکسی سے جلدی سے اتری۔ کرایہ دیا اور تیز قدموں سے گلی میں مڑ گئی۔

بیل پر انگلی رکھی تو ثریا اور اس کے شوہر نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، یہ اس وقت اتنی سردی میں کون ہوگا؟ اشعر نے گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک خاتون ہاتھ میں اٹیچی لیے کھڑی تھی۔

السلام علیکم! اس نے اشعر کو سلام کیا۔ ''جی آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے؟'' نقاب لگائی ہوئی خاتون نے اپنا نام بتایا ''صنوبر اور میں ثریا کی دوست ہوں......''

باتوں کی آواز سن کر ثریا بھی شال اوڑھتی ہوئی باہر چلی آئی۔ صنوبر نے نقاب ہٹا دیا اور دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ صنوبر زار وقطار رو رہی تھی۔ ثریا بھی رو پڑی۔ ''کچھ تو بول پگلی کیا ہوا ہے تجھے اکیلی اتنی رات کو سب ٹھیک ہے نا؟ سجاد بھائی کہاں ہیں......؟''

صنوبر بلک بلک کر رونے لگی۔ ''میں اس ظالم شکی مزاج کی قید سے آزاد ہوگئی ہوں۔''

''اچھا، اچھا بس اب ریلکیس ہو جاؤ...... جو

کر رہی ہو۔'' وہ چیخا۔

''اب تم کچھ بھی سمجھو تم اس قسم کی باتیں کروگے تو کیا میں اپنے دفاع میں کچھ نہیں بولوں......ایسا ممکن نہیں......''

''تو پھر مجھے بھی تمہاری ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی کہہ چکی ہو کہ تم مجھے شوہر نہیں سمجھتیں......تو میں بھی تمہیں اپنی بیوی نہیں سمجھتا۔ میں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے میرے گھر سے، میری زندگی سے......''

صنوبر سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس مرد نے اس شخص نے خود ہی اپنے لیے تنہائی چن لی میں بھی کب تک اس کی جھک جھک سنتی آج تو اس نے میری پاکیزگی، وفا داری، خدمت، چاہت سب ہی کا خون کر دیا تھا اب مجھے اس بے وفا ظالم کا خیال کیوں آ رہا ہے۔ کیوں فکر ہو رہی ہے اس کی، اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے اس بھری دنیا میں اس معاشرے میں جہاں قدم قدم پر بھیڑیے ہیں، بے ضمیر لوگ ہیں بہو، بیٹیوں کو ایسی گندی نادیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں وحشت ہوس اور درندگی ہوتی ہے ہزاروں میں ایک آدھ ہی ایسے شریف اور نیک و ہمدرد مخلص اور خوف خدا رکھنے والا ہوگا۔ میرے رب میری مدد فرما ......مجھ پر رحم فرما۔ میرے گناہوں، میری کوتاہیوں کو معاف فرما...... مجھے سکون کی زندگی نصیب فرما۔''

آنکھیں بند ہوتے ہی سجاد پھر سامنے آ گیا۔

کمینی، بدذات، آوارہ، بدچلن عورت......

''خبردار وہ زور سے گرجی...... آگے اگر تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی کیونکہ اب...... اب میرا تمہارا وہ معتبر اور پاکیزہ مقدس رشتہ نہیں ہے......اب تم میرے لیے غیر بن گئے ہو۔ وہ تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی سمجھ میں بزرگوں کی یہ منطق بالکل بھی نہیں آ رہی تھی کہ رخصتی کے وقت والدین اور بزرگ یہ نصیحتیں کیوں کرتے ہیں بیٹی آج سے تمہارے لیے یہ گھر اور اس کے مکینوں سے رشتہ تو وہی ہوگا مگر اب تم یہاں مہمان بن کر آؤ گی اب تمہارا شوہر، اس کے والدین، بہن بھائی اور اس گھر سے تمہارا ناطہ جڑ رہا ہے وہ تمہارے لیے اہم ہے ان سب کو ان سب سے برتر سمجھنا۔ اس دہلیز کو پار کر کے تم اندر جاؤ گی تو اب اس گھر سے چار کاندھوں پر ہی اپنی آخری منزل کے لیے روانہ ہونا...... یہ کیسی نصیحت ہے کیا لڑکی، بیوی...... بہو...... بھابی بن کر کوئی اور مخلوق بن جاتی ہے۔ جس کی جیون کی ڈور شوہر اور سسرال والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسا وہ چاہیں گے کٹھ پتلی کی طرح نچائیں۔ اسے حواس خمسہ سے محروم سمجھا جاتا ہے......صبر شکر، درگزر، جی حضوری سے واسطہ رکھنا پڑتا ہے۔ ایک عورت کے کردار پر اس کی ذات پر حملہ کیا جائے تب بھی وہ خاموش رہے۔ نہیں تو بولنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے، یہ کیسا قانون ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ کتنی آسانی سے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے پیسہ چاہیے صرف پیسہ، تب تم نے مجھ سے کتنی گھٹیا، نیچ اور غیر اخلاقی بات کی تھی؟ کیا کوئی مرد ایسا بھی کر سکتا ہے...... ہاں ہاں سجاد! تم نے کہا تھا کہ ایک دھندہ ایسا بھی ہے کہ اس میں کچھ ہی دیر میں عورت بے حساب دولت کما سکتی ہے جسم فروشی میں دولت ہی دولت ہے اور میں اس روز کتنا روئی تھی۔ کتنے دنوں تک بیمار رہی تھی۔ اور آج پھر تم نے مجھے وہی گندی اور ناقابل برداشت باتیں سنا کر مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ سجاد میں نے تمہارے لیے کیسے کیسے ناقابل تسخیر پہاڑوں سے ٹکر لی اپنی راہ میں کھڑی ہر دیوار کو مسمار کیا۔ اپنوں سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑا۔ کتنی اذیتیں اور تکالیف برداشت کیں کبھی زبان سے اف تک

ہو چکا سو ہو چکا۔ اب رومت۔ اس بے وفا سنگدل کو بھول جاؤ...... اپنی زندگی جیو...... صنوبر اب تمہیں ہمت اور حوصلے سے زندگی جینا ہے تا کہ تمہارے والدین ، رشتے دار اور دوست احباب تمہیں کوئی طعنہ نہ دیں کہ والدین سے ، رشتے داروں سے اور اپنوں سب سے دشمنی مول لی تھی تم نے اس بے وفا کے لیے اور وہی ایسا نکلا جس نے باوفا اطاعت گزار اور اس قدر ٹوٹ کر چاہنے والی بیوی کی قدر نہیں کی اور ایسا صلہ دیا...... اب تم آرام سے میرے ساتھ رہو...... یہ لو پانی پیو......'' ثریا نے گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ صنوبر نے پانی پیا۔ اتنی دیر میں اشعر کھانا گرم کر کے لے آئے۔

صنوبر نے حیرت اور تشکر آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''اشعر بھائی آپ نے کیوں تکلیف کی مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ارے واہ! کیسے بھوک نہیں ہے جس ماحول سے آئی ہو کیا کھانا بنا ہوگا وہاں۔'' ثریا نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا تو صنوبر کچھ نہ کہہ سکی۔ اشعر نے کہا میں نے چائے بھی چولہے پر رکھ دی ہے۔

اب کی بار ثریا نے مسکرا کر شوہر کی طرف تشکر آمیز انداز میں دیکھا ''جیتے رہیں میاں جی ہزاروں برس......'' تب ہی گڑیا نیند سے بیدار ہوگئی شاید اس کا پیمپر گیلا ہو گیا تھا۔

دیر تک ثریا اور صنوبر باتیں کرتے رہے صنوبر بہت ڈسٹرب تھی۔ ثریا نے اسے سونے کے لیے بھیج دیا اور خود اپنے بیڈروم میں چلی آئی وہ بھی صنوبر کے ساتھ ہی سونا چاہتی تھی لیکن صنوبر نے اسے زبردستی اس کے بیڈروم میں بھیج دیا یہ سوچ کر کہ نجانے ابھی نیا ٹھکانہ ملنے تک مجھے یہاں رہنا ہے کیوں ان کی نجی زندگی میں خلل ڈالوں؟ کیوں میاں بیوی کو ڈسٹرب کروں اگر ثریا میری محبت اور تنہائی کے خیال سے میرے ساتھ سوئے گی تو اس کا شوہر ڈسٹرب ہوگا ......سوچتے سوچتے اسے ایک دم شدت سے سجاد یاد آ گیا۔

''لعنت ہے تمہاری سوچ اور ذہنیت پر حد ہوتی ہے بیہودگی کی...... شرم نہیں آتی تم کو ایسی باتیں کرتے ارے تم ''مرد'' ہو مرد؟ شوہر ہو...... جب مرد شوہر کے نام سے منسوب ہوتا ہے تو ذہن میں سوچوں میں ایک ہی خیال آتا ہے۔ ایک تحفظ، ایک سائبان ، ایک اٹوٹ بندھن ...... ایک حصار ......ایک طمانیت، ایک اپنے پن کا احساس، غیرت وعزت اور وقار...... مگر تم تو...... تو کیا نکلے......؟

''بکواس بند کرو تم کو شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''نہیں میں شوہر سے نہیں اس مرد سے بات کر رہی ہوں جس نے ایک بیوی کی انا ، عظمت ، چاہت ، عصمت ، کردار ، غیرت اور وفا کا خون کیا ہے، جو ایک شوہر نہیں کر سکتا...... تمہاری زبان سے اپنے لیے ایسی گھٹیا اور غیر اخلاقی باتیں سن کر میں تم کو اپنا شوہر نہیں سمجھتی......'' اس نے غصے سے کہا تو سجاد اور زور سے چیخا ''ہاں ، ہاں میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تم اپنے پرستاروں سے ملنے جاتی ہو ان کا دیدار کرنے پھرے اڑانے جاتی ہو ان لفنگوں کی قربت میں تمہیں سکون ملتا ہے۔ تم کسی سے ملنے نہیں جاؤ گی...... بس!''

''ارے کیسے نہیں جاؤں گی ، اگر میں نہیں گئی تو تم بھوکے مر جاؤ گے...... کل کے مرتے آج مر جاؤ گے بغیر دوا اور علاج کے۔ مجھے مجبوراً کمانے جانا پڑتا ہے۔ کرایہ ، دودھ ، گھر ، بجلی گیس ، سبزی یہ سب پیسوں کے محتاج ہیں اور ان کی محتاجی مجھے دور کرنا پڑتا ہے۔'' صنوبر بولتی چلی گئی۔

''دیکھا...... دیکھا دے دیا نا طعنہ...... کہ میں تمہارے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں اور تم مجھ محتاج کی مدد

نہیں کہا جب تم حادثے میں مفلوج ہوگئے تو میں نے کیسے دن رات ایک کر دیے میں کتنی مقروض ہوگئی تھی میں نے کس طرح کما کما کر وہ قرض اتارا، تمہارا مہنگا ترین علاج کرایا اور ...... اور تم نے میری خدمت، میری قربانیوں اور چاہتوں کا کیا صلہ دیا...... مجھے غیر مردوں کے حوالے کر کے تمہیں پیسہ چاہیے تھا...... واہ...... مولا تو نے میری قسمت بناتے ہوئے میرے نصیب میں بربادی اور تباہی لکھی تھی...... اب نئے سرے سے زندگی جینی ہے مجھے۔ خود کو مضبوط اور بہادر بنانا ہے۔ اس معاشرے میں بھانت بھانت کے لوگوں میں ایڈجسٹ ہونا ہے جس طرح ہر ایک کی جسامت، صورت، شکل، رنگ، فطرت الگ الگ ہے ان سب کے ساتھ رہنا ہے یا اللہ مجھے ہمت دے، حوصلہ دے، میرے لیے ایسے وسائل پیدا فرما جس سے میری زندگی کا سفر سہل ہو جائے۔

ابھی شادی کو تین مہینے تو ہوئے تھے جب تم حادثے کا شکار ہوئے تھے اور تین مہینے کی دلہن نوکری کے لیے گھر سے نکل پڑی ظاہر ہے ہم دونوں کا قصور کون تھا۔ تمہارے گھر والے تم سے اور میرے گھر والے ناراض تھے اور جلد ہی مجھے نوکری مل گئی۔ میرے جسم کا ایک ایک حصہ پھوڑے کی طرح درد کرتا کیونکہ میں ایک مضبوط طاقت ور مرد کی طرح دو دو نوکریاں کرتی، میرا دل چاہتا جب ڈیوٹی سے گھر میں داخل ہوں تو تم مسکرا کر میرا خیر مقدم کرو پھر چائے پیتے ہوئے مجھ سے التفات کی باتیں کرو اور جب ہم بستر پر لیٹیں تو تم سارے دن کی مصروفیت مجھ سے شیئر کرو مگر تم ...... تم کتنے احسان فراموش اور بے حس انسان ہو پتھر ہو پتھر تم صرف اور صرف اذیت دینا جانتے تھے۔ تم زہر بو کر امرت اگانا چاہتے تھے۔ گالی دے کر مسکراتا دیکھنا چاہتے۔ اذیتوں کے پہاڑ گرا کر کہتے ہنستے رہو جسم سے روح نکال کر کہتے جی کر دکھاؤ۔ وجود سے لباس کھینچ کر کہتے بے حسی کا اظہار کرو پتھر مار کر کہتے پھول برساؤ۔ میں نے وہ سب کچھ بھی برداشت کیا لیکن تمہاری شکی طبیعت نے ہماری زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ سوچتے سوچتے ...... تم اپنی کمزوری اتنے گھٹیا لفظوں میں غیر مردوں سے منسوب کرتے کتنے شرم اور ندامت کی بات تھی۔ میرے صبر اور قربانی کا یہ صلہ تھا؟

دوسرے روز ناشتہ کرتے ہوئے صنوبر نے کہا ''ثریا اس سوسائٹی میں کوئی فلیٹ کرایہ کے لیے ہوگا؟''

''ارے تو کیا تم الگ رہنا چاہتی ہو؟'' ثریا نے چونک کر سوال کیا تو صنوبر نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اور کیا پگلی کیا ہمیشہ کے لیے یہاں رہوں گی بھئی کل کو تمہاری بھی تو بہو آئے گی۔ یہ چار کمروں کا فلیٹ ناکافی ہوگا۔''

ثریا ہنس پڑی ''اچھا تو بیس سال پہلے خالہ جانی ہمارے بیٹے کی دلہن کا بندوبست کر رہی ہیں۔''

اشعر بھی ہنس پڑا ''بھئی آپ بھی کمال کرتی ہیں ہماری بیگم کی طرح مستقبل کے بارے میں پلاننگ کرتی رہتی ہیں۔ ارے بھئی جب تک دوسرا مکان لے لیں گے دعا کریں......''

''نہیں ثریا میری بات کو مذاق میں مت ٹالو پلیز تمہارے قریب ہی سہی میں الگ رہنا چاہتی ہوں۔'' صنوبر نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا

''ارے بھئی جب آپ کی بہن کا گھر موجود ہے تو پھر الگ مکان کی کیا تک ہے۔'' انہوں نے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے کہا تو ثریا جھٹ بول پڑی ''ارے بھئی لینے بھی دیجیے اسے الگ فلیٹ کچھ عرصے بعد وہ اچھا سا جیون ساتھی ڈھونڈ لے گی اور اپنی جنت میں زندگی جیئے گی۔''

''نہیں ثریا اب میں ایسی غلطی نہیں کروں گی

ایک دفعہ جنت کی تمنا کی فرشتے سے شادی کی تو وہ شیطان بن گیا اور دوزخ نصیب میں آ گئی۔

جب اس نے جنت نہیں دی جس کے لیے میں نے کیا کچھ نہ کیا دل و جان سے ...... زندگی، بندگی جسم و جان کا مالک وجود کے ہر حصے کا حقدار اور حاکم سمجھا اس نے کتنی آسانی سے تین دفعہ کی تکرار سے اپنی زندگی سے نکال پھینکا۔''

''اچھا چلو اس موضوع پر ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اشعر نے صنوبر کی طرف التفات سے دیکھا پھر بیوی سے مخاطب ہوا ''ارے بھئی بیگم فرسٹ کلاس سی گرم گرم کافی تو پلائیں تاکہ ایسی ڈسکس کے بعد ایک دم فریش ہو جائیں ہم ......''

انہوں نے ایک بار پھر صنوبر کی طرف دیکھا۔ ثریا کمرے سے جا چکی تھی۔ صنوبر بھی تیزی سے ان کے پیچھے باہر نکل گئی۔ ثریا نے تو نہیں البتہ صنوبر نے محسوس کیا کہ اشعر کی نظریں کچھ کہہ رہی ہیں۔ صنوبر نے خود ہی کوشش کی اور اسے ثریا کے قریب ہی فلیٹ مل گیا ثریا اور صنوبر سے زیادہ اشعر خوش تھے۔

صنوبر کب تک سوگ مناتی وہ دوبارہ اپنی مصروفیات میں مشغول ہو گئی۔ اب بھی وہ محنت اور جستجو میں لگی تھی اب تو اسے نئے سرے سے سب کچھ جوڑنا تھا۔ گھر گرہستی کے لیے ضروریات کی اہم اشیا خریدنا تھیں دوبارہ ایک بار پھر سیٹ ہونا تھا۔

دو تین دن میں صنوبر نے الگ فلیٹ سیٹ کر لیا تھا۔ ابھی بیڈ روم الماری کچن کا سامان بستر وغیرہ خریدا تھا۔ اس کے پاس زیور تھا اسے فروخت کر کے شاپنگ کی تھی اب تو اس کی تنخواہ کافی حد تک پس انداز ہو سکتی تھی۔ آج اسے صبح ہی سے ثریا کا بیٹا میرب بہت یاد آ رہا تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ اٹیچ ہو گیا تھا آنی آنی کہتے تھکتا نہ تھا اس نے ثریا کو فون کیا کہ تم میرب کو میرے پاس لے آؤ۔ ابھی میں مصروف ہوں آج نہیں آ سکوں گی۔ دونوں سہیلیوں میں بہت محبت تھی دونوں ایک دن بھی ایک دوسرے کو نہ دیکھیں تو انہیں چین نہ پڑتا تھا۔ صنوبر کو جب تنخواہ ملتی تو میرب کے لیے ڈھیروں شاپنگ کر ڈالتی قیمتی کھلونے کپڑے اور ان کی ضروریات کی اشیا خریدتی دونوں میاں بیوی بہت منع کرتے تو وہ ناراض ہو جاتی کہ ''آپ لوگوں نے کتنے کٹھن اور مشکل وقت میں میرا کتنا ساتھ دیا اپنوں سے بڑھ کر مجھے مان دیا ورنہ تو شاید میں......''

''میں کیا'' ثریا نے اسے گھورا...... ''یہی نا کہ تم خودکشی کر لیتیں ...... یہ بدترین اور بیہودہ قسم کے عزائم آپ کے آج سے چند سال پہلے کے ہیں...... یاد ہے...... پیاری سی صنوبر جان ...... کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا اور نہ ہی اتنا بزدل ہے کہ ذرا سا مشکل اور کڑا وقت آیا کہ جناب بس چلے سوسائڈ کرنے جان من زندگی کے دو رخ ہیں اگر تم نے تاریک اور نگیٹو فیل کیا تو تم سوسائڈ کی طرف بڑھ گئیں یہ دانشمندی نہیں ہے ذرا سوچو تو اس کا برائٹ اور پوزیٹو پہلو کتنا دلفریب حسین اور سرور انگیز ہوگا...... اگر تم تاریکی میں کھڑی ہو تو ناامید نہ ہو کہ یہی تمہاری منزل ہے جان عزیز جب تمہیں روشنی کی چمکتی قوس قزح بکھرتی کرنوں کا حصار نصیب ہوگا تو تب تم خود کو لکی سمجھو گی اب بہت جلد تمہاری لائف برائٹ اور بیوٹی فل ہونے والی ہے بالکل پرفیکٹ اور ہینڈسم جیون ساتھی ملے گا اور تمہیں روشنیوں کے شہر کی ملکہ بنا دے گا، سمجھیں'' ثریا نے صنوبر کی ناک پکڑ کر ہنستے ہوئے کہا تو اب کی بار اس نے انکار نہیں کیا کیونکہ وہ چند دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ سوسائٹی کے لوگ اسے کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہے ہیں شاید...... ان لوگوں نے مجھے ...... آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی...... نہیں ...... نہیں ایسا نہیں، یہ صرف میرا خیال ہو اور غلط ہو...... وہ اکثر ان وسوسوں میں گھری رہتی اس وقت اسے سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا کہ چلو ثریا

اور اشعر بھائی تو ہیں وہ اکیلی تو نہیں۔
آج جب وہ رات کو واپس آئی تو ایک بزرگ نے اسے روکا وہ اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔انہوں نے کہا...... بیٹا ذرا بات تو سنیں۔
السلام علیکم!صنوبر نے سلام کیا۔ بزرگ نے دعائیں دیں اور کہا ان سارے محلے والوں کی طرف سے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟ جی انکل صنوبر نے جواب دیا''آپ میرڈ ہیں؟''
''جی...... میں بیوہ ہوں۔''صنوبر نے بڑی اداسی سے کہا''آپ کہاں جاتی ہو؟''سوال پر سوال کرتے ہوئے بزرگ اس کے ہر جواب پر دوسرا سوال کردیتے۔''جی میں سروس کرتی ہوں۔''
''کیا آپ کے عزیز رشتے دار نہیں ہیں؟''
صنوبر نے ایک ٹھنڈی سانس لی......''جی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔''وہ نہایت ہی تمیز اور ادب سے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔''بیٹی ایک بات کہوں؟''انہوں نے رک کر اس کی طرف شفقت سے دیکھا۔''جی انکل فرمایئے......''
''اس سوسائٹی کے لوگ تمہارے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں۔''
''انکل اپنے اپنے ظرف اور سوچ کی بات ہے اگر ان لوگوں نے میری کوئی غلط حرکت دیکھی مجھے کوئی برائی کرتے ہوئے پکڑا ہوتا تو وہ اپنی سوچ پر بجا تھے لیکن میری کوئی غلطی یا کوتاہی کو انہوں نے دیکھا نہیں اور میرے کیریکٹر پر شک کررہے ہیں بہت حیرت کی بات ہے میں تو ہر ایک سے سلام دعا کرتی ہوں آپ بتایئے میں ان لوگوں کو کیسے مطمئن کروں؟''وہ بے بسی سے بولی۔''ایک پریشان مجبور اور بے بس عورت کو پرکھے اور جانے بغیر رائے قائم کرلی یہ کہاں کا انصاف ہے؟''
''بیٹی دراصل ان لوگوں کو زیادہ اعتراض تمہارے تنہا رہنے پر ہے۔''
''ٹھیک ہے بابا میں اپنا بندوبست کرلوں گی۔''اس نے سر جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا اور پلٹ کر فلیٹ کا تالہ کھولنے لگی۔انکل نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھا اور سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔
یہ معاشرہ اور اس میں رہنے والے لوگ کسی کے بارے میں کبھی پوزیٹو نہیں سوچتے ہمیشہ غلط قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں کسی کے کردار کو داغ دار کرنا اس سے منفی مفروضے منسوب کرنا اچھا لگتا ہے۔میں کس کس کے سامنے صفائیاں پیش کرتی پھروں...... یا اللہ میری مدد فرما مجھ میں حوصلہ اور ہمت پیدا کر کہ میں اس زندگی کو اچھے انداز میں گزار سکوں۔وہ انہی سوچوں اور خیالات میں کام میں مصروف رہی آج جسمانی طور پر وہ بہت تھکی ہوئی تھی سونے پر سہاگہ ان انکل نے اسے ذہنی ٹینشن میں مبتلا کردیا تھا۔
تب ہی ثریا کی کال آگئی اس نے صنوبر کو رات کے کھانے پر بلایا تھا مگر صنوبر نے معذرت کرلی کہ وہ آج بہت تھکی ہوئی ہے سر میں درد بھی ہے کل آئے گی۔ثریا نے اشعر سے کہا چلیں ہم لوگ کافی صنوبر کے ساتھ پئیں گے تھرمس میں لے کر چلتے ہیں۔صنوبر کھانے سے فارغ ہوکر نماز عشا ادا کی پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔اس نے چولہا جلایا ہی تھا کہ بیل بجی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ثریا اور اشعر کھڑے تھے۔اس نے اشعر کو سلام کیا ثریا کو گلے لگایا میرب کو گود میں اٹھا کر چوم لیا۔آنی (آپ تی طب ات تیسی ہے) یہ سن کر تینوں ہنسنے لگے۔صنوبر نے بچے کو بڑی زور سے بھینچ لیا میری جان چندا جانی اب آنی آپ کو دیکھ کر ٹھیک ہوگئی ہے تینوں آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔اشعر نے تھرمس صنوبر کی طرف بڑھا دیا چلیں ہم سب مل کر گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے ہیں''ارے یہ کیا کیا آپ لوگوں

نے میں نے کافی بنانے کے لیے چولہا جلایا ہی تھا کہ آپ لوگ آ گئے۔'' وہ چولہا بند کرنے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ بھی اٹھ گئے سردی بڑھتی جا رہی تھی جاتے جاتے اسے کہہ گئے تھے کہ کل رات کو ادھر ہی آ جانا ہم ساتھ کھانا کھائیں گے۔

دوسرے دن کھانے سے فارغ ہو کر میرب کی برتھ ڈے کا پروگرام سیٹ کرنے بیٹھ گئے کافی دیر ہوگئی ثریا نے اشعر سے کہا آپ صنوبر کو چھوڑ آئیں رات زیادہ ہوگئی ہے۔ صنوبر نے لاکھ منع کیا مگر ثریا بضد تھی۔ صنوبر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی اسے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے اس نے گھوم کر دیکھا تو اشعر اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی بوکھلاہٹ میں اس کا پیر پھسل گیا اور وہ سیڑھیوں سے گرنے لگی تب ہی وہ اشعر کی مضبوط بانہوں میں آ گئی۔ وہ حواس باختہ ہوگئی تیزی سے ان سے الگ ہوئی۔'' ابھی آپ گر جاتیں اور اچھی خاصی زخمی ہو جاتیں...... میں کوئی ایسا خوفناک بھی نہیں ہوں کہ آپ گھبرا گئیں، صنوبر جی ہمت اور حوصلے سے کام لیا کریں ہمیشہ سوچوں کی دنیا میں نہ رہا کریں۔ آپ اپنے اردگرد کی خبر بھی رکھا کریں اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو واپس چلیں آج رات ہمارے ہاں رک جائیں۔'' صنوبر نے اشعر کی اس آفر کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔'' اشعر بھائی جائیں اب میں چلی جاؤں گی وہ ان کو اور آگے لے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔''

اس کے دل و دماغ میں عجیب سی جنگ ہو رہی تھی کیا اشعر نے جان بوجھ کر ایسا کیا...... مگر نہیں گری تو میں خود تھی وہ تو اچھا ہوا کہ اشعر وہاں موجود تھے ورنہ آج تو مجھے سیڑھیوں سے لڑھکتے ہی چلے جانا تھا اتنی رات گئے اگر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا تو...... نہیں انہوں نے جان کر مجھے اپنی بانہوں میں نہیں لیا تو اتفاق سے ہوا اگر ثریا کو پتہ چل جائے تو کہیں اس کا مان اور مجھ پر اس کا اعتماد اٹھ جائے گا پھر اس کے خیالات میرے لیے کیا ہوں گے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔

انسان اگر غم و فکر میں مبتلا ہو سوچوں میں الجھا ہو خیالات کی یلغار ہو تو ایسے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ جاتی ہیں میری چھٹی حس بیدار ہو رہی ہے اور مجھے بار بار اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اشعر کی باتیں، خلوص ومحبت، اپنائیت ذومعنی گفتگو اس بات کا ثبوت ہے صنف مخالف کے لیے پیدا ہونے والے عامل ہیں اگر ایسا ہوا تو وہ ثریا کی نظروں میں گر جائے گی وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی وہ دیر تک خیالات اور سوچوں کے جال میں الجھی رہی آخر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔

اب وہ کافی محتاط ہوگئی تھی وہ کم سے کم اشعر کا سامنا کرنا چاہ رہی تھی وہ بچی تو نہیں تھی کہ کسی کی نظروں کو نہ سمجھ سکے وہ اشعر کے ارادے بھانپ کر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ میرب اس کی سب سے بڑی کمزوری بن گیا تھا۔ وہ صنوبر سے بہت زیادہ پیار کرنے لگا تھا دو دن صنوبر سے نہیں ملتا تھا تو وہ بیمار پڑ جاتا تھا۔ تب ثریا اور اشعر صنوبر کو فون کرتے کہ فوراً آؤ میرب کو بہت تیز بخار ہے وہ رو رہا ہے تمہیں یاد کر رہا ہے صنوبر کو مجبوراً نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑتا۔

ان ہی دنوں ثریا کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی گڑیا ماشاءاللہ ایک سال کی ہوگئی تھی۔ اب پھر ثریا کے ہاں تیسرے مہمان کی آمد متوقع تھی تھرڈ فلور چڑھنا اترنا ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا۔ ثریا میکے چلی گئی مگر اشعر اپنے ہی گھر میں رہتے اب میرب کی ضد کیسے پوری کی جاتی کہ مجھے آنی کے پاس جانا ہے۔ بڑی پریشانی ہو رہی تھی کبھی اس کا ماموں میرب کو

صنوبر کے پاس لے جاتا۔ اکثر تو یہ ہوتا کہ آفس سے آتے ہوئے صنوبر ثریا سے ملتی ہوئی آتی کیونکہ ثریا کا میکہ اس کے راستے میں پڑتا تھا۔ الماس سے اور ثریا کی امی ابا سے صنوبر کو انسیت ہوگئی تھی بہت ہی شفیق اور محبت کرنے والے تھے سب ہی لوگ۔ اگر ایک دو دن ہو جاتے تو الماس کال کر کے کہتی کہ باجی میرب ہی نہیں بلکہ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا...... بس آج رات کا کھانا ہم سب ساتھ کھائیں گے اور صنوبر کو ان کے خلوص و اصرار پر جانا پڑتا۔

آج چھٹی کا دن تھا وہ دیر تک سوتی رہی۔ وہ اٹھی اس نے باتھ لیا اور ابھی واش روم سے نکل ہی رہی تھی کہ بیل بجی اس نے دروازہ کھولا اشعر تھے جھینپ گئی تیزی سے بیڈ روم کی طرف لپکی وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی بھیگا بھیگا سا بدن نکھرا نکھرا چہرہ اور لمبی سیاہ گھنی زلفوں سے ٹپکتے ہوئے موتی جیسے پانی کے قطرے اس کی پشت کو بھگو رہے تھے۔ اس نے دوپٹے کو ڈھنگ سے اوڑھا۔ ''بیٹھیے اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ سب ٹھیک تو ہیں ثریا کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''کچھ بہتر نہیں ہے۔''

''آنٹی، انکل الماس میرب گڑیا سب کیسے ہیں میرب بہت یاد آ رہا ہے۔''

اشعر بے ساختہ بول گئے۔ ''ارے بھئی کبھی میرب کے ابو کو بھی یاد کر لیا کریں ان کی بھی مزاج پرسی کر لیا کریں۔'' وہ مسکرائے۔

''ارے کیوں نہیں آپ لوگ بھی کوئی بھولنے والی ہستیاں ہیں۔'' وہ خلوص سے بولی حالانکہ وہ اشعر کا اشارہ ان کی بات کا مطلب جان چکی تھی۔

''آپ چائے لیں گے یا......''

''نہیں بھئی ہمیں کچھ نہیں چاہیے جو قریب ہے وہ تو دسترس میں نہیں۔'' صنوبر جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی...... ''صنوبر میں آج تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔'' انہوں نے تمہید باندھنی شروع کی۔

''میرے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں۔ میں خود ادھوری زندگی جی رہی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا تو اشعر مسکرائے

''ڈیئر تمہارے پاس سب سے زیادہ قیمتی اور پیاری چیز تمہارا اپنا وجود...... تم خود اور اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنا تمہارا حق بنتا ہے...... اور ہاں اس ادھوری زندگی کو ہی تو مکمل کرنا چاہتا ہوں میں تم سے تم کو مانگنا چاہتا ہوں بولو منظور ہے...... تم مجھے بھائی کہہ کر نہیں بلایا کرو۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا میں سمجھی نہیں......'' وہ ہکلائی......

''سویٹی...... اب تم اتنی بھی نا سمجھ نہیں ہو کہ میری سمپل سی بات کا مطلب نہ سمجھ سکو...... میں تم کو پسند کرنے لگا ہوں اس ہی روز سے جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا اور تمہاری آپ بیتی سنی۔ ڈیئر ٹھنڈے دل سے، آرام سے ریلیکس ہو کر سوچ کر جواب دینا...... میں تمہاری اداسی اور تنہائی نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہارے دکھ تمہاری محرومیاں تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں انکار مت کرنا وہ رک کر آس بھری امید نظروں سے دیکھنے لگے۔''

''پلیز اشعر بھائی ثریا کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں میرے مان کو نہ توڑیئے۔ ہماری دوستی میں فاصلے اور بدگمانیاں نہ پیدا کریں...... اشعر بھائی آپ......'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی بیحد نروس اور خوفزدہ سی ہوگئی تھی۔ اشعر کو اس کی حالت پر رحم اور پیار آ گیا۔

''پلیز...... پلیز...... مائی ڈیئر صنوبر...... خود کو سنبھالو اتنی پریشان اور ٹینس کیوں ہو رہی ہو؟ ارے

ہم شادی کرلیں گے...... تمہاری ثریا سے دوستی اور پکی ہوجائے گی اور فاصلے بڑھیں گے نہیں گھٹیں گے ہم سب ایک فلیٹ میں رہیں گے......'' تب...... صنوبر بلک بلک کررونے لگی...... ''اشعر بھائی میں نے زندگی میں صرف آپ لوگوں پر بھروسہ کیا اس بے بسی اور بے یارو مددگار لمحوں میں آپ کی دہلیز کھٹکھٹائی پلیز آپ ہماری دوستی خلوص اور چاہت کا مذاق نہیں بنائیں اس سچائی خلوص، اپنائیت اور مان کو نہ توڑیں...... آپ کو اللہ کا واسطہ ہے آپ یہاں سے چلے جائیں، میں آپ کے خلوص مجھ سے ہمدردی اور میرے بارے میں ایسی باتیں سوچنے پر آپ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں آپ مجھ سے ہمدردی کرسکتے ہیں، میری تنہائی دور کرسکتے ہیں میری بے بسی کم کرسکتے ہیں میرے بھائی بن کر...... یہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کررورہی تھی۔ اشعر اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھے اس کے معافی کے انداز میں بندھے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور چشم زدن میں فلیٹ سے باہر نکل گئے۔ ان کو اس ٹوٹتی بکھرتی معصوم سی لڑکی پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد صنوبر دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی مگر کب تک اسے ایک کندھے کی ضرورت تھی اپنا کندھا ہو جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے۔

......☆......

وہ ایک بار پھر ماضی کے اذیت ناک لمحات میں کھوگئی۔ وہ ماضی کے اس جنگل میں بھٹکنے لگی جہاں وہ ہنستی مسکراتی شریر سی صنوبر تھی۔

الیکشن کے ہنگامے زوروں پر تھے تمام ورکرز، لیڈیز جینٹس، سرکاری ملازمین سب کی ڈیوٹی لگی تھی کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ آپی نے گھر آکر بتایا کہ اسے آپی کے ساتھ جانا ہے پریزائڈنگ افسر سے ملنا تھا اور سینٹر دیکھنا ہے پولنگ بوتھ تلاش کرنا بھی ہے جو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے پہلے ہی دیکھنا ضروری ہے تاکہ صبح جلد وہاں پہنچ جائیں تمام اسکولز کالجز اور دیگر محکموں کے ورکرز آئے ہوئے تھے بڑے بڑے ٹینٹ لگے تھے لاؤڈ اسپیکر کا شور شدید گرمی اتنے سارے نفوس اللہ اللہ کیا منظر اور حالت تھی...... ہر کوئی بھاگ رہا تھا کبھی ادھر کبھی ادھر کہیں پریزائڈنگ افسر ندارد تو کہیں اسسٹنٹ پریزائڈنگ افسر دستیاب نہیں، کہیں پولنگ آفیسر غائب۔ صنوبر بھلا نچلی کہاں بیٹھتی چلبلی سی چہکنے والی ہلا گلہ کرنے والی خاموش ایک جگہ بیٹھی رہے یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ صنوبر اور اتنی دیر خاموش بیٹھتی۔

''آپی آپ آرام سے بیٹھی رہیں اپنی ساتھیوں کے انتظار میں۔ میں تو کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں بھوک کے مارے انتڑیاں سورۃ اخلاص کا ورد کررہی ہیں اور دماغ سے انواع اقسام کے کھانوں کی ایک لمبی فہرست نظر آرہی ہے میں ذرا پیٹ پوجا کا کچھ انتظام کرلوں پتہ ہے نا آپی ہم سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔''

''صنوبر کبھی تو سیریس ہوجایا کرو یہ اس جم غفیر میں تم ادھر ادھر ہوگئیں تو میں کہاں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرواتی پھروں گی۔'' آسیہ نے انسانوں کے اس مجمع کو دیکھ کر کہا تو صنوبر زور سے ہنس پڑی۔

''میری بھولی معصوم سی آپی جانی میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں عالم جوانی میں داخل ہوگئی ہوں۔'' آسیہ بھی ہنس پڑی ''اچھا لیکن جلدی آجانا اگر میری کال آگئی تو میں چلی جاؤں گی اوکے......''

''اوکے۔'' صنوبر مسکراتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ''ارے ہاں سنو یہاں کوئی چیز ملے گی بھی یا نہیں؟'' آسیہ نے سوال کیا۔

''آپی جہاں چار بندے جمع ہوئے خوانچے والے اپنا پڑاؤ بھی ڈال دیتے ہیں بن کباب، چھولے، دہی بڑے مکس چاٹ، پکوڑے سموسے

فروٹ چاٹ حلیم ارے یار کچھ تو ملے گا ہی......"
"مگر پیسے منہ مانگے لیں گے ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔"
"تو آپ مجبور نہ ہوں صبر کرلیں اور گھر جا کر آرام سے پیٹ بھر کر کھانا کھائیں۔" آسیہ نے مسکرا کر کہا تو صنوبر مسکراتی ہوئی بولی۔ "چلیں ٹھیک ہے میں مجبور ہو جاتی ہوں اور آپ صابر بن جائیں۔"
وہ دیر سے نوٹ کر رہا تھا کہ جب وہ آپی کے ساتھ بیٹھی بیزاری سے پہلو بدل رہی تھی پھر دونوں بہنوں کی نوک جھونک اور تفریح سے وہ بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیسے کیوں وہ بائیک لے کر اس کے تعاقب میں نکل پڑا صنوبر کافی دور تک نکل آئی کوئی خوانچے والا، کوئی ٹھیلے والا کچھ بھی تو نظر نہیں آرہا تھا موسم نے اچانک کروٹ بدلی آج کی اتنی شدید گرمی سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ زبردست بارش ہوگی صنوبر گھبرا گئی تب ہی اس کی نظر سامنے بیکری پر پڑی وہ تیزی سے وہاں پہنچی اور کچھ چیزیں خرید کر واپس پلٹی ہی تھی کہ ننھی ننھی بوندوں نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کرلی...... صنوبر پریشان ہوگئی یا اللہ کوئی سواری نظر نہیں آرہی پیدل جانا بہت مشکل تھا جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی سڑک گڑھوں میں کھڑا پانی اور وہ...... اس نے دیکھا ایک بائیک اس کے قریب آکر رکی۔ "پلیز مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو ڈراپ کردوں......"
"جی...... جی نہیں شکریہ میں چلی جاؤں گی زیادہ دور نہیں جانا ہے۔" وہ ہنسا۔ "اچھا آپ پیدل جاسکتی ہیں تو جایئے مگر مجھے معلوم ہے آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں نے وہاں آپ کو اور آپ کی آپی کو دیکھا ہے اس وجہ اور حوالے سے میں بھی آپ کا اور آپی کا ساتھی بن گیا ہوں وہ ہنسا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں آپ مجھ پر بھروسہ کریں بحث میں وقت خراب نہ کریں اس افراتفری میں آپی آپ کی وجہ سے پریشان ہو جائیں گی اپنا نہیں تو کم از کم ان کا ہی خیال کریں۔" صنوبر نے واقعی ایسا نہیں سوچا تھا تب ہی سامنے سے ایک رکشا آتا دکھائی دیا وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی اور رکشے میں سوار ہوگئی۔
جب وہ آپی کے پاس پہنچی تو غصے سے بے قابو ہوگئی" ...... کیا مصیبت ہے یہ الیکشن ولیکشن دیکھیں تو میری کیا حالت ہوگئی ہے یہ ہیرو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے مختلف وجوہات بیان کرنے لگے کہ وہ کس وجہ سے ڈراپ کرنا چاہتے ہیں بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی۔ بھوکے مرو بارش میں بھیگو شوخ وشریر نوجوانوں سے الجھو، ایک دو تین...... بھلا ہو چھینکوں کا کہ صنوبر کی زبان رکی۔
"اللہ بھلا کرے تمہاری ان چھینکوں کا ورنہ ابھی ایک گھنٹہ مزید آپ کی زبان 120 کی رفتار سے سفر کر رہی ہوتی۔" آسیہ نے ہنس کر کہا تو وہ اور الجھ گئی۔ گھر پہنچنے تک اسے تیز بخار آ گیا چھینکیں مسلسل آرہی تھیں وہ رات کو ٹیبلٹ لے کر سوئی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا صبح کلینک پہنچ گئی...... یا اللہ یہ کیا ہوا آج سارا محلہ بیمار پڑ گیا کس قدر لمبی لائن تھی وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔ اللہ میاں ایسا معجزہ ہو جائے کہ اب میرا نمبر آ جائے چکر اور سر میں شدید درد تھا نزلہ کھانسی کمزور کل سے آج تک لگ رہا ہے جیسے وہ برسوں کی بیمار ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے نزلہ ہونے سے وہ بار بار رومال سے ناک رگڑ رہی تھی جس کے سبب سرخ ہوتی ناک اور آنسوؤں بھری آنکھیں۔ بمشکل پندرہ منٹ بیٹھی ہوگی صرف ایک پیشنٹ فارغ ہوئی تھی۔ کمپاؤنڈر نے صنوبر کی طرف اشارہ کیا بی بی جی آجائیں۔ اس نے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا میں...... جی آپ! صنوبر نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ کمپاؤنڈر نے یہ کیوں کہا

مجھ سے پہلے بیٹھی ہوئی خواتین میں سرگوشیاں ہونے لگیں کچھ باآواز بلند احتجاج کرنے لگیں تب کمپاؤنڈر نے ان سب کو یہ کہہ کر شانت کیا کہ یہ سب سے پہلے آئی تھیں جب ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تھے ان کا گھر قریب ہے وہ گھر چلی گئی تھیں آوازیں کم ہوگئیں۔ صنوبر نے حیرانی سے مڑ کر کمپاؤنڈر کی طرف دیکھا...... صنوبر نے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچ کر سلام کیا ڈاکٹر نے جواب دیا ......جی فرمائیے! وہ صنوبر سے کیفیت پوچھنے لگے ساری کیفیت سن کر ڈاکٹر نے کہا ''آپ کو سردی لگ گئی ہے...... کیا کل بارش میں خوب نہائی تھیں۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر سوال کیا تو صنوبر سے پہلے صوفے پر بیٹھے شخص نے منہ کے آگے سے اخبار ہٹایا اور بولا ''ارے یہ نہائی کیا بھئی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں لمبا راستہ طے کیا اگر یہ کل میری بات مان لیتیں اپنی ضد پر نہ اڑی رہتیں تو ایسی حالت تو نہ ہوتی۔'' صنوبر نے آواز سن کر گردن گھمائی تو سامنے کل والے موصوف بیٹھے تھے'' ارے کیا تم جانتے ہو ان کو۔'' ڈاکٹر فاروقی نے نسخہ لکھتے ہوئے سوال کیا ''ہاں یار کل ہی واقفیت ہوئی ہے الیکشن آفس میں، میرا خیال ہے کہ آپ نے باہر ایک لمبی لائن دیکھی ہوگی مریضوں کی (موصوف جسے فاروقی صاحب سجاد کہہ کر مخاطب کررہے تھے) بولے تو صنوبر نے کہا جی بالکل لمبی لائن دیکھی ہے میں نے لیکن آپ نے یہ غلط حرکت کی ہے اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ تو گویا آپ ہمارا شکریہ ادا کرنے کے بجائے الٹا ہم پر ناراض ہورہی ہیں ٹھیک ہے آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے اب کسی سے بھی ہمدردی نہیں کریں گے۔'' شاید سجاد صنوبر کے اس رویے کا برا مان گئے تھے۔

جب وہ ڈاکٹر کے کمرے سے نکلنے لگی تو اس نے دیکھا کہ سجاد دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگئے وہ بہت سیریس لگ رہے تھے صنوبر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اس سے ٹھیک سے چلا بھی نہیں جارہا تھا چکر آرہے تھے اگر میں اس لائن میں بیٹھی رہتی تو اپنا نمبر آنے تک بے ہوش ہوگئی ہوتی یہ سجاد کی مہربانی اور احسان ہے مجھ پر میں نے بچارے کو جھڑک دیا وہ کمرے سے نکلتے نکلتے پیچھے مڑی ''آئی ایم ویری سوری سجاد صاحب'' کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر نے دوسرے روز بھی بلایا تھا پانچ دن متواتر انجکشن لگنا تھے یوں ان پانچ دنوں میں سجاد سے پانچ مرتبہ ملاقات ہوئی وہ آفس سے آنے کے بعد ڈاکٹر فاروقی کے کلینک آجاتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے دونوں کی دوستی بچپن سے تھی یوں ان پانچ دنوں میں صنوبر اور سجاد کی بڑی دوستی ہوگئی۔ ایک دوسرے کو مکان اور رابطہ نمبرز دیئے گئے اور یوں یہ دوستی پختہ سے پختہ ہوگئی پھر والہانہ محبت میں بدل گئی بات اتنی بڑھی کہ دونوں نے اپنے اپنے والدین عزیز واقارب کی مخالفت کے باوجود شادی کرلی۔ صنوبر کے گھر والے برادری سے باہر شادی نہیں کرتے تھے۔ سجاد کی منگنی بھی اپنے چاچا کی بیٹی سے ہوگئی تھی۔ صنوبر اور سجاد دونوں نے اپنوں سے اپنی روایات سے بغاوت کردی تھی۔ شادی میں کوئی اپنا شریک نہیں تھا دونوں نے یہ قدم اٹھایا تھا دونوں میں سے کوئی بھی تکلیف میں ہوتا تو خود ہی بھگتنا پڑتا تھا۔ لو میرج میں یہ ہی ہوتا ہے۔ ارینج میرج میں کم از کم بزرگوں کی مرضی سے شادی ہوتی ہے اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو بزرگ ہی اسے حل بھی کرتے ہیں اب خود ہی پرابلمز فیس کرنا اور خود ہی سولو کرنا پڑتا ہے۔ شادی کے چند مہینے بعد ہی سجاد کا ایکسی ڈنٹ ہوا اور وہ ایک پیر سے مفلوج ہوگئے۔ پرائیویٹ سروس تھی بیماری اور حادثے کے سبب وہ کمپنی نہ جاسکے اور نوکری چھوٹ گئی۔ بیماری، معذوری اس پر جاب لیس ہونا پے در پے ان حادثات نے سجاد کو چڑچڑا اور بدزبان کردیا تھا۔

کرائے کا مکان اس پر دیگر اخراجات بیماری کا مہنگا علاج...... اب اخراجات کہاں سے پورے ہوتے صنوبر نے جگہ جگہ درخواستیں دیں اور ایک جگہ سے آفر آ گئی اب زندگی کی گاڑی گھسٹم پھسٹم چل رہی تھی۔ دونوں کی ذہنی الجھنیں تھیں صنوبر کو شوہر کو دیکھنا ان کی بیماری کی فکر ان کی دواؤں کا خیال گھر کا کام، کمپنی کی ذمے داریاں شوہر کا التفات بالکل ختم ہو گیا تھا۔ زندگی مشین بن گئی تھی صبح جو جاگتی تو رات گئے تک کاموں میں مصروف رہتی۔ سجاد کی سوچیں اور خیالات ایک دم ہی بدل گئے تھے۔ دراصل وہ خود کو ناکارہ اور کمزور سمجھنے لگے تھے اس وجہ سے ان کے دل و دماغ میں منفی اور انتہائی غلیظ وسوسے آتے وہ بیوی کی ان قربانیوں اور ان تھک محنت کوشش اور جدوجہد کو غلط نظر سے دیکھتے اور سوچتے تھے ان کا خیال تھا کہ صنوبر ان کی طرف سے بے اعتنائی اور جذباتی لمحات نہ پا کر اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو باہر جا کر پورا کر لیتی ہے۔ پہلے وہ ڈھکے چھپے انداز اور الفاظ میں اس پر طنز کرتے مگر اب...... اب تو وہ کھلم کھلا جو منہ میں آتا بک دیتے تھے۔ صنوبر سارے دن کی تھکی ہاری جب بستر پر لیٹتی تو اس کا دل چاہتا کہ سجاد اس سے محبت اور التفات کی باتیں کرے اس سے سارے دن کی مصروفیت کے بارے میں کچھ پوچھے کچھ اپنی باتیں کرے اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پیار سے اچھی باتیں کر کے اس کی تھکاوٹ اور کام کو، اس کی محنت کو سراہے ایسا کرنے سے اس کی ساری تھکن لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ مگر وہاں تو ہر جذبہ سرد پڑا تھا۔ وہ اپنے عیب کو، اپنی کمزوری کو، اپنی کوتاہی کو چھپانے کے لیے الٹا بیوی پر حملہ کرتا جسے سن کر وہ تڑپ اٹھتی یہ انسان کی کیسی کم ظرفی اور غلط حرکت ہے کہ دوسروں کی ذات پر، کردار پر عزت پر ایسا حملہ کرو کہ وہ سنبھلنے نہ پائے اور آخر کار...... ایک دن ''الٹی گنگا'' کا یہ کھیل ختم ہو گیا۔ یہ انسان تو بے حد چھوٹی ذہنیت اور خیالات کا آدمی نکلا اس کی سوچ زبان اور خیالات کتنے گھٹیا اور گھناؤنے نکلے

گھڑی کی ٹک ٹک سن کر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے کیا میں اب یہاں سے بھی کہیں اور چلی جاؤں......؟ مگر میں جہاں بھی جاؤں گی وہاں ایسے ہی لوگ ملیں گے تو میں پھر وہاں سے کہیں اور...... تو اس طرح ساری زندگی میں سفر میں رہوں گی مجھے تحفظ اور سکون کہیں نصیب ہو گا بھی یا نہیں۔ میں اگر ثریا کو اشعر کی ساری باتیں بتا دوں تو کہیں وہ مجھے غلط نہ سمجھ لے مجھ پر اس کا اعتماد اٹھ جائے گا اور پھر ہم میں فاصلے بڑھ جائیں گے اور اگر نہ بتاؤں تو بعد میں ثریا مجھ پر اور زیادہ شک کرے گی کہ شاید میں بھی انوالو ہوں۔ یا اللہ میں کیا کروں کس سے مشورہ لوں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ثریا کی پرسکون زندگی میں طوفان آ جائے گا اے رب کریم مجھے اب مزید امتحان میں نہ ڈال اب میں بے حد تھک گئی ہوں اس قسم کے حالات برداشت نہیں کر سکتی رات دھیرے دھیرے صبح کی طرف بڑھنے لگی اور پھر صبح کے اجالے رات کی آغوش میں پناہ لے لیتے، یوں دن و رات کا سفر جاری رہتا ہے۔ آج ثریا کی طبیعت بہت خراب تھی۔ آفس میں صنوبر کے پاس اشعر کا فون آیا تھا ثریا ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئی تھی ڈیوٹی آف ہونے کے بعد صنوبر اشعر کے بتائے ایڈریس پر ہاسپٹل پہنچ گئی واقعی ثریا کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی ڈرپ لگی تھی اسے خون کی بھی کمی تھی ڈاکٹر اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے تھے کہ دونوں کی جان بچ جائے ان ہی دنوں میرب کے امتحان بھی ہو رہے تھے طے یہ پایا کہ میرب اشعر کے پاس رہے گا صبح اشعر جلدی آفس جاتے تھے تو اسے یوں کرنا تھا کہ وہ میرب کو صنوبر کے فلیٹ پر چھوڑتے جاتے میرب کی اسکول کی گاڑی اور صنوبر کے آفس جانے کا ٹائم ایک ہی تھا

اس طرح صنوبر میرب کو وین میں بٹھا کر اپنے آفس روانہ ہو جاتی اس ڈیوٹی سے اشعر بہت خوش تھے کہ روزانہ صنوبر سے ملاقات ہو گی اور صنوبر بری طرح گھبرا رہی تھی کہ اشعر بیحد جذباتی اور ضدی شخص ہے وہ روز ہی اس کا جینا حرام کر دے گا۔

دو چار دن بڑے نارمل گزرے۔ صنوبر خوش تھی کہ شاید ثریا کی طبیعت کی وجہ سے اشعر پریشان اور مصروف ہیں اس لیے پرسکون ہیں مگر کہاں...... اس شخص پر تو عشق کا بھوت سوار تھا اتنی پیاری وفادار بیوی ماشاء اللہ بیٹا بیٹی جنت جیسا گھر سب ہی کچھ تو تھا ان کی دسترس میں پھر بھی یہ کیسی ناشکری اور پاگل پن ہے آج انہیں پتہ چلا کہ صنوبر بیمار تھی آج آفس نہ جا سکی تو وہ میرب کو لے کر لوٹ گئے آفس فون کر دیا کہ کچھ لیٹ آئیں گے لیکن وہ میرب کو وین میں بٹھا کر صنوبر کی طرف پلٹ آئے۔ بیل بجی تو بڑی مشکل سے صنوبر اٹھی اسے شدید سردی محسوس ہو رہی تھی دروازہ کھولا تو اشعر تھے۔ ''ارے ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ اندر نہیں بلاؤ گی؟'' انہوں نے راستے میں کھڑی صنوبر سے سوال کیا تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو اندر آنے کے لیے جگہ دی۔ وہ اندر آ گئے اور بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے صنوبر کا ہاتھ پکڑا ''اف خدایا تمہیں تو کافی ٹمپریچر ہے۔''

صنوبر نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اشعر بھائی آپ جائیے پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''ضد نہ کرو میری باتوں پر ٹھنڈے دل اور عقل سے ایک بار روشنی ڈال کر تو دیکھو تم بہت ہی بھولی اور معصوم ہو۔ یہ معاشرہ...... یہ لوگ...... مشکوک ہیں ایک چہرے پر کئی چہرے ہیں...... ہر ہاتھ بڑھانے والا دوست اور سچا رفیق نہیں ہو سکتا ...... اس معاشرے کے لوگ تمہیں جینے نہیں دیں گے ڈارلنگ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''پلیز اشعر بھائی دنیا کو چھوڑیں...... اب اس وقت آپ مجھے جینے نہیں دے رہے ہیں۔''

''ارے پگلی...... ڈیئر تمہیں میری باتیں اس وقت بری لگ رہی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ جب تم رات کو سونے سے پہلے خلوص دل سے میری باتوں پر غور کرو گی نا تو تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ میں ثریا کی حق تلفی نہیں کروں گا دونوں کو برابر کے حقوق دوں گا تم کسی اجنبی سے شادی کرو گی تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ شریف اور پرخلوص ہو گا۔'' انہوں نے رک کر اس کی طرف دیکھا جواب انہیں غصیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں چلتا ہوں تم تنہائی میں میرے پروپوزل پر فیصلہ کرنا ماضی حال اور مستقبل تینوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا اب چلتا ہوں اپنا بہت سارا خیال رکھنا اور یہ لو میڈیسن لے لینا۔''

''یہ آپ کب لائے؟'' صنوبر نے حیرت سے پوچھا۔ ''میرب کو وین میں بٹھا کر میڈیکل اسٹور سے لایا ہوں۔'' اشعر نے میڈیسن اس کی طرف بڑھا دی اور فلیٹ سے باہر نکل گئے۔

اشعر کے جانے کے بعد جاڑا کچھ کم ہوا تو صنوبر نے اٹھ کر چائے بنائی توس بڑی مشکل سے دو پیس کھائے اور اشعر کی لائی ہوئی میڈیسن لے کر لیٹ گئی۔ وہ اشعر کی باتوں پر غور کرنے لگی تو اسے لگا کہ جیسے اشعر ٹھیک کہہ رہے کیونکہ پچھلے ہفتے تین مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں اسے پروپوزل دیا تھا۔

''ارے یار...... تم جوان ہو خوبصورت ہو برسر روزگار ہو، اس معاشرے میں ایک جوان خوبصورت اور تنہا عورت کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے، یار تو شادی کر لے کوئی اچھا سا بندہ دیکھ کر۔'' نائلہ اس کی کولیگ نے اسے مشورہ دیا۔ ''میری نظر میں

ایک پرپوزل ہے کزن ہے جس کی بیوی مر چکی ہے پانچ بچے ہیں کپڑے کی مل میں ملازم ہے...... سوچ کر جواب دو......" وہ نائلہ کی اس بات پر اداس ہوگئی تھی کہ کیا اب مجھے ایسے ہی لوگ ملیں گے۔ دوسرے ہی دن روبی نے بتایا باجی میرے اسکول کے بابا ہیں وہ کہہ رہے تھے تم صنوبر سے بات کر کے تو دیکھو یعنی ان بوڑھے بابا نے، باپ کی عمر کے ہونے کے باوجود اسے پیغام دیا...... پڑوسن کی یہ بات سن کر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ مسز جبار سامنے والے فلیٹ کی خاتون نے اسے آفس سے آتا دیکھ کر ایک پیغام دیا کہ مسز جبار کے ماموں ہیں فوج میں تھے ایک پاؤں سے معذور ہوگئے ان کی بیوی نے خلع لے لی اگر تم کہو تو میں ماموں سے بات کروں؟ انہوں نے سوالیہ نظروں سے صنوبر کو ٹٹولا تو وہ کچھ نہ کہہ سکی اور ایک آہ بھر کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

ہاں اب مجھے ایسے ہی پرپوزل ملیں گے کیونکہ میں نے بیوگی کی سند لے لی ہے۔ وہ دیر تک خیالوں کے تانے بانے میں الجھی رہی ہونہہ اب میری یہی اوقات ہے...... مگر یہ بھی نہیں کہ میں اپنی اس دوست کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالوں نہیں بالکل نہیں۔ دنیا میں دوستوں کا خلوص و محبت کا احسان کا ہمدردی کا اپنوں کا مان ٹوٹ جائے گا، بھرم کھل جائے گا اعتماد اور بھروسہ چور چور ہوجائے گا۔ نہیں میں اتنی عزیز ترین دوست کے سہاگ کو اپنا سہاگ نہیں بنا سکتی۔

اب حالات وقت اور لوگوں کے کمنٹس پر غور کرنا ہے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا ہے۔ اب تو مخالفین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اب انا کے خول سے باہر آنا ہے ان سوچوں میں الجھی رہی۔

اس کی محویت جب ٹوٹی جب مسز فراز نے آ کر اسے سوچوں کی دنیا سے باہر نکالا علیک سلیک کے بعد انہوں نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔ وہ سماجی کارکن بھی تھیں۔ انہوں نے بڑے شفیق انداز میں اسے شادی کا مشورہ دیا تب نجانے اسے کیا ہوا اس نے فوراً مسز فراز پر بھروسہ کر لیا اور اسے جو کچھ مناسب لگا وہ بتا کر ان سے مشورہ لیا کہ میں اب کیا کروں؟ کیا قدم اٹھاؤں؟ مسز فراز نے کچھ دیر بعد ہی کہا بیٹی میں تمہارے ماضی سے ناواقف ہوں لیکن دیکھ رہی ہوں کہ لوگوں کی رائے تمہارے بارے میں کیا ہے؟ چند لوگ تمہارے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ چند ایک ہیں جو میری اور تمہاری حمایت میں ہیں، زیادہ تعداد مخالفین کی ہے۔ میں نے حالات پر نظر رکھی ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم رات رات بھر جاگتی رہتی ہو بے چین و بیقرار نہ سوتی نہ ہو نہ بیٹھتی ہو کبھی ٹیرس میں کبھی کمرے میں کبھی کھڑکی کے پاس ٹہلتی نظر آتی ہو کیونکہ میں بھی تقریباً ساری رات جاگتی ہوں میں تو اپنے کام کی وجہ سے جاگتی ہوں مگر تم...... وہ رکیں تو صنوبر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ بیٹا جی تمہاری اس بے چینی و بیقراری و لوگ غلط نام سے منسوب کرتے ہیں ان لوگوں کا خیال ہے کہ تمہیں کسی کا انتظار رہتا ہے اب تم ہی بتاؤ تم کس کس کی زبان روکو گی مارتے کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے یہ تو تم بھی جانتی ہو۔ مجھے تمہاری آج کی ملاقات بہت اچھی لگی مجھے اب تم سے اپنی بیٹیوں جیسی محبت محسوس ہو رہی ہے تم میری یسریٰ کی طرح ہو وہ بہت دور ہے مگر تم میرے قریب ہو آج سے تم میری بیٹی ہو اب میں اور تمہارے انکل فراز بھی تمہاری اس پریشانی کو دور کریں گے تمہارے اس گھمبیر مسئلے کو حل کریں گے تم بلا جھجک فراز سے بھی مل سکتی ہو وہ بھی میری طرح مظلوموں کی مدد کرتے ہیں اور ظالم کو اس کے انجام تک پہنچاتے ہیں آج سے یہ پریشانی یہ مسائل تمہارے ہی نہیں بلکہ ہمارے بھی ہیں۔

ثریا بڑی اذیتوں اور پریشانیوں کے بعد جب اس مرحلے سے گزری تو اللہ نے اسے ایک

گول مٹول خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ صنوبر ثریا کے گھر آنے کے بعد تقریباً روز اس سے ملاقات کرتی مگر اشعر کی غیر موجودگی میں جاتی اب وہ کم سے کم اشعر کا سامنا کر رہی تھی۔ مسز فراز اتنی دیر اس کو سمجھاتی رہیں۔ بات کرتی رہیں مگر اس نے اشعر کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں دیا۔

صنوبر سوچ رہی تھی کہ کتنی رکاوٹوں مخالفتوں اور جدوجہد کے بعد ایک کو پایا...... تو اس نے اس آشیانے سے نکال باہر کیا اپنی زندگی سے نکالا دور دور بھٹکنے کے لیے اس آشیانے کی بناوٹ اور سجاوٹ کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا...... اور وہ سب اب کچھ لمحوں میں بچھڑ گیا...... بکھر گیا...... ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔

اب اس آشیانے کی بنیاد رکھی جسے اپنا سمجھا وہ بھی اجنبی اجنبی لگ رہا ہے، یہ حالات اور یہ باتیں یہ لوگوں کے ریمارکس ...... ایسے پروپوزل ...... الجھن ہوئی...... متزلزل ہوتی دوستی سب کچھ تنکے کی طرح لرز رہا ہے۔ باد مخالف کی زد میں ہے...... ادھوری ...... سی اداس زندگی یہ خوفزدہ لمحات یہ وسوسوں کی سولی پر چڑھی حیات۔ یہ سلگتا جیون...... آخر...... یہ سب کیا ہے۔ اے رب میں بے شک بہت گناہ گار ہوں لیکن ہوں تو تیری بندی، تیری ادنیٰ بندی مجھ پر رحم فرما میری مدد کر مجھے صراط مستقیم پر چلا میرے لیے سہل اور مسرور زندگی نصیب کر...... مجھے معاف فرما میرے گناہ بخش دے میں تیرے دربار میں سربسجود ہو کر اپنے لیے شیطان سے پناہ چاہتی ہوں، وسوسوں سے چھٹکارا مانگتی ہوں اپنی زندگی میں آسانیاں مانگتی ہوں میرے پروردگار مجھ گنہ گار کی دعائیں التجائیں قبول فرما...... تو غفور الرحیم ہے۔ مسبب الاسباب ہے میرے لیے سہل اسباب پیدا کر میری منزل آسان فرما۔

ثریا خاصی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ آج جب وہ میرب کو پڑھانے بیٹھی تو اس نے ایک خوبصورت ڈائری اس کے پرس میں دیکھی''...... ارے یہ کس کی ہے؟'' وہ خود کلامی میں بولی تو میرب نے کہا مما میں آنٹی کی کتاب لایا تھا۔ ''کب؟......''

''جب آپ منے کو لانے ہاسپٹل گئی تھیں۔''

ننھے بچے کے اس انکشاف نے ثریا کو ڈائری پڑھنے پر اکسایا۔ ایک ...... دو...... تین کئی صفحات پڑھنے کے بعد اس تحریر پر پہنچی جو اشعر کے بارے میں تھی، ثریا نے صنوبر کے خیالات بھی پڑھے۔ اس کی ملاقات کے پہلے روز اس کے ہاسپٹل تک جانے کے بارے میں سب کچھ لکھا تھا۔

ثریا ڈائری پڑھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔ نہ اس نے کچھ سوچا نہ صنوبر کی تحریر، اس کی مخالفت کے بارے میں سوچا۔ فون اٹھایا اور دل کھول کر اس کی بے عزتی کر دی...... صنوبر درمیان میں ٹوکتی رہی...... بولتی رہی...... مگر اس نے ایک نہ سنی اور خوب دل کی بھڑاس نکالی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔ صنوبر چند لمحوں تک اسی حالت میں بیٹھی رہی تب اسے خیال آیا کہ کتنے دنوں سے ڈائری نہیں لکھی ...... اب کیا لکھتی روز کے وہی گھسے پٹے سے صبح و شام گزر رہے تھے جو اسے خاص لگ رہا تھا ان دنوں وہی تحریر کر رہی تھی۔ آج تو اس کے لیے بہت زیادہ خاص ہوا تھا۔ جب تحریر کرنے کے لیے ڈائری ڈھونڈنے لگی تو ناکامی ہوئی وہ سمجھ گئی کہ ثریا نے اس کی ڈائری ہی پڑھی ہوگی ورنہ تو کبھی ایسا فون نہیں آتا۔ میری ڈائری نہیں مل رہی ہے اب تو اسے پکا یقین ہو گیا ...... یہ ہی ہوا ہے ...... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے ڈائری وہاں کیسے پہنچی؟ وہ دیر تک سوچنے پر اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ اشعر کا کام نہیں یہ ضرور میرب نے بستے میں رکھ لی ہوگی ثریا شاید تمہاری جگہ میں ہوتی تو مجھے بھی ایسے ہی غصہ آتا تم نے جو کچھ کہا ٹھیک ہی کیا لیکن میری باتیں میری سوچ میرے ارادے بھی تو پڑھے ہوں گے۔ چلو جو ہوا ٹھیک ہی ہوا کسی بھی

طریقے سے ہوا میں نے جگہ جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ میں اپنی عزیز ترین دوست کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی میں اس کو دکھ نہیں دینا چاہتی میں اس کی پرسکون زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی، ثریا کاش تم جذبات سے نہیں عقل سے کام لیتیں تو مجھ پر اتنی ناراض نہیں ہوتیں۔ اسے تو اشعر کو لعنت ملامت کرنا چاہیے تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اس سے بے وفائی کا سوچا اس کا مان توڑا میں اتنی قصوروار ضرور ہوں کہ بہت پہلے مجھے ثریا کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا مجھے یہی ڈر تھا کہ یہ ہی ایک اس کے رفیق، محسن اور غمخوار تھے یہ بھی روٹھ گئے تو وہ کیا کرے گی؟ میں ان بچوں سے بھی کتنی جذباتی ہو جاتی ہوں مجھے کتنا پیار ہو گیا تھا ان سب سے اشعر کو سچ مچ اپنا بھائی سمجھنے لگی تھی مگر اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

صنوبر سوچنے لگی کہ میں نے مسز فراز سے مشورہ مانگا تو وہ مسکرانے لگیں۔ پریشانیوں الجھنوں اور مسائل کا حل پوچھا تو اس میں مسکرانے کی کیا ضرورت تھی، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے اتنی پر خلوص محبت کرنے والی خاتون جو مجھے بیٹی سمجھتی ہیں بجائے مجھے حل بتانے کے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ تم اطمینان رکھو سارے مسائل بہت جلدی حل ہو جائیں گے تمہاری ہر الجھن ہر پریشانی ہر مسئلے کا جواب تمہیں خود بخود مل جائے گا۔ صبر کرو حوصلہ رکھو اللہ پر بھروسہ رکھو اسی سے مدد مانگو گڑگڑا کر دل سے یقین سے پھر دیکھنا وہ غفور الرحیم ہے وہ ستر ماؤں کی شفقت اور محبت رکھنے والا مولا کریم کیسے تمہیں نظر انداز کر دے گا وہ تو کہتا ہے کہ تم ایک قدم میری جانب بڑھو تو میں اس سے کہیں زیادہ تمہاری طرف بڑھوں گا، تم مجھ سے مدد مانگو میں تمہاری مدد کروں گا تم ہر شے ہر آرزو ہر تمنا مجھ سے مانگو دیکھو میں کیسے تمہیں اپنی رحمت اور قدرت سے سرفراز کرتا ہوں۔ صنوبر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ مسز فراز نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور دعائیں دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں صنوبر نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگالیا میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں آپ اس کٹھن وقت میں مجھے حوصلہ دے رہی ہیں اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے۔ مسز فراز نے اس کے خلوص پر اسے گلے سے لگا لیا۔ صنوبر خاصی حد تک مطمئن ہو گئی تھی اسے مسز فراز کی باتوں سے بڑا سکون ملا تھا۔

وہ بڑے محتاط انداز میں جی رہی تھی وقت بے وقت سویرے جاگنا رات کو دیر گئے تک سونا گھر کے سارے کام نمٹا کر عشاء کی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت کر کے بستر پر لیٹتی زیادہ تر ماضی کے جنگل میں بھٹکتی اور صبح فجر میں جاگتی۔ اکثر تہجد بھی ادا کرتی یوں الجھنیں اور کم ہو گئے زندگی کے اور قدم موت کی جانب بڑھتے گئے جیسے جیسے ایک ایک دن زندگی کا کم ہوتا ہے ویسے ویسے انسان موت کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

آج کل مسز فراز بہت ہی مصروف تھیں الیکشن ہونے والے تھے اس لیے ان کی مصروفیت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

کافی عرصے بعد آج چھٹی والے دن وہ دیر تک سوتی رہی جب بیدار ہوئی تو اس نے سب سے پہلے مسز فراز کو فون کیا۔ آنٹی جی آپ کیسی ہیں مصروفیت ابھی کم ہوئی یا نہیں گھر میں سب کیسے ہیں؟ مسز فراز نے تفصیل بتائی کہ فراز بھی آج کل بہت مصروف ہیں۔ ارباب ایگزام کی تیاری میں لگا ہے۔ یہ تمہارا بھائی ایگزام کو ہوا سمجھتا ہے ...... تمہاری بہن خیریت سے ہے کل ہی اس کا فون آیا تھا وہ اگلے ماہ پاکستان آنے والی ہے صنوبر نے خوشی کا اظہار کیا یسری سے ملاقات ہو جائے گی اس نے مسز فراز سے کہا اگر آج آپ رات کو فارغ ہیں تو ہم سب کھانا ساتھ کھائیں گے۔ آپ آ سکتی ہیں؟

چند لمحوں بعد مسز فراز نے ہامی بھر لی۔ او کے ہم آجائیں گے۔

دعوت بڑی پر تکلف تھی مسز فراز فراز صاحب ارباب کے ساتھ ایک اور بڑا اسمارٹ اور ہینڈسم نوجوان بھی تھا۔ آخر میں مسز فراز نے اس نوجوان کا تعارف کرایا صنوبر یہ میرا چھوٹا بھائی ارقم ہے پرکشش جاب اور تعلیم ہے۔ امریکہ میں رہتا ہے آج کل پاکستان آیا ہوا ہے ایک ماہ بعد واپس چلا جائے گا۔

صنوبر نے مسکرا کر سلام کیا۔ ارقم نے بھی مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

کچھ دیر تک سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر صنوبر نے ڈرائنگ روم میں آنے کی دعوت دی۔ سب نے کھانے کی بہت تعریف کی فراز صاحب نے تو یہ تک کہہ دیا کہ بیٹی میں ساری ڈشز میں سے گھر پر کل کے لیے لے جاؤں گا۔

''ارے...... یہ اچھی بات ہے کہ کھائیں بھی اور لے بھی جائیں۔'' مسز فراز ہنس پڑیں۔

''جی جی انکل میں سب پیک کردیتی ہوں۔'' سب نے باری باری اسے سراہا لیکن ارقم سنجیدہ بیٹھے تھے۔ مسز فراز مسکرائیں تم کیوں کسرنفسی سے کام لے رہے ہو بھئی تمہیں بھی بولنے کا حق ہے بالکل آزادی ہے کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ارقم ہنس پڑے آپا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس چیز کی تعریف کروں ہر چیز نمبرون ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہم سب کی طرف سے صنوبر صاحبہ کو انعام ملنا چاہیے خالی تعریف سے مزہ نہیں آرہا۔ اچھا تو آپ انعام دینا چاہتے ہیں میرا خیال ہے...... اب آپ اپنا خیال رہنے دیں یہ ہماری طرف سے۔ فراز صاحب نے جیب سے ایک خوبصورت سی ڈبیہ نکالی......اور بیگم کی طرف بڑھادی۔ مسز فراز نے مسکرا کر میاں کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتہ نہیں اتنی دیر میں بہن بھائی میں نجانے کیا بات ہوئی صنوبر جیسے ہی برتن سمیٹ کر کچن میں گئی مسز فراز بھی اس کے پیچھے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

صنوبر میں نے تمہارے تمام مسائل اور پریشانیوں اور الجھنوں کا حل ڈھونڈ لیا ہے اب تمہاری مرضی کا انتظار ہے میرا بھائی ارقم تمہیں کیسا لگا؟ اس کے بارے میں تفصیل تو بتا چکی ہوں۔ مسز فراز نے جواب طلب نظروں سے صنوبر کی طرف دیکھا۔ آنٹی جی میں ایک بار ارقم سے ملنا چاہتی ہوں۔

او کے...... بالکل حرج نہیں ہے میں ایسا کرتی ہوں کل اسے تمہارے یہاں بھیج دوں گی تم اچھی طرح مطمئن ہو جاؤ پھر بات آگے بڑھائیں گے۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ صنوبر نے چائے کا اہتمام بھی بہت اچھے طریقے سے کیا تھا۔ چائے کے بعد ڈرائی فروٹ لا کر اس ٹیبل پر رکھا تو ارباب بولا باجی...... گنجائش تو بالکل بھی نہیں ہے ایسا کرتے ہیں یہ آپ مجھے پیک کردیں۔ اس نے فراز صاحب کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے اپنا عندیہ پیش کیا۔ ارے واہ بھئی تم باپ بیٹے تو بڑے ندیدے نکلے۔ مسز فراز بولیں اس پر سب ہنسنے لگے صنوبر نے جھٹ کچھ ڈرائی فروٹ کو پیک کر کے ارباب کی طرف بڑھادیا۔ اس نے تھینک یو کہتے ہوئے لے لیا اس طرح کچھ دیر وہ لوگ باتیں کرتے رہے پھر گھر لوٹ آئے۔

آتے ہوئے مسز فراز نے صنوبر کو بھی دوسرے دن کھانے پر بلالیا تھا۔ صنوبر آج آفس سے جلدی آگئی تھی۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر لیٹی تھی کہ ارقم پہنچ گئے۔ صنوبر نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے پھر ارقم نے بات کا آغاز کیا صنوبر آپ نے مجھ سے ملنا چاہا میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں وہ مسکرائے، جی ارقم...... دراصل میں نہیں چاہتی کہ ماضی کی کوئی بات بھی آپ سے چھپی

رہے میں اپنے ماضی کی ہر بات سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ صنوبر اتنا کہہ کر چند لمحوں کے لیے چپ ہوگئی۔ میں بیوہ نہیں طلاق یافتہ ہوں۔ میں اس وقت بالکل تنہا ہوں جاب کرتی ہوں۔ اور......

سوری میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ مجھے آپا نے من وعن آپ کی کہانی سنادی ہے میں آپ کی باتوں کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے نہ مجھے کسی ثبوت کی ضرورت ہے نہ کسی صفائی کی آپ کی ضامن میری آپا ہیں۔ فراز بھائی اور یسریٰ ہیں جس کے ضامن میرے اپنے ہیں مجھے مزید ان کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے نہ معلوم کرنا ہے آپ پہلی ہی نظر میں یہاں سے یہاں پہنچ گئیں۔ ارقم نے پہلے آنکھوں اور پھر دل کی طرف اشارہ کیا۔ صنوبر کے چہرے پر حیا کی قوس قزح پھیل گئی۔ اس نے سر جھکالیا تب ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ اس کے ہاتھوں پر گرے...... تب ہی ارقم اٹھ کر اس کے قریب آگئے پلیز صنوبر کیا ہوا......؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی وہ پریشان ہوگئے صنوبر نے نظریں اٹھا کر ارقم کی طرف دیکھا...... ارے نہیں آپ نے ایسا کچھ نہیں کہا...... یہ خوشی کے آنسو ہیں، میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ رب کریم نے میرے دامن حیات میں کتنی پیاری پیاری ہستیاں ڈال دیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس مالک کا شکریہ ادا کر رہی تھی تب ہی ارقم نے اس کے ٹھنڈے نازک سے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر کہا جناب...... ان ہاتھوں کو موت ہی چھڑا سکتی ہے۔ صنوبر نے ارقم کے کندھے پر سر رکھ دیا...... اس کے سارے وجود میں ایک طمانیت ایک سرور ایک نشہ سا چھا گیا۔ کتنے عرصے بعد اسے ایک ایسا کندھا نظر آیا جہاں وہ طمانیت سے اپنا سر رکھ سکے۔ ☆☆

کسک

تزئین راز زیدی

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
ہر ایک رشتے سے افضل، پیارا رشتہ ہے
اگرچہ کوئی تعلق یا تار رشتوں کا
ہمارے بیچ بظاہر نظر نہیں آتا
جدا جدا ہیں منازل، الگ الگ راستے
کوئی بھی چیز کہیں مشترک نہیں ملتی
سوائے ایک کسک کے، جو دل میں ہے باقی
یہی کسک ہی تو سو دوزیاں بتاتی ہے
یہی کسک ہے جو سب دوریاں مٹاتی ہے
یہی کسک ہے جو اپنائیت بڑھاتی ہے
اسی کسک کے سبب سے ہمارا رشتہ ہے
اک ایسا رشتہ جو لفظوں میں ڈھل نہیں سکتا
وہ ناتا جس کا کوئی بھی بدل نہیں ہوتا

☆

'سچی کہانیاں' میں ایک نہایت ہی مقبول' کامیاب

ترین سلسلے وار ناول **'تاشون'** کے بعد

معروف و مقبول کہانی کار شازلی سعید مغل' ایک نیا

تہلکہ خیز سلسلے وار ناول لے کر آرہی ہیں۔

'املتاس' سحر و اسرار کا ایک ایسا انوکھا

سلسلہ' جو آپ نے آج تک پڑھا نہیں ہوگا۔ یہ

ہمارا صرف ایک دعویٰ ہی نہیں یقین بھی ہے......!

بس ذرا انتظار کیجیے

'سچی کہانیاں' کے پُراسرار نمبر' شمارہ اکتوبر

2017ء سے **'املتاس'** کا آغاز ہوگا......!

مکمل ناول

حبیبہ عمیر

تیرِ نیم کش

آخری قسط

"بابا ہر انسان زندگی میں کوئی نا کوئی غلطی کرتا ہے نا......اور اگر اس وقت جس وقت اس نے وہ کام کیا ہو......وہ قدم ٹھیک لگے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ قدم غلط تھا اور وہ اس کی زندگی کی بھول بن جائے تو کیا پھر بھی وہ انسان سزا کا حق دار ہوتا ہے۔"

"اللہ ظہر ہوگئی ہے گیارہ بجے سے نکلے ہیں یہ شاپنگ پر کب آئیں گی یہ لڑکیاں مجھے گھر بھی جانا ہے......" ثمرین کی نظر اچانک گھڑی پر پڑی تو بول اٹھی۔

"آجائیں گی......بچیاں تم پریشان نہ ہو۔" عالیہ نے کہا۔

"رمضو بابا......بابا اٹھ گئے کیا؟" سنبل کی نظر بابا کے کمرے سے نکلتے رمضو پر پڑی تو پوچھا۔

"جی بی بی جی اٹھ گئے ہیں صاحب......" وہ کہہ کر کچن کی طرف بڑھے۔

تو وہ اٹھ گئیں اندر جانے کو جبکہ عالیہ نے کچن کا رخ کیا جانتی تھی کہ اب بھابی اوپر سے تین قدم نیچے رنجا فرما گئیں جب یہ دونوں چلی جائیں گی لہذا کھانے کا انتظام انہیں دیکھنا تھا۔

"بابا اب کیسے ہیں آپ" سنبل نے جا کر ان کا ہاتھ چوما اور پریشانی سے بولیں۔ وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔

"مجھے کیا ہونا ہے بھلا چنگا ہوں میں......" وہ ہنسے۔ اور ساتھ ہی کھانسی کا دورہ پڑا انہیں۔ ثمرین جلدی سے پانی لے کر آئی اور انہیں پانی پلایا۔

"بھئی یہ چھوٹی موٹی بیماریاں تو لگی ہی رہتی ہیں۔"

"بس جو ہوا ہے آپ بھول جائیں۔ اب اروی سیٹ ہوگئی ہے۔" ثمرین بیڈ کے دوسری طرف سے آئی اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ ایک اچھا فیصلہ کیا ہے میں نے......ورنہ میں پرویز کو کیا منہ دکھاتا کہ اس کی امانت کا خیال بھی نہیں رکھ سکا میں۔"

وہ بیڈ کے سرہانے سے سر ٹکا کر بولے اور

آنکھوں سے آنسو کا قطرہ نکلا جو بالوں میں جذب ہوگیا۔

"یقیناً آپ نے بہت ٹھیک فیصلہ کیا ہے بابا۔ آپ نے اس یتیم بچی کو ایک مضبوط سائبان مہیا کیا ہے۔ مضبوط بازوؤں میں اس کی سپردگی کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بالکل ٹھیک فیصلے لیتے ہیں۔" سنبل نے ہاتھ دبا کر انہیں یقین کا احساس دلایا اور مسکرادیں۔

"یہ تم لوگوں کا بھروسہ ہی ہے جس پر میں یقین سے پاؤں رکھ کر فیصلہ لیتا ہوں اور میرا خدا مجھے مایوس نہیں کرتا یہ میرے رب کا کرم ہے مجھ پر......" وہ عاجزی سے چھت کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس اب یہی دعا ہے کہ میرا مالک میرے اس فیصلے کو بھی صحیح کردے۔ میں دونوں کو مطمئن اور خوش وخرم دیکھنا چاہتا ہوں......" وہ بولے۔

"انشاء اللہ آپ جیسا چاہتے ہیں بالکل ویسا ہی ہوگا بابا......" ثمرین نے کندھا دبایا۔

"اور بس آپ اپنا خیال رکھیں بابا...... آپ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں یقین مانیں......" سنبل کی آواز بھر آئی۔

"رکھوں گا بالکل رکھوں گا اپنی شہزادیوں کے لیے اپنا خیال رکھوں گا......" وہ دونوں کو پیار کرکے بولے۔

☆......☆......☆

"اللہ آج تو مزا ہی آگیا شاپنگ کا۔" شانزے فخر سے ہاتھ میں تھامے بیگ دیکھ کر بولی۔

"ہاں اور تم لوگوں نے میرے میاں کی جیب کتنی ڈھیلی کرائی ہے اس کا اندازہ ہے کچھ؟" سحرش مصنوعی خفگی سے بولی۔

"واہ باجی جیسے ساری شاپنگ ہم نے ہی کی ہے اور تم نے جو کیا ہے وہ کیا......" مہوش نے اپنی عینک درست کی...... "ہاں جی بالکل ٹھیک کہا ہے مہوش باجی نے۔" عیشاء نے بھی حصہ لیا۔ تو وہ کھسیانی ہنسی ہنس دی۔ "بھئی پیسے لگوادیے ہیں مگر کوئی اب پانی بھی پوچھ لو اتنا تو میں پورا دن آفس میں نہیں تھکتا جتنا تم لوگوں نے تھکا دیا ہے......" شہریار صوفے پر ڈھے گیا۔

جبکہ خواتین نے ایک فخریہ نگاہ اپنی شاپنگ پر ڈالی "لاتی ہوں۔" سحرش نے ہنستے ہوئے اٹھی۔

"ارے چچی آپ اکیلی کچن میں؟ رکیں میں آتی ہوں اپنے میاں صاحب کو پانی دے کر۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں بیٹا ضرور...... جلدی آؤ مجھے واقعی ایک مددگار کی اشد ضرورت ہے۔" وہ مصروف سی بولیں۔

"جی بس آئی......" کہہ کر وہ کچن سے نکلی۔

☆......☆......☆

اسے یہاں آئے تین ہفتے ہوگئے تھے۔ وہ یہاں سے مانوس سی ہونے لگی تھی۔ یہاں کے در ودیوار اسے اپنائیت کا احساس دلاتے تھے۔ حیان بہت کم گو تھا۔ اس کی موجودگی سے گھر میں زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ شانی اور اس کی بے بے سے ہی سارا وقت باتیں کرتی رہتی تھی۔ آج چھٹی تھی تو اس نے سوچا کہ اسے کچھ بنانا چاہیے۔ پاکستانی کھانے تو اسے آتے ہی نہیں تھے بنانے اور دوسرے بھی کم ہی آتے تھے مگر وہ بیکنگ بہت عمدہ انداز میں کرتی تھی۔ لہٰذا اس نے کیک بنانے کا سوچا اور کچن میں چلی آئی۔

"بے بے آپ مجھے میدہ وغیرہ دیدیں......" اس نے سامان نکالتے ہوئے کہا۔

"بی بی! کیا بناوے ہو؟" بے بے ساتھ ساتھ ہاتھ چلا رہی تھیں اور ساتھ میں اروی سے بھی مخاطب تھیں۔

"بے بے بیکار رہ کر بور ہوگئی ہوں تو سوچا کہ چلو کچھ بنا ہی لوں۔" اس لیے کیک بنانے آئی ہوں۔

''اچھا تمہیں آوے ہے بنانا یہ بیکری کا سامان......'' بے بے متاثر کن لہجے میں بولیں۔

''ارے سارا کہاں بے بے بس یونہی۔'' وہ ہنس دی بے بے کی حیرانی پر۔

''شانی کدھر ہے؟''

وہ صاحب کی گاڑی صاف کرے ہے۔''

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔'' وہ چیزوں کی طرف متوجہ ہوئی اور بنانے لگی۔

حیان دیر سے سو کر اٹھا، فریش ہو کر باہر آیا......اور ٹی وی لگا کر سرچنگ کرنے لگا......''چلو اب دوپہر کا کھانا ہی کھاؤں گا ناشتے کا وقت تو نکل گیا ہے۔'' وہ گھڑی دیکھ کر بولا جو دو بجا رہی تھی۔

سرچنگ کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔

اروی بھی کیک بیک ہونے کے لیے رکھ کر باہر آئی۔

''گڈ مارننگ مسٹر فاروقی۔'' وہ ہاتھ اپنے اسکارف سے خشک کرتی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔......جبکہ دوسری طرف جواب ندارد تھا۔ اروی نے ٹی وی پر دیکھا تو کوئی ماڈلنگ شو تھا جس میں ایک شوسٹاپر بہت ہی عجیب لہروں والے کپڑے پہنے واک کر رہی تھی۔ پیچھے کمر پر کپڑا نامی کوئی چیز نہیں تھی اور آگے ٹانگیں بھی پتلی پتلی اور چمکدار لگ رہی تھیں

......''یہ کیا دیکھ رہے ہیں؟'' وہ حیرانی سے حیان کی طرف دیکھ کر بولی۔

حیان کے چہرے پر ایک عجیب درد تھا...... کتنا کرب تھا اس کی آنکھوں میں۔ غصہ تھا اس کی سانسوں میں۔ اس نے ریموٹ کو غصے سے پٹخا اور اٹھ کر چلا گیا۔

''انہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ دوبارہ متوجہ ہوئی اس فیشن شو کی طرف......وہاں اناؤنسر بول رہی تھی:

Ladies & gentle men put your hands togather for our model shizza khan...

تالیوں کی گونج میں پھر وہی ماڈل ریمپ پر آئی اور ہاتھ ہلانے لگی۔

''اوہ...... یہ تو شزا ہے......اروی نے غور سے دیکھا......اروی کو جھٹکا سا لگا یہ جان کر کہ وہ اس کی بیوی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین لڑکی تھی اور میک اپ نے اسے اور بھی جلا بخشی تھی۔

اروی نے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا اور کچن میں دوبارہ چلی آئی۔

''بی بی صاحب کا ناشتہ......'' بے بے ڑے لگا رہی تھیں۔

''بے بے رہنے دیں وہ تو چلے گئے ہیں۔'' اروی افسوس سے بولی۔

''اچھا!!'' وہ اپنی محنت پر افسوس کر رہی تھیں کہ اتنی محنت سے انہوں نے آج قیمے کے پراٹھے بنائے تھے میاں جی کے لیے کیونکہ چھٹی والے دن وہ ہیوی ناشتہ کرتا تھا ساتھ میں چٹنی بھی خاص بنائی تھی مگر وہ کھائے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

آج کتنے عرصے بعد اس نے شزا کو دیکھا تھا......آج اس کے زخم ایک بار پھر تازہ ہو گئے تھے۔ وہ ہرجائی آرام سے آگے بڑھ گئی تھی اسے جو چاہیے تھا وہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ آج بھی اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ حیان فاروقی کے لیے جیسے وقت تھم سا گیا تھا اس نے تو اپنی زندگی سے منہ ہی موڑ لیا تھا جبکہ دوسری طرف وہ اپنی زندگی کو اور رنگین بنا رہی تھی۔ حیان فاروقی کی زندگی سے سارے رنگ چھین کر......

وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا رہا اور شام ڈھلے لوٹ آیا تھا......

''مسٹر فاروقی آپ کے لیے کھانا لگاؤں
.....'' اروی نے جو سارے دن سے اس کا انتظار
کررہی تھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً بولی۔
نہ جانے کیوں اسے یقین سا تھا کہ اس نے صبح سے
کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اسی لیے تو فوراً یہ سوال کر دیا
حیان کے قدم تھم گئے ...... وہ مڑا ...... ہوں
کہہ کر وہ واپس کمرے میں چلا گیا۔ جبکہ وہ ٹیبل
لگانے میں شانی کی مدد کرنے لگی۔
کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں
آیا تو اروی بڑے شوق سے کیک اور کافی کا مگ لے
کر اس کے کمرے میں گئی......
''یہ لیں......'' وہ اشتیاق سے بولی۔
اس نے کتاب سے نظریں ہٹائیں
''یہ کیا ہے؟'' وہ کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر
بولا۔
''بھئی کافی ہے اور کیک ہے...... میں نے
خود بیک کیا ہے۔'' اس کے لہجے میں بچوں سا
اشتیاق تھا جسے پذیرائی کی ضرورت تھی۔
حیان نے اس کے صبیح چہرے کو غور سے دیکھا
...... کتنی چمک تھی اس کی کالی آنکھوں میں اور
مسکراہٹ بھی کتنی پاکیزہ تھی جیسے فجر کے بعد کی صبح
ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کیک لے لیا۔
وہ پر جوش ہو کر ادھر بیڈ پر ہی ٹک گئی اور ٹرے
پر تھوڑی جما کر پر اشتیاق نظروں سے حیان کو دیکھنے
لگی۔
اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ چونک گیا......
''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو بھئی......؟'' منہ
تک جاتا ہاتھ رک گیا۔
''بھئی جلدی کھا کر بتائیں کہ کیسا بنا ہے؟
میں نے سارا دن ویٹ کیا ہے آپ کا کہ آپ
بتائیں گے......'' وہ الجھ پڑی۔
حیان نے گہری نظروں سے اس کے بچپنے کو
دیکھا اور مسکرا دیا۔
''اگر اچھا نہ ہوا تو بھی بتا دوں نا؟'' اس کی
آنکھوں میں شرارت ابھری۔
''جی نہیں مجھے یقین ہے آپ کو ضرور پسند
آئے گا...... مسٹر فاروقی'' وہ دعوے سے گردن اکڑا
کر بولی۔
''ہوں دیکھتے ہیں......'' وہ سر ہلا کر چیلنج کرتا
ہوا بولا۔
''جی بالکل......'' وہ دعویٰ کر کے بولی جیسے
مکمل اعتماد و یقین ہو اپنی محنت پر۔
حیان نے کیک کھایا اور چند سیکنڈ تک اس کی
شکل دیکھتا رہا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے گھور رہی تھی۔
حیان نے ایک اور نوالہ لیا اور آرام سے
کھانے لگا...... آہستہ آہستہ اس نے پورا پیس ختم
کر لیا۔
''بولیں کیسا لگا آپ کو؟'' وہ پھر پوچھ بیٹھی
اس سے رہا ہی نہیں گیا۔
''ٹھیک ہی تھا......'' وہ ادھر ادھر نظریں گھما
کر بولا...... ارادہ اسے تنگ کرنا تھا۔
''واقعی اچھا نہیں بنا......؟'' ایک دم اس کا
منہ لٹک گیا۔ ''میں نے ٹیسٹ ہی نہیں کیا تھا۔'' وہ
افسوس کر کے بولی۔
حیان کو اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔
''مسٹر فاروقی میرا مذاق نہ اڑائیں او کے''
وہ چڑ گئی اور منہ پھلا لیا۔
یہ جانے بغیر کہ وہ پہلی بار اسے ہنستا ہوا دیکھ
رہی ہے۔
اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر آواز اور بلند
ہو گئی......
''بالکل گول گپی لگ رہی ہو۔'' وہ اس کے
چہرے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
اروی نے نظریں گھما کر اسے دیکھا تو دیکھتی

رہ گئی۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یوں مسکراتے ہوئے ...... آج، آج شاید پہلی بار ...... ہاں ہاں بالکل پہلی بار ہی تو دیکھا ہے انہیں یوں وہ بھی غیر ارادی طور پر مسکرانے لگی......

''بالکل بچی ہو تم ارویشہ......'' وہ سنبھل کر بولا ''اور آپ کتنے اچھے لگتے ہیں مسکراتے، ہنستے ہوئے مسٹر فاروقی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''ہاں بہت عرصے بعد مسکرایا ہوں میں ارویشہ...... تھینک یو!''

وہ بولا تو آواز میں کتنی حسرت تھی۔ میں تو شاید بھول ہی گیا ہوں مسکرانا۔ اس کے لہجے کو محسوس کر کے وہ فوراً بولی۔

''واقعی کیک اچھا نہیں تھا مسٹر فاروقی؟'' وہ اس کا ذہن بھٹکنے نہیں دینا چاہتی تھی لہٰذا موضوع بدل دیا۔

''ارے نہیں، نہیں ...... میں کھنچائی کر رہا تھا تمہاری ...... کیک اچھا تھا بلکہ بہت اچھا تھا اسی لیے تو سارا کھالیا ...... بہت زبردست بیکنگ کر لیتی ہو تم......''

''تعریف کے لیے شکریہ!'' وہ آداب بجالائی ...... ''مجھے خوشی ہے آپ کو پسند آیا۔ اب آپ آرام کریں ...... میں بھی چلتی ہوں۔'' وہ اٹھی۔

''ہوں!'' وہ کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

وہ دروازے پر جا کر پلٹی۔ ''تھینک یو مسٹر فاروقی! ...... کہ آپ آج ہنسے ......'' وہ کہہ کر چلی گئی۔

وہ مسکرا دیا۔ واقعی میں تو بھول ہی تو گیا ہوں ہنسنا، مسکرانا۔

سوچیں پھر سے منتشر ہونے لگیں۔ سوچ کے بے لگام گھوڑے ایک بار پھر یادوں کی وادی میں جانے کو بیتاب لگ رہے تھے۔

''شہزا یار کبھی تو اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کچھ کھلا دو'' حیان کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

''ہیں ......؟ تمہیں کیا سوجی یوں ایک دم......'' وہ حیران سی مڑی۔

وہ آج کمرے میں بیٹھے اپنے البم کو سیٹ کر رہے تھے۔

''ہائے حیان دیکھو کتنی زبردست Pic ہے میری یہ والی کتنا پرفیکٹ پوز آیا ہے ناں......'' وہ اشتیاق سے تصویر آگے کر کے بولی۔

''ہوں! ......'' وہ بے دلی سے دیکھے بغیر ہی بولا۔

''ہماری شادی کو دو ماہ ہو گئے ہیں اور تم نے ایک کپ چائے بھی نہیں پلائی مجھے......'' اس کی سوئی وہیں پر اٹکی تھی۔

''بھئی سیدھی بات ہے حیان کچن وچن کا کوئی کام مجھ سے نہیں ہوتا او کے اور ویسے بھی ہم ملازم رکھتے ہی کیوں ہیں کام کرانے کو ناں ...... نہ کہ خود وہ کام کرنے کو۔'' وہ دوبارہ اپنی تصویروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حیان نے اس کی شکل دیکھی۔

''میری کتنی خواہش تھی کہ تم میرے لیے کم از کم چائے یا کافی ہی بنا کر لاؤ اپنے پیارے ہاتھوں سے اور کبھی کبھی کھانا بھی ...... مجھے سی آف کرنے آیا کرو ...... میرا انتظار کیا کرو ...... میں آؤں تو پوچھو کہ سارا دن کیسا کام کیا؟ مجھے کتنا مس کیا......'' وہ حسرت سے بولا۔

''ہوں بالکل ٹیپکل بیوی چاہیے مسٹر حیان فاروقی کو۔'' وہ بدستور البم کی طرف متوجہ تھی ...... مگر بات حیان سے کر رہی تھی۔

اس میں ٹیپکل بیوی کہاں سے آ گئی......؟''

وہ بحث پر آمادہ تھا۔ ''میں کون سا تمہیں گھر کے سارے کام کرنے کو کہہ رہا ہوں بس کبھی کبھی میری خواہش پر ہی کر دیا کرو یار......''

''بھئی مجھ سے ایسے ویسے کوئی کام نہیں

ہوتے ...... میں پروفیشنل بننے کی کوشش میں ہوں اور تم مجھے گھرداری کی طرف گھسیٹ رہے ہو...... سوری! بھئی اگر یہ ہی سب کروانا تھا تو کرلیتی تھی کسی گاؤں کی لڑکی سے شادی...... تم بھی خوش اور وہ بھی خوش......'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔ اور مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ جبکہ حیان صرف اس کی شکل دیکھتا رہا جسے اس کی فیلنگز کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی

☆......☆......☆

''میری جیسی خواہش تھی ویسی شزا نہیں نکلی ......'' آہ ایک دردبھری آہ اس کے وجود سے نکلی۔

''اور یہ لڑکی ......؟؟؟'' آگے صرف سوالیہ نشان تھا جس کا اب تک حیان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اروی بیڈ سے ٹیک لگائے آج ہونے والے تمام واقعات پر غور کررہی تھی صبح ٹی وی پر شزا کو دیکھنا پھر سارا دن غائب رہنا پھر رات گئے تک واپس آنا اور آخر میں......اس کے ہاتھ کا کیک کھانا اسے تنگ کرنا اور سب سے بڑھ کر ہنسنا......اس کو سوچ کر وہ پھر مسکرادی۔

وہ مسلسل اپنی چین کو انگلی میں مروڑے غور کررہی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ اس نے اوپر والا کمرہ اپنے لیے سیٹ کرلیا تھا۔ وہ حیان کی مرضی کے بغیر اس کے روم میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس حیان کو جانتی تھی جو کم ہی کسی سے بات کرتا تھا۔ جواب صرف ہاں، ہوں میں دیتا تھا جس کے چہرے پر ہروقت ایک بیزاری سی رہتی تھی۔ جیسے تنگ آ گیا ہو جی جی کر......مگر اب وہ اس حیان کو جاننا چاہتی تھی جسے زندگی جینا آتا تھا جسے خوشیاں سمیٹنا اور بانٹنا دونوں آتا تھا۔ جو ہنستا تھا، مسکراتا تھا...... اور اسے وہ حیان واپس لانا تھا۔

اروی کے دل میں حیان نام کی کونپل کھلنے لگی تھی۔ وہ کتنے دنوں سے اس کے اطوار دیکھ رہی تھی۔ اکن اکھیوں سے اسے دیکھنا اس کا مشاہدہ کرنا اسے اچھا لگنے لگا تھا......مسٹر فاروقی میں آپ کو جیت لوں گی'' وہ ایک عزم سے بولی۔

اس نے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے چاند کو دیکھا جو شاید اپنے شباب پر لوٹ رہا تھا...... میں بھی آپ کو آپ کے شباب پر لے آؤں گی...... جیسے چاند کی فطرت ہے نا کہ آسمان کی وسعتوں میں کھوسا جاتا ہے پھر نمودار ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ پورا ہوکر آسمان پر ڈھیروں ستاروں کے اوپر اپنی چاندنی کی چادر پھیلائے حکمرانی کرتا ہے...... بالکل ویسے ہی آپ نمودار ہوگئے ہیں پہلی تاریخ کے چاند کی طرح اور میں بھی آپ کو چودھویں کا چاند بنادوں گی جب آپ اپنی آب تاب کے ساتھ پھر زندگی کے اوپر چھاجائیں گے ...... وہ مسکرادی۔

☆......☆......☆

''مسٹر فاروقی...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

اس شام وہ آفس سے جلدی لوٹ آیا تھا لہٰذا وہ لاونج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اروی اوپر سے نیچے آئی اسے دیکھا تو بولی۔

''ہوں......'' وہ اسے دیکھے بغیر ہی بولا نظریں ٹی وی پر تھیں۔

اروی کو یہ بات ذرا نہ بھائی مگر خاموش رہی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ میں دوبارہ اپنی اسٹڈیز کو شروع کرلوں۔ ویسے بھی میرے ایک دو سمسٹر ہی رہ گئے ہیں......سارا دن کرنے کو بھی کچھ نہیں ہوتا......بور ہوگئی ہوں میں۔

آپ بھی شام ڈھلے آتے ہیں اور اپنے کمرے میں مقید ہوجاتے ہیں۔ میں سارا دن بولا بولائی سی کبھی گھر کے ایک کونے اور کبھی دوسرے

کونے کا چکر کاٹتی رہتی ہوں۔''

وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس سے شکایت کر رہی تھی......اس کی بے اعتنائی کی۔

وہ چائے کا کپ میز پر رکھ کر بولا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ آپ کو یہاں آتے ہی شروع کر لینی چاہیے تھی خوامخواہ ہی آپ نے دو مہینے برباد کر دیے......''

''اوہ تو انہیں یاد ہے کہ ہمارے نکاح کو دو ماہ ہو چکے ہیں......''اروی کے لیے یہ غیر معمولی بات تھی۔

''ہوں ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے خیال ہی نہیں آیا۔''وہ منہ بنا کر بولی۔

''سارے ڈاکومنٹس ہیں ناں آپ کے پاس...... مجھے دیجیے گا پھر جا کر کہیں آپ کا ایڈمیشن کرا لیں گے......''وہ اپنی بے اعتنائی کی بات کو آرام سے گول کر کے اٹھ گیا۔

''اپنی بات کا کچھ نہیں کہا......''کہ آپ کے پاس میرے لیے تھوڑا بھی ٹائم نہیں ہے......ہونہہ......وہ اسے جاتا دیکھتی رہی......اسے غصہ آ گیا۔

☆......☆......☆

''اوہو......میرے ڈاکومنٹس تو وہیں رہ گئے ہیں......اب کیا کروں؟''وہ اپنے کمرے میں آ کر پیپرز ڈھونڈنے لگی تو یاد آیا کہ اپنے ساتھ صرف کپڑے لائی تھی۔

اس نے گھر پر فون ملایا......

''ہیلو......''عالیہ کی چچی کی مدھم سی آواز ابھری۔

''السلام علیکم! چچی جان۔''وہ خوش ہو کر بولی۔

''وعلیکم السلام! بیٹا کیسی ہو تم؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں سب کیسے ہیں......سارے گھر والے ٹھیک ہیں......؟''

وہ پر جوش تھی۔

''ہاں ہاں سب ٹھیک ہیں......حیان کیسا ہے اور تمہارا دل لگ گیا ہے وہاں پر۔؟''

''وہ ٹھیک ہیں اور دل تو نہیں لگ رہا یہاں پر......''آخری جملہ وہ دھیمے سے بولی۔

''کیا کہا بیٹا تم نے؟ سمجھ نہیں آئی۔''

''اوہ کچھ نہیں چچی جان ذرا میری شانزے سے بات کرا دیں اس کا موبائل آف مل رہا ہے۔''

وہ فوراً بولی۔

''ٹھیک ہے ہولڈ کرو۔''

''ریحان رکو......''وہ اوپر جاتے ریحان کو روک کر فون تھماتے ہوئے بولیں۔

''جاؤ یہ شانزے کو دے دو......اروی کا فون ہے۔''

''اچھا!......ہیلو اروی کیسی ہو یار تم؟ تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو لگتا ہے......اتنے دنوں بعد یاد آئی تمہیں۔''وہ شروع ہو گیا۔ بہت پر جوش تھا وہ۔

''سانس لے لو لڑکے''وہ ہنسی

''بھئی سچی مجھے تم لوگوں کی بہت یاد آتی ہے سچی......''وہ اداسی سے بولی۔

''چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں ورنہ میرا ارادہ تو تم سے دو دو ہاتھ کرنے کا تھا۔''

وہ ہنسا''کب آؤ گی یار چکر ہی لگا لو۔''

''پتہ نہیں کب آؤں گی......یہ تو مسٹر حیان پر منحصر ہے جب وہ لائیں۔''

''ہوں، اچھا یہ لو بات کر لو شانزے سے''وہ فون تھما کر چلا گیا۔

''ہائے اروی کیسی ہے یار تو......؟''وہ پر جوش تھی۔

''میں فٹ، تم سناؤ؟''وہ ہنسی اور صدر دروازے سے باہر آ کر سیکیٹھی میں ہی بیٹھ گئی اور شام اترتی دیکھنے لگی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ کھڑوس کیسا ہے؟'' وہ تنگ کرنے کو بولی۔

''کون کھڑوس؟ میں تو کسی کھڑوس کو نہیں جانتی۔'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہائے اللہ......کون کھڑوس......واہ بھئی مسز حیان فاروقی۔ بڑا گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ہے تم نے......'' وہ ہنسی۔ تو وہ بھی زور سے ہنس دی......

''اچھا شانزے مجھے تم سے کام ہے تم میرے ڈاکومنٹس سارے جو میرے روم کی الماری میں ہوں گے پلیز مجھے بھیج دو......''

''کیوں؟ ...... کہیں تمہیں تمہارے میاں واپس لندن تو نہیں روانہ کررہے ؟'' اس کا ارادہ خوب کھچائی کا تھا

''جی نہیں ...... وہ ہنسی'' میں یہاں ایڈمیشن لینے لگی ہوں نا اس کے لیے''

''ہائے تھینکس گاڈ! مجھے خوشی ہوئی یہ جان کر۔'' وہ صدق دل سے بولی۔

''چلو پھر جلدی بھجوا دینا۔ او کے۔'' وہ مسکرائی......''اور پہلے تھینکس اس کے لیے۔''

''او کے۔ اور ویلکم جی!'' وہ ہنسی۔

☆......☆......☆

وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ایڈمیشن ہوئے بھی اروئ کے چار ماہ ہونے کو آئے تھے...... اس کا بس اب آخری سمسٹر ہونے والا تھا اس کے بعد وہ بھی فارغ ہو جاتی اپنی پڑھائی سے۔ وقت ان کی مٹھی سے تیزی سے پھسل رہا تھا اور دونوں کو اس بات کا احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اپنے قیمتی شب و روز کتنی بے دردی سے ضائع کررہے ہیں۔ یہ قیمتی لمحات زندگی کے قیمتی نگینوں کی طرح ہیں جن کے اوپر وقت کی دھول جمتی جارہی ہے اور وہ اپنی چمک کھوتے جارہے ہیں۔ اروئ پہلے فارغ تھی تو مسز فاروقی کا دھیان رکھنے میں لگی رہتی تھی ان کا مشاہدہ کرنے لگی تھی مگر مصروفیت ہونے کی وجہ سے اب وہ ان کا خیال بھی نہیں رکھ پاتی تھی۔ کئی کئی دن آپس میں بات نہیں ہو پاتی تھی۔ حیان کی کام کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں اور یونیورسٹی کا ٹائم ٹیبل اروئ کو کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دینے دیتا تھا۔ حیان نام کا پودا جو اروئ کے دل میں لگا تھا اس کو پڑھائی کی مصروفیت نے پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا...... اس پودے کی سانسیں جیسے تھم گئی تھیں وہ پودا ابھی اپنے وجود کی جڑیں اروئ کے دل کی نرم مٹی میں اچھی طرح پیوست نہیں کر پایا تھا کہ مصروفیت اور پڑھائی کے طوفان نے اس کی جڑیں ہلا کر اس کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ پودا مردہ نہیں ہوا تھا مگر مرجھا ضرور گیا تھا۔ جسے خصوصی دیکھ بھال کی اشد ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

''اللہ یہ لڑکی نے کتنے میسجز کیے ہوئے ہیں اور پانچ مس کالز بھی......''

اروئ نے سیل آن کیا تو صائمہ کے ڈھیروں میسجز اور کالز تھیں۔ اس نے اسے فون کیا۔

''کہاں تھیں تم......؟ مسز فاروقی'' صائمہ کی غصے سے بھری آواز آئی۔

''کل سے اب تک تمہیں کتنے میسجز کیے کچھ پتہ ہے؟''

''سوری یار سیل آف تھا تم بتاؤ کیا کام ہے؟'' وہ شرمندہ سی بولی۔

''تمہیں کچھ یاد ہے آج میوزیکل نائٹ ہے یونی میں اور تمہیں لازماً آنا ہے...... یہ ہماری آخری نائٹ ہے، ہاں پلیز انکار نہ کرنا۔ او کے۔'' وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

''یار تمہیں پتہ ہے نا کہ مجھے پسند نہیں ہے۔'' اروئ ٹال رہی تھی۔

خبر دار جو انکار کیا سارا گروپ آرہا ہے تمہیں

بھی آنا ہے۔ ورنہ میں نہیں بولوں گی او کے۔'' وہ ناراض ہوگئی۔

''اچھا بابا آ جاؤں گی...... بس خوش!''

''ہاں ، بہت خوش'' وہ مسکرائی ...... چلو ! will wait for you......

''ہاں او کے ......'' اروی نے فون بند کر دیا اور ہنس دی؟ ''نہیں سدھرے گی یہ لڑکی''

اس نے اپنے کپڑے نکالے اور تیار ہونے لگی ...... وہ اپنی دوست کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

شام کے سائے ویسے ہی گہرے ہورہے تھے۔ شو کا ٹائم آٹھ بجے تھا اور سات بج چکے تھے۔ ''اف گاڑی تو خراب ہے۔ اسے یاد آیا...... چلو دیکھتے ہیں۔'' وہ جیسے ہی تیار ہو کر نیچے آئی تو حیان بھی کمرے سے نک سک سے نکلا۔

''اوہ مسٹر فاروقی ......'' اس نے آواز دی ''اچھا ہوا آپ مل گئے۔''

حیان کے قدم جم گئے...... اس نے پلٹ کر دیکھا۔

کالے رنگ کے کھلے سے ٹراوزر اور کالے رنگ کا اسکارف پہنے ہوئے وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ قمیص پر لال گلاب کے بڑے بڑے پھولوں کا پرنٹ تھا جو بہت ہی جاذبیت لیے ہوئے تھا۔ گھنگریالے بالوں کو کھولے میچنگ رنگ کے ایئر رنگز پہنے وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ حیان نے تفصیلی جائزہ لیا۔

''اچھا ہوا آپ مل گئے ...... میری گاڑی خراب ہوگئی ہے تو آپ مجھے چھوڑ دیں گے یونیورسٹی......''

''اس وقت......؟؟'' حیان نے گھڑی پر ٹائم دیکھا۔

''جی وہ آج میوزیکل نائٹ ہے نا تو سب نے مجھے خاص طور پر بلایا ہے...... اس لیے جا رہی ہوں۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے اپنے بالوں کو کانوں میں اڑس کر بولی۔

حیان پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سانولے سے رنگ میں بھی وہ بہت جاذبیت سموئے ہوئے تھی۔ کتنا پاکیزہ سا حسن تھا اس کا۔ کتنا معصوم سا سراپا تھا اس کا۔

''آپ نے مجھ سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا؟؟؟'' سوال بالکل غیر ارادی اور غیر متوقع تھا ...... خود حیان کو بھی سمجھ نہیں آئی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

''جی؟؟'' وہ حیران ہوئی پھر شرمندہ ہوگئی۔

''سوری! مجھے واقعی پوچھ لینا چاہیے تھا۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''ہوں! پوچھنا نہ بھی سہی مگر مجھے پہلے انفارم کرنا چاہیے تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''Sorry again!'' وہ بولی اور سر جھکا لیا۔

''اٹس او کے ...... فنکشن یونیورسٹی میں ہی ہے آپ کا کہ کسی ہوٹل میں؟''

وہ صدر دروازے کی طرف بڑھا وہ بھی پیروی کرنے لگی۔ جھکے سر کے ساتھ۔

''یونی کے ہال میں ہی ہے...... شام کو ہی میرا پروگرام بنا۔ پہلے کوئی ارادہ نہیں تھا......'' اس نے صفائی دی۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ سر نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

''ہوں۔'' اس نے دروازہ کھولا۔

''مسٹر فاروقی ایک ریکوئسٹ ہے پلیز اے ٹی ایم پر روکیے گا۔ پہلے مجھے پیسے نکالنے ہیں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ شمشیر فاروقی نے اس کے نام پر ایک اکاؤنٹ کھول دیا تھا جس میں خطیر رقم انہوں نے اروشیہ کے لیے جمع کرادی تھی تا کہ ضرورت میں اس کے کام آئے۔ وہ حیان سے نہیں مانگتی تھی بلکہ

وہی اکاؤنٹ ضرورت کے وقت استعمال کرتی تھی۔

''او کے'' حیان نے کہا اور گاڑی سڑک پر دوڑانے لگا۔

حیان اس کا انتظار کر رہا تھا وہ پیسے نکالنے گئی ہوئی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا

''بابا جانی......'' وہ مسکرایا۔

''جی بابا کی جان کیسا ہے یار!'' وہ اداس لگ رہے تھے۔ حیان کی نظریں مسلسل سڑک پر دوڑتی گاڑیوں پر تھیں وہ وقتاً فوقتاً اے ٹی ایم پر نظریں دوڑا رہا تھا جہاں اروی گئی ہوئی تھی۔

''بابا آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' وہ فکر مندی سے بولا ''مجھے آپ کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔''

''ہاں یار بس ذرا بیمار ہو گیا ہوں میں۔ سینہ بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ سانس لینے میں بھی مسئلہ ہو رہا ہے۔'' غیر معمولی طور پر وہ سنجیدگی سے بولے۔

''بابا جانی آپ اپنا خیال رکھیں......پلیز۔''

وہ بھی اداس ہو گیا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے اپنے بابا جانی کے پاس۔

''ہاں یار رکھتا ہوں خیال بلکہ سارے ہی رکھتے ہیں میرا خیال......تو چکر لگا لے یار بڑا دل کرتا ہے تجھے اور اروشہ کو دیکھنے کا......جلدی چکر لگا لے۔''

''جی بابا......جلدی آؤں گا انشاء اللہ آپ اپنا خیال رکھنا۔''

اروی باہر آئی۔

''او۔کے بابا پھر بات ہوگی ......آپ اپنا بہت خیال رکھنا۔''

''ہاں بابا کی جان رکھوں گا خیال۔'' وہ دقت سے مسکرائے۔

''اللہ حافظ!'' وہ بولے اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

اروی گاڑی میں بیٹھی تو کچھ کنفیوز لگ رہی تھی۔

''Is every thing fine......''

حیان نے پوچھا۔

''ہوں!'' اس نے سر ہلایا۔

وہ کافی عرصے سے پیسے نکالتی آئی تھی ضرورت کے مطابق مگر اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ پیسے اتنی جلدی ختم ہو جائیں گے۔

وہ بار بار سوچ رہی تھی کہ کیا کرے اس کے پرس میں نہ ہونے کے برابر ہی پیسے تھے وہ کن انکھیوں سے حیان کو دیکھتی جیسے ہی وہ دیکھتا وہ نظروں کا زاویہ بدل لیتی۔

''اروشہ! یونیورسٹی آ گئی۔'' وہ رکتے ہوئے بولا۔

''اوہ......آ گئی ......'' وہ غائب دماغی سے بولی۔

''جی آ گئی......کب تک آؤں؟ مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

''جیسے ہی فارغ ہوں آ جایئے گا......'' وہ پرس کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی جیسے کہنا کچھ اور چاہ رہی ہو مگر مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

اروشہ وہ سنجیدگی سے بولا۔

''جی......''

''کوئی مسئلہ ہے؟ پلیز بتاؤ۔''

''وہ......وہ......''

وہ شرمندہ لگ رہی تھی ''میرے اکاؤنٹ میں ......وہ پیسے ختم ہو گئے ہیں جو بڑے بابا نے رکھوائے ہوئے تھے۔'' وہ سر جھکا کر یوں شرمندہ تھی جیسے بہت بڑی غلطی اس سے سرزد ہو گئی ہو۔ حیان کو اس کی معصومیت اچانک ہی ہنسی آ گئی۔

ختم ہونے والی چیز تھی ختم ہو گئی......

اس نے والٹ سے بڑے بڑے نوٹ اس

کی طرف بڑھائے ''یہ رکھ لو میں جمع کروادوں گا پیسے'' وہ خود بھی شرمندہ تھا۔ جو بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی اس کی ذمہ داری تھی...... اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی بھی ضروریات ہوں گی وہ کس طرح ایڈجسٹ کرتی ہوگی...... کیونکہ اس نے خود سے کبھی اس سے کچھ نہیں مانگا تھا پھر وہ خود بخود بڑے بابا کا بھی شکر گزار ہوا کہ انہوں نے مستقبل کے پیش نظر اریشہ کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھا تھا۔ وہ ان کی دور اندیشی کا ایک بار پھر قائل ہو گیا۔

''لے لو......'' وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''But'' وہ کنفیوژ تھی کیونکہ وہ ہمیشہ خوددار لڑکی رہی تھی۔

''یہ احسان نہیں ہے اریشہ یہ میری ذمہ داری تھی مگر میں شرمندہ ہوں کہ تم سے متعلق میں اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے بری الذمہ سمجھتا رہا ہوں ہمارا ریلیشن بے شک جیسا بھی ہو مگر بہر کیف تم میری ذمہ داری ہی ہو کیونکہ تم میرے نکاح میں ہو......'' وہ سچائی کا آئینہ اس کے سامنے لا کر بولا۔

''تو لے لو...... اور آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ تمہاری ضروریات کا خیال رکھوں۔''

''جی......'' اس نے مسکرا کر وہ پیسے وصول کیے کیونکہ حیان کے الفاظ کی صداقت پر اسے یقین تھا۔

''او کے مجھے لینے آجایئے گا وہ مت بھولیے گا۔'' وہ مسکرائی۔

''بائے بائے!'' وہ کہہ کر نکل گئی۔

اور حیان نے گاڑی دوڑا دی۔ اسے ڈنر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔

جیسے ہی اروی پر نظر پڑی صائمہ فوراً اس کی طرف آئی۔

''اف اریشہ تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''ہائی ہیلز میں ہو...... واہ جی واہ...... آج تو ٹور ہی وکھرے نے...... بئی۔''

''ہاں میں نے بھی آج ہائی ہیلز پہن ہی لی ہیں...... میں نے کہا کہ سب نے پہن لی میں بھی پہن ہی لوں پڑے پڑے بیکار ہو جائیں گے میرے جوتے۔'' وہ اسی کے انداز میں بولی۔

''تم آئیں Seriously مجھے بہت خوشی ہوئی تم نہ آتیں تو میں تو بور ہی ہو جاتی مسز فاروقی۔'' صائمہ کو جب اس پر بہت پیار یا غصہ آتا تھا تو وہ اسے مسز فاروقی بلاتی تھی۔

''اچھا بس ذرا دھیان دو سارے ہیں یہاں۔'' وہ ادھر ادھر نظریں ڈال کر بولی۔ لوگوں کے ہجوم میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے کون کون سنگر آ رہا ہے؟'' وہ پرجوش تھی۔

''نہیں بھئی مجھے نہیں پتہ اور نہ دلچسپی ہے۔'' وہ کان سے مکھی اڑاتے ہوئے بولی ''میں یہاں صرف تمہارے لیے آئی ہوں گانوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ او کے'' وہ مسکرائی۔

''میں آپ کی مشکور ہوں بیگم صاحبہ'' وہ آداب بجا لائی پھر دونوں ہنس دیں۔

''ہیلو لیڈیز'' عبدان کے گروپ کا تھا پیچھے سے آ کر بولا۔

''ہیلو'' صائمہ خوش دلی سے بولی جبکہ اروی نے صرف سر کو خم دیا۔

Looking soo beautiful''

اریشہ، وہ سر سے پاؤں تک اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اتار کر بولا۔

''تھینکس!''

''آج تم تھوڑی مختلف لگ رہی ہو...... نارمل دنوں کی نسبت۔''

''بھئی وہ بطور خاص میرے لیے آئی ہے

تیار ہو کر......'' صائمہ نے کہا
''ہاں تو میں کون سا خوش فہم ہوں کہ یہ میرے لیے آئیں گی۔''
وہ زیرِ لب بڑبڑایا......اس کی آنکھوں میں اروبشہ کے لیے واضح پسندیدگی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اس سے کتراتی تھی۔
''تم نے کچھ کہا ہے؟'' صائمہ نے پوچھا۔ اس کے الفاظ اسے سمجھ نہیں آئے تھے۔ اسی لیے پوچھا تھا۔
نہیں تو چلو چلیں اندر کیا، یہاں ہی رہنا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔
پھر وہ تینوں اندر چلے گئے۔
حیان بھی اپنے ڈنر سے جلدی نکلنے کے چکر میں تھا۔ گیارہ بج چکے تھے اسے اروبشہ کو پک کرنا تھا ...... یہ آفیشل ڈنر تھا لہٰذا اپنے آفس کی طرف سے اسے یہاں پر موجود ہونا ضروری تھا۔
''یار تم تو رکو ذرا اکٹھے ہی نکلیں گے۔'' وہ نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ پیچھے سے کامران نے آ کر پکڑ لیا۔
''یار رک ورنہ میں اکیلا ان گوروں میں بور ہو جاؤں گا۔'' وہ مظلوم سی صورت بنا کر بولا۔ باہر سے ڈیلیکیٹ آیا ہوا تھا اور ان کو کمپنی دینا دونوں کا کام تھا۔
''یار مجھے ابھی ایک اور جگہ بھی جانا ہے تو پلیز جانے دے ناں۔'' وہ اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولا۔
''یار پلیز دس پندرہ منٹ پھر دونوں کھسک لیں گے۔ باس کا ارادہ تو ہے یہاں اور رکنے کا......'' وہ دونوں کاریڈور میں کھڑے تھے جبکہ اندر میٹنگ چل رہی تھی۔ ڈنر کے ساتھ ڈائننگ ہال میں حیان نے گھڑی دیکھی گیارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھ۔ اوکے...... یار لیکن زیادہ دیر نہیں اوکے۔ وہ انگلی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولا
''Ok done۔'' وہ فوراً مان گیا پھر دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

''یار کب تک آئیں گے تمہیں لینے 11-45 ہو رہے ہیں......'' صائمہ بچاری اروی کی وجہ سے جا نہیں رہی تھی......وہ گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔
اروی کئی بار فون ملا چکی تھی مگر فون مسلسل بند آ رہا تھا۔ چند لوگ ہی وہاں تھے باقی سب تو جا چکے تھے۔ کنسرٹ جلدی ختم ہو گیا تھا ...... اروی مسلسل شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ آدھے گھنٹے سے یہاں کھڑی مسٹر فاروقی کا انتظار کر رہی تھی مگر دور دور تک ان کے آنے کے کوئی امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔ اوپر سے فون بھی آف تھا ان کا ...... اس کا پارہ چڑھ رہا تھا۔
''آئیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں اروبشہ ......'' عبید نے پیش کش کی
''نہیں تھینک یو مجھے بس لینے آتے ہی ہوں گے۔'' وہ مسکرا کر معذرت کرتے ہوئے بولی۔
''یار میں تمہیں خود چھوڑ دیتی اگر ہمارے گھر ایک ہی طرف ہوتے مگر یہاں مسئلہ بالکل مخالف سمتوں کا ہے اور ویسے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' صائمہ بولی۔
''مجھے بھی اکیلے جانا ہے ...... یار۔'' وہ شرمندہ تھی۔
''مجھے پتہ ہے یار Its Ok وہ آ جائیں گے لینے۔'' اروی نے کہا۔
''اللہ کرے آج کی تاریخ میں ہی آ جائیں کیونکہ اگلی تاریخ میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔'' وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔
''تینوں ہی ہنس دیئے۔''

''اروشیہ آ جائیں میں چھوڑ دوں گا آپ کو''
وہ اپنی خدمات دوبارہ پیش کرتے ہوئے بولا۔
''نہیں عبید تھینک یو آپ جائیں۔ صائمہ ہے یہاں۔'' اروشیہ کو اب دبا دبا غصہ آنے لگا تھا حیان پر۔
'' لگتا ہے بھول گئے ہیں مجھے۔'' وہ سوچ کر بولی اور نجانے کیوں آنکھیں نم ہونے لگیں۔
وہ تینوں باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک ان کے پیچھے گاڑی آ کر رکی۔
حیان گاڑی سے نکلا اور اس کی طرف آیا۔
''سوری...... آئی گیس میں کافی لیٹ ہوں......'' وہ ارد گرد نگاہ دوڑا کر بولا جہاں بہت کم ہی لوگ رہ گئے تھے۔
بلیک کلر کے ٹو پیس میں وہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔
''جی بہت زیادہ......'' وہ خفا خفا سی تھی۔
صائمہ اور عبید دونوں اس کی دلکش شخصیت اور مہذب لب و لہجے سے متاثر تھے۔
'' ہائے عبید ......عبید رضا'' عبید نے ہاتھ بڑھا کر تعارف کرایا۔
میں اروشیہ کا گروپ میٹ ہوں اور آئی گیس فرینڈ بھی۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔
حیان نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔
''حیان فاروقی۔'' وہ بولا۔
''میرے !Husband'' باقی کا تعارف اروشیہ نے خود کرایا...... وہ اس کی خوش فہمی کو ختم کر دینا چاہتی تھی...... لہٰذا بے لچک انداز میں بولی۔
عبید کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ایک دم ڈھیلی ہو گئی جسے حیان نے بہت شدت سے محسوس کیا۔ اروشیہ کے لہجے اور عبید کی ڈھیلی پڑتی گرفت کو۔

''اچھا تو آپ ہیں مسٹر فاروقی؟'' صائمہ متاثر کن لہجے میں بولی۔
Nice to meet you sir! وہ ہنس کر بولی
Nice to meet you too miss?? وہ الفاظ ادھورے چھوڑ گیا۔
''صائمہ افغان۔'' اس نے تعارف کرایا۔
''مس افغان مجھے آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ بولا
''اب چلیں مسٹر فاروقی؟'' وہ بولی۔
''ہوں......'' وہ پلٹا ساتھ میں اروی بھی......
اس نے ایک نظر عبید پر ڈالی۔ وہ اب بھی کچھ کنفیوز سا تھا۔
''تمہیں پتہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔'' عبید ان کے جاتے ہی صائمہ سے بولا۔
''ہاں کیوں؟'' وہ کندھے اچکا کر سوالیہ انداز میں بولی
''کب سے؟'' اس نے اگلا سوال داغا۔
''یونیورسٹی آنے سے پہلے ہی......'' مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔
وہ اب بھی نا سمجھی میں بولی۔
''بس ویسے ہی......'' وہ کہہ کر چلا گیا۔
''عجیب بات ہے کبھی ذکر نہیں کیا اس نے......''
''آپ کو یاد آ گئی میری، مسٹر فاروقی۔'' وہ ناراض سی بولی۔
'' پتہ ہے مجھے کتنی شرمندگی ہوئی اپنے دوستوں کے سامنے کہ آپ مجھے لینے نہیں آئے تھے۔'' وہ خفا تھی ان سے اور باقاعدہ اظہار کر رہی تھی
''سوری! لیکن میں بہت بزی تھا اروشیہ سوری اگین!'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔
''تو کیسا رہا آپ کا......'' اس نے موضوعِ گفتگو بدلا۔

''بور تھا...... مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسٹیج پہ کون گا رہا ہے۔ آنے والا سنگر کہ وہ مجمع......'' وہ ہنسی۔ اس کا دھیان بٹ گیا۔

''اچھا......!!''

''تو اور کیا'' وہ بولی۔

''بہت شور تھا وہاں اُف سر میں درد ہونے لگا' مجھے وحشت ہوتی ہے ایسے ہنگاموں سے'' وہ بولی۔

''ہوں مجھے بھی......'' حیان نے کہا اور ونڈ اسکرین سے باہر جھانکنے لگا

☆......☆......☆

''اللہ میاں کتنا مزا آتا ہے ناں ایسے کانسرٹس میں۔''

شزا کتنی پر جوش لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ابھی کسی میوزیکل نائٹ سے لوٹ رہے تھے شزا نے کہا ''دل کرتا ہے کہ انسان بھی ناچے ان گانوں پر...... اف بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔''

''شزا تمہیں انسانوں والی کوئی چیز پسند بھی ہے یار'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بھئی تم خود کو عام انسان نہیں سمجھے تو میں کیا کروں۔ عام انسان تو ہنستا ہے گاتا ہے۔ ناچتا ہے' زندگی جیتا ہے۔ اور میں وہی کرتی ہوں'' وہ گردن اکڑا کر بولی۔

حیان نے افسوس سے سر مارا اس کے زندگی جینے کے فلسفے پر۔

''مسٹر فاروقی......

''مسٹر فاروقی کہاں کھو گئے......'' اس نے کندھا ہلا کر متوجہ کیا۔

''ہوں...... کہیں نہیں۔'' وہ نظریں سڑک پر جما کر ہاتھوں کو اسٹیئرنگ پر اور مضبوطی سے جماتے ہوئے خیالوں کی دنیا سے نکلا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے حیان کے چہرے کے تاثرات کے پیش نظر پوچھا...... جو بدل گئے تھے اور ایک دم سنجیدگی کی گہری لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

''ہاں...... ٹھیک ہوں۔ تم ابھی کچھ کہہ رہی تھیں۔'' وہ متوجہ ہوا۔

''ہاں میری چھٹیاں شروع ہو گئی ہیں۔'' وہ بتا رہی تھی۔

''اچھا!'' وہ غائب دماغی سے بولا۔

''جی......'' وہ پھر سے تیزی سے باہر بدلتے ہوئے مناظر میں گم ہو گئی۔

اور وہ پھر سے یادوں کے سفر پر روانہ ہو گیا جہاں صرف تکلیف ہی تکلیف تھی۔ اروی کو اس کو لینے آنا اور پھر معذرت کرنا بہت بھایا تھا...... انہیں میرا خیال تو ہے وہ بہت خوش تھی۔

☆......☆......☆

وہ دیر سے سو کر اٹھا تھا آج چھٹی کا دن تھا اس لیے اس کا ارادہ اپنی تھکن اتارنے کا تھا۔ پھر وہ باہر نکل گیا......

اروی نیچے آئی تو شانی سے مسٹر فاروقی کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ تو گھر پر نہیں ہیں باجی۔''

''اچھا!'' اس نے حیرت سے کہا۔

''یہ کہاں چلے گئے......'' وہ حیران سی ناشتہ کرنے چلی گئی۔

ابھی وہ رات کے منظر کو پھر سے ذہن میں تازہ کر رہی تھی جب عبید کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا مسٹر فاروقی کا جب اس نے تعارف کرایا تھا۔ عبید ایک اچھا لڑکا تھا۔ اچھی فیملی سے بلانگ کرتا تھا مگر اس کی خواہش بالکل بے جا تھی۔ وہ اسی طرح اسے شاک کرنا چاہتی تھی اس لیے کبھی رسپانس نہیں دیا تھا اسے حالانکہ وہ بارہا اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا اروبشہ سے۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی کہ اس کا سیل

فون بج اٹھا۔
''ہیلو!'' وہ ریسیو کر کے بولی۔
''کیسی ہو تم یار؟'' سحرش بھابی کا فون تھا۔
''میں ٹھیک ہوں بھابھی آپ بتائیں گھر میں سب کیسے ہیں؟''
''ہوں سب ٹھیک ہیں۔ تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو اروی جب سے گئی ہو نہ تو چکر لگایا اور نہ ہی کوئی خیر خبر......'' وہ ناراضگی جتاتے ہوئے بولیں۔
اروی چائے کا کپ تھام کر کھڑکی کے پاس آ گئی اور باہر لان کو دیکھ کر مسکرا دی...... دھوپ کی چمک سے باہر کی ہریالی جگمگا رہی تھی۔ سردیوں کی آمد تھی لہٰذا دھوپ میں عجیب سی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔
''بھابھی بس کل ہی فری ہوئی ہوں میں...... اب فرصت ہے انشاء اللہ باتیں ہوتی رہیں گی......''
اسے بھابھی کا شکایت کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔
''تم کب آ رہی ہو؟'' انہوں نے دوسرا سوال داغا۔
''یہ تو مسٹر فاروقی پر منحصر ہے جب وہ لے آئیں۔''
''تو تم کہہ تو سکتی ہو حیان سے کہ وہ تمہیں ہمارے ہاں چھوڑ جائے۔'' وہ خفا ہوئیں۔
''جی بھابی...... بس ہماری بات چیت نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔ فرصت ملی تو کہہ دوں گی۔'' وہ اپنی رو میں ہی بول گئی اور الفاظ پر غور نہیں کیا۔
''کیا مطلب؟ بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔'' انہوں نے فوراً بات پکڑ لی۔
''وہ...... وہ...... ہم دراصل بہت بزی ہوتے ہیں ناں اسی لیے۔'' اروی کو اپنی غلطی کی سنگینی کا احساس ہوا تو بات سنبھالنے لگی۔
''بھئی جتنا بھی بزی ہو مگر رات کو تو ایک ساتھ روم میں ہو گے ہی ناں؟'' یہ وہ بتا رہی تھیں یا پوچھ رہی تھیں اروی سمجھ نہیں پائی۔
اس کے ہاتھوں سے طوطے اڑنے لگے وہ اب یہ کیسے بتاتی کہ مسٹر حیان اپنے روم میں اور وہ اپنے روم میں اپنی الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں شاید وہ دونوں ہی بھول گئے کہ ان کی شادی ہوئی ہے۔
''اچھا بھابی وہاں پر بھی سردی شروع ہو گئی کیا؟ کیونکہ یہاں پر تو رات میں ٹھنڈ ہو جاتی ہے......'' وہ بات بدل گئی۔
''اروی......'' سحرش کچھ کہنا چاہ رہی تھی پھر بول پڑی۔
''ہاں ہو گئی ہے یہاں پر بھی ٹھنڈ۔'' وہ مطمئن نہیں تھیں مگر پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ سبھی جانتے تھے کہ ان کی شادی کن حالات میں ہوئی ہے اسی لیے وہ زیادہ تردد نہیں کرنا چاہ رہی تھیں...... کہ اسے برا نہ لگ جائے۔ ''اچھا چلو جلدی چکر لگا لو...... بڑے بابا تم کو بہت یاد کرتے ہیں۔''
''جی بھابی...... ضرور!'' وہ بولی اور رابطہ منقطع کر دیا۔
وہ اپنے اور حیان کے رشتے کو لے کر گہری سوچ میں پڑ گئی۔
''یہ کیا ہو رہا ہے...... زندگی کے شب و روز یوں ہی گزر رہے ہیں۔''
وہ گننے بیٹھی تو احساس ہوا کہ اس کے نکاح کو سات ماہ گزر گئے ہیں۔ اف میرے خدا میں کیا کروں...... میں تو شاید بھلا ہی بیٹھی تھی کہ میں کسی کی بیوی ہوں...... یا شاید ہم دونوں ہی اس چیز کو قبول نہیں کر پا رہے یا شاید کرنا ہی نہیں چاہتے۔
''حیان کو چھوڑو اروی تم اپنا بتاؤ؟ کیا تم نے قبول نہیں کیا حیان کو اپنا شوہر؟'' ایک دم اس کے اندر سے آواز آئی۔
وہ یکدم گھبرا گئی......

''نہیں شاید......'' اس کے لب ہلے۔
''اچھا تو پھر عبید سے کیوں متعارف کرایا اپنے شوہر کی حیثیت سے؟؟''
ایک اور خطرناک سوال تھا جس کا جواب شاید وہ دینا نہیں چاہ رہی تھی۔ مان لو اروی تمہیں حیان سے محبت ہوگئی ہے۔ تم سوچنے لگی ہو اسے ورنہ تمہیں اتنا غصہ نہ آتا اس طرح اس کے لیٹ آنے پر کہ شاید وہ تمہیں بھول گیا ہو۔'' ضمیر نے اس کا آئینہ اسی کو دکھایا جس میں وہ ارویشہ پرویز فاروقی سے ارویشہ حیان فاروقی میں ڈھل گئی تھی۔
''تم اس کی بیوی ہو ارویشہ...... مان لو کہ وہ تمہیں اچھا لگنے لگا ہے...... مان لو......'' کوئی اندر زور زور سے بول رہا تھا۔
'' ہاں ، ہاں واقعی میں چاہتی ہوں مسٹر فاروقی کو'' اس نے کہا اور ایک شرمگیں مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کرلیا
وہ اوپر آئی اور بہت ہی خوبصورت سا ڈریس نکالا اور اچھی طرح تیار ہوئی۔ آج اس نے غیر معمولی طور پر ڈارک سا میک اپ کیا اور لال خون کے رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ غور کرے گا یا نہیں۔ خوشبوؤں میں نہا کر وہ نیچے بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگی...... دل زور زور سے دھڑک رہا تھا...... شاید ہولے ہولے اسے کہہ رہا تھا کہ آج شام من کا موتی پانے والی ہو۔
وہ اسی انتظار میں تھی کہ حیان آئے مگر گھر میں مہمانوں کی آمد نے اسے چونکا دیا۔
''باجی کامران بھائی آئے ہیں۔'' شانی نے مطلع کیا۔
''کامران کون؟'' وہ حیران ہوئی۔
''وہ صاحب کے دوست ہیں آتے ہیں کبھی کبھی۔'' شانی کہہ کر ان کے لیے مشروبات کا انتظام کرنے چلا گیا۔ حیرت ہے پہلے تو ذکر نہیں سنا۔ وہ بولی اور نیچے آئی۔ وہ کچھ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مسز حیان بن کر کسی سے مل رہی تھی اسی وجہ سے تھوڑا کنفیوز تھی۔
''السلام علیکم!'' وہ دھیمے لہجے میں اندر جھانکتے ہوئے بولی۔
اندر ایک خاتون، دو بچے اور ایک آدمی تھا وہ اسے دیکھ کر کھڑے ہوئے۔
''وعلیکم السلام!'' عورت خوش دلی سے اس کی طرف بڑھی اور گلے ملی۔
''دیکھا آج پکڑ لیا میں نے آپ کو......'' وہ خاصی خوش مزاج معلوم ہو رہی تھی...... مگر اروی کے لیے وہ بالکل انجان تھی جو اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ بچی بھی ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھی۔
''ارے انہیں کیسے پتہ ہو کہ ہم کون ہیں؟ حد کرتی ہو کرن یار تم بھی۔'' کامران آگے بڑھا ''ہم پہلی بار مل رہے ہیں ناں۔''
''بھابھی ہم مطلب ''میں'' وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولا ''میں حیان کا دوست ہوں بچپن کا...... اکٹھے کام بھی کرتے ہیں ہم...... کامران نام ہے میرا اور یہ میری فیملی ہے۔'' وہ تعارف کرا کر بولا ''ہم دراصل تھوڑے عرصے پہلے ہی لوٹے ہیں، امریکا سے!''
''اوہ! معاف کیجیے گا مجھے معلوم نہیں تھا......'' وہ خوش مزاجی سے بولی۔
''آپ بیٹھیے پلیز۔''
''معلوم ہوتا ہے حیان بھائی نے بتایا ہی نہیں ہوگا...... سدا کے بھلکڑ ہیں وہ۔ اکثر کچھ نہ کچھ بھولے ہی ہوتے ہیں...... اب آپ کی شادی کا بتانا بھی بھول گئے تھے۔ کچھ عرصے پہلے ہی بتایا انہوں نے۔ مجھے تو غصہ ہی آ گیا ان پر......'' کرن بلا کسی بریک کے بولے جا رہی تھی۔ شاید کچھ زیادہ ہی باتونی تھی وہ۔ کامران نے بچی کو مخاطب کیا۔

''اوہ علیزے بیٹا...... سلام کرو آنٹی کو'' اس نے چھوٹی بچی کو آگے کیا۔

وہ آگے ہوئی مگر کچھ بولی نہیں بلکہ ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی انگلی منہ میں دبائے ...... اروی نے بچی کو بہت پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ شرما کر اس کی بانہوں میں آ بیٹھی۔

اتنے میں شانی مشروبات لے آیا۔

''لگتا ہے کہ آپ شاید کہیں جارہی تھیں۔'' کرن نے تیاری دیکھ کر کہا۔

''اوہ نہیں بس یونہی ......'' اروی شرمندہ سی ہوگئی۔

''آپ سنائیں سب ٹھیک ہے۔'' اس نے بے تکا سا سوال کیا۔ وہ کنفیوز ہورہی تھی۔

''جی بھابھی اللہ کا بہت شکر ہے، سب خیریت ہے۔''

''مسٹر فاروقی گھر پر نہیں ہیں......''

''جی پتہ ہے میں نے فون کیا تھا آنے سے پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ بس آرہا ہوں۔''

''اوہ......'' اس کے منہ سے نکلا...... بھلا مجھے بھی بتادیتے تو ذہنی طور پر تیار ہوتی اور اس طرح تیاری ہرگز نہ کرتی۔ اسے غصہ آنے لگا اپنے سنگھار پر جو اس نے حیان کے لیے کیا تھا کمرے میں پھر خاموشی ہوگئی......

کرن نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں...... کیا کرتی ہو سارا دن...... بور تو نہیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ جبکہ گاہے گاہے وہ اپنے گود میں موجود بیٹے کو بھی سنبھال رہی تھی۔

وہ اسے جواب دینے لگی۔ مصروف سے انداز میں۔

''اوہ! سوری، میں لیٹ ہوگیا۔'' حیان اندر داخل ہوا تو اروی نے خشمگیں سی نگاہ ڈالی۔ پل بھر کو ان کی نظریں ملیں...... اس کی نگاہوں کی ناراضگی سے تھوڑا سا حیران ہوا مگر جلد ہی مصروف ہوگیا۔

''بھئی میں آپ سے ناراض ہوں بھائی ایک تو شادی میں مدعو نہیں کیا، اوپر سے لے کر بھی نہیں آئے اروبیشہ کو......'' کرن نے صاف ناراضگی دکھائی۔ ''حالانکہ ہمیں آئے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا ہے۔''

''حیان بابا!'' علیزے فوراً اروی کی گود سے آزاد ہوکر حیان کی طرف دوڑی...... اور اس کے گلے لگ گئی۔

''میرا بچہ'' حیان نے بڑھ کر اسے گود میں بٹھالیا اور پیار کرنے لگا۔ اروی کے لیے حیان کا یہ روپ بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔ کتنی انسیت سے وہ علیزے کے ساتھ مصروف تھا۔

''بس بھابی...... بھول بھی جائیں اب۔'' وہ ناراض سا کامران کو دیکھ کر بولا' جبکہ اس نے کندھے اچکا کر اپنی بے بسی کا واضح اظہار کیا۔

''حیان بابا...... میری چیز' علیزے اپنی توتلی زبان میں ہاتھ بڑھا کر بولی۔

''جی بالکل اپنی علیزے کے لیے میں لایا ہوں اس کی چیز......'' وہ جیب سے بڑی سی چاکلیٹ نکال کر بولا۔

علیزے نے جھٹ سے پکڑ لی ''اور میری پپو'' وہ چہرہ آگے کرکے بولا۔

علیزے نے اس کا چہرہ چوم لیا۔ سبھی مسکرادیے۔

''دیوانی ہے یہ اپنے حیان بابا کی۔'' کرن نے کہا۔

''اور حیان بابا اس کے'' کامران بولا۔

کرن کی گود میں موجود بچہ بھی مچل رہا تھا حیان کے پاس آنے کو۔

''لو بھئی تم بھی جاؤ اپنے حیان بابا کے پاس۔'' کرن اٹھتے ہوئے بولی تو سب مسکرادیے۔

''پتہ نہیں میرے بچوں پر کون سا جادو کیا ہوا ہے آپ نے بھائی آپ کو دیکھتے ہی پگلا جاتے ہیں اور آپ کے پاس آنے کو بیتاب ہو جاتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''بھابھی بچے تو بس پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ انہیں پیار دو تو خود بخود مانوس ہو جاتے ہیں اور میں تو ویسے ہی بچوں کے لیے ترسا ہوا بندہ ہوں۔'' آخری فقرہ اس نے دھیرے سے کہا جبکہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی اور اندر سے کراہ نکلی۔

''سوری بھائی! ہم نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ...... آپ کا شاید باہر جانے کا پروگرام تھا کیونکہ بھابی بالکل تیار تھیں۔'' کامران نے کہا۔

جبکہ اروی چور بنی بیٹھی تھی۔ حیان نے گردن گھما کر اروی کو دیکھا جو نک سک سے تیار تھی۔ آنکھوں میں حیرانی واضح تھی۔

شام کو ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ سارا دن حیان بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا تا جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر آنے کی دعوت دے کر گئے تھے جب حیان انہیں سی آف کر کے آیا تو اروی اس پر برس پڑی۔

''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ مہمان آ رہے ہیں؟'' وہ ناراض تھی۔

''مجھے انہوں نے نکلنے سے پہلے فون کیا تھا میں بزی تھا اسی لیے یاد نہیں رہا کہ بتا دوں۔''

''مطلب آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ گھر میں کوئی اور بھی ہے جو شاید میری بیوی ہے اسے بتانا چاہیے تایا شاید آپ نے ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ غصے سے بولی جبکہ حیان اس کے لب و لہجے پر حیران تھا۔

آج اروی کو غصہ آیا ہوا تھا ایک تو وہ اتنا تیار ہوئی تھی حیان کے لیے جس پر اس نے ذرا بھی غور نہیں کیا تھا اوپر سے کرن نے ڈھیروں سوال کیے تھے حیان کے بارے میں کہ وہ کیسا ہے؟ کیا پسند ہے اسے پتہ تو چل گیا ہوگا۔ ان کی شادی شدہ زندگی کیسے گزر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ ہونق بنی بیٹھی تھی کیونکہ ایسے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اسے لگا کہ آج شاید حیان فاروقی نے اس پر احسان کیا تھا نکاح کر کے اور وہ بھول چکا تھا...... اسے اپنی ذات بالکل بے وقعت سی لگ رہی تھی آج...... اس کا دل بھر آیا تھا۔

''مسٹر فاروقی میں شاید آپ کی بیوی ہوں۔'' وہ اس کی خاموشی پر بولی۔

''یا شاید آپ مانتے نہیں ہیں مجھے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ نے ایک بار بھی غور کیا کہ آج میں اتنا تیار کیوں ہوئی۔ غور کیا...... ہونہہ...... آپ نے تو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں مجھے۔'' وہ رو پڑی۔

''اروشہ کیا ہو گیا ہے تمہیں آج؟'' اس کی اس قسم کی بے تکی باتیں حیان کے لیے بالکل غیر متوقع تھیں کہ یوں اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے اسے۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے...... واقعی مجھے کیا ہو گیا ہے......'' وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''مجھے ...... مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے حیان۔'' وہ اس کے کالر پکڑ کر بولی۔

''اروشہ......!'' اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ششدر تھا اس کے لب و لہجے پر۔

''سنا آپ نے حیان۔'' آج وہ اس کو اس کے نام سے بلا رہی تھی۔

''مجھے محبت ہو گئی ہے آپ سے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی اور پھر پلٹ کر اوپر بھاگ گئی۔

جبکہ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

اس نے غور کیا تھا کہ آج وہ تیار ہے روزمرہ

کی نسبت زیادہ۔ مگر کیوں تیار ہے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ بھولا نہیں تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے بس وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اپنے ماضی سے پیچھا چھڑا کر حال میں جی پائے۔ قدم قدم پر ماضی کی یادیں اس کا دامن پکڑ لیتی تھیں۔ شنزا اس کی زندگی میں نہ ہو کر بھی اس کی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی پہلی چاہت تھی اور انسان اپنی پہلی محبت سے با آسانی دستبردار تو نہیں ہوسکتا ناں...... اروی اور حیان اکٹھے تھے مگر ساتھ نہیں تھے۔ اروشیہ کو اب بھی اس کے لیے بڑے بابا کا ایک فیصلہ تھی اور کچھ نہیں۔

وہ سگار پیتے ہوئے سوچ رہا تھا اروشیہ کے رویے کو۔ اتنے عرصے میں وہ اس کے ساتھ نارمل رہی تھی کبھی اظہار نہیں کیا پھر یوں ایک دم......

☆......☆......☆

''انہیں میری بالکل بھی پروا نہیں ہے۔ ایک بار بھی اوپر آ کر چیپ نہیں کرایا مجھے...... کیا میں اتنی غیر اہم چیز ہوں ان کے لیے...... یا وہ ایسے کٹھور ہیں کہ کسی کے جذبات کا ان پر اثر نہیں ہوتا کیا۔ واقعی...... وہ ایک بے حس انسان ہیں۔ سب ٹھیک کہتے ہیں وہ ایک بے حس، بے مروت انسان ہیں......'' وہ تکیے میں منہ دے کر رودی۔

☆......☆......☆

ساری رات حیان نے آنکھوں میں اور سگار کے دھوئیں میں گزار دی۔ وہ اپنی زندگی میں ہونے والی تبدیلی کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا اپنے حال سے ...... کمرے میں موجود اندھیرے میں وہ خود بھی کہیں کھو سا گیا تھا۔ صبح صادق کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکلا...... مجھے اس سے بات کرنی ہوگی۔ وہ ارادہ کر کے اوپر کی جانب قدم بڑھانے لگا...... مگر پھر رک گیا'' کیا بات کروں گا میں اس سے؟'' وہ سوچنے لگا۔

دل و دماغ میں عجب کشمکش چل رہی تھی۔ شنزا کی یادوں سے وہ جان چھڑا نہیں پا رہا تھا اور اپنی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کو وہ اپنا نہیں پا رہا تھا۔ اس کے قدم پھر پلٹ گئے۔

سارا دن وہ بولائی بولائی سی گھر میں چکر لگاتی رہی...... وہ حیان کے کمرے میں آئی۔ چادر بستر کی ابھی تک شکن زدہ تھی۔ کمرے میں سگار کے دھوئیں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ وہ چلتی ہوئی اس کے بستر پر آ گئی اور بیٹھ کر چادر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آنکھیں خود بخود برسنے کو بیتاب تھیں سو موتیوں کی طرح آنسو گرنے لگے۔

''کیوں مسٹر فاروقی کیوں آپ اتنے کٹھور کیسے ہوسکتے ہو...... اتنے بے حس بنے ہو جان بوجھ کر کہ کسی کے احساسات کا بالکل بھی خیال نہیں ہے میں نے آپ کا انتظار کیا ہے۔ اتنے عرصے خود کو مصروف رکھا ہے تا کہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں مگر آپ تو بالکل ہی انجان بنے ہوئے ہو مجھ سے...... میری فیلنگز سے...... آپ کو جتنا چاہتی تھی میں لیکن آپ تو......'' وہ زار و قطار رو پڑی۔ حیان نام کا پودا شاید اب گھنے درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کی جڑیں اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھیں۔

اس نے پڑھائی کا بہانہ بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حیان کی زندگی میں زبردستی شامل ہو جب اسے احساس ہوا کہ وہ اسے چاہنے لگی ہے تو اس نے اپنے آپ پر بند باندھ لیے۔ دل کہتا تھا کہ بڑھ اور تھام لے اسے مگر دماغ کہتا تھا کہ وہ پہلے ہی محبت میں ہارا ہوا شخص ہے اسے وقت دے کہ وہ خود بڑھے۔ اتنے مہینوں میں وہ اس سے بیگانہ ہونے کی کوشش کرتی رہی تھی مگر آخر کو ہار گئی وہ......

شام ڈھلی اور پھر رات بھی...... مگر ابھی تک

وہ نہ آیا تھا۔ وہ بھی بے حس بنی کمرے میں بیٹھی رہی ...... دل دھڑک رہا تھا کہ وہ آیا کیوں نہیں لیکن پھر غصہ بھی آ گیا کہ کیوں اس کا انتظار کروں؟

رات گئے اس کی گاڑی کی آواز سنی اور کھڑکی سے جھانکا۔

بے ترتیب سے کپڑے شکن آلود تھے۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے اس نے گاڑی سے کوٹ نکالا اور کندھے پر رکھ لیا وہ بکھرا بکھرا سا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ پل بھر کو تو دل نے کہا کہ اس کے پاس چلی جائے...... مگر پھر احساس ہوا کہ سیلف ریسپیکٹ بھی تو کوئی چیز ہے وہ اتنی گری پڑی نہیں ہے کہ جا کر بھیک مانگے کہ مجھے اپنا لو...... وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور بستر پر آ گئی۔

سرِشام وہ آفس سے نکلا ہی تھا مگر گھر آنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسی لیے وہ سارا وقت آوارہ گردی کر رہا تھا۔ ایک نظر اس نے سیڑھیوں کو دیکھا جو اورویشہ کے کمرے کو جاتی تھیں مگر پھر وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

اگلے دو دن بھی اسی میں گزر گئے دونوں نے ایک دوسرے کا سامنا نہیں کیا۔

سیل فون کی گھنٹی پر وہ متوجہ ہوا۔

''السلام علیکم چچا......'' وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولا۔

''وعلیکم السلام بیٹا ٹھیک ہو تم؟''

''جی اچھا ہوں۔''

''اور اروی کیسی ہے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔'' دل کو کچھ ہوا۔

''بیٹا تم لوگ آ جاؤ یہاں پرسوں عثمان کی منگنی ہے۔ او۔کے تو جلدی آ جانا۔''

''جی چچا جان آ جائیں گے...... مبارک ہو آپ کو۔''

''ہوں، او کے اروی کو میرا پیار دینا......

او۔کے اللہ حافظ!''

''اللہ حافظ!'' سیل فون میز پر پٹخ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''آخر کیوں میں بھاگ رہا ہوں اس سے ...... ایسا کیا ہے؟ اس میں۔'' اسے غصہ آنے لگا۔

''میں کب سے اتنا بزدل ہو گیا ہوں کہ حالات سے بھاگنے لگا ہوں۔'' ایک جنگ اس کے اندر چھڑ گئی تھی۔ جذبات کا غصہ کا طوفان امڈ رہا تھا اس کے اندر۔ حالات سے؟ یا محبت سے؟؟ یہ سوال اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

تم حالات سے نہیں بلکہ اورویشہ کی محبت سے بھاگ رہے حیان فاروقی تم اس لڑکی کی چاہت سے بھاگ رہے ہو کیونکہ تم خود زخمی ہو اس چاہت کے ہاتھوں تمہاری محبت کا مذاق اڑایا ہے تمہارے محبوب نے، تم کھلونا بنے رہے ہو کسی کے ہاتھوں کا۔ اب ...... اب تم بھروسہ نہیں کر پا رہے کسی کی چاہت پر۔ اپنے اوپر سے یہ خول اتار کہ تمہیں فرق نہیں پڑتا کہ تم بے حس انسان ہو۔ تمہیں فرق پڑ رہا ہے حیان فاروقی کوئی اس کے اندر چلا رہا تھا۔

اور وہ اسے جھٹلانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا کیونکہ ضمیر کی آواز انسان جھٹلا نہیں سکتا۔

''تمہیں فرق پڑ رہا ہے ...... اسی لیے بے چین ہو...... تڑپ رہے ہو تم مگر ہمت نہیں ہے اعتراف کی کہ تمہیں اس لڑکی کی باتوں سے فرق پڑا ہے ...... تم محبت نہ سہی لیکن چاہت رکھتے ہو اس کی۔''

ان الفاظ پر اس کا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''کیا میں چاہتا ہوں اسے......'' اس سوال پر وہ خود بھی حیران تھا۔

☆......☆......☆

''بہت ہو گیا مجھے بھی پروا نہیں ہے اس کی

اگر اسے میرے ساتھ نہیں ہے تو......" وہ غصے سے چلا اٹھی، وہ بیگ لیا اور گھر سے نکل گئی۔

"بی بی جی کہیں جا رہی ہو تم؟" بے بے کچن سے نکلی تو وہ باہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"بے بے میں جا رہی ہوں...... صاحب کو بتا دینا۔" وہ غصے سے بولی۔

"کہاں؟" وہ حیرانی سے بولیں۔

"پتہ نہیں" وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ گاڑی بھی گھر میں ہی چھوڑ گئی۔ اس نے سیل فون پر صائمہ کا نمبر ملایا۔

"ہاں مسز فاروقی آپ نے یاد کیا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں صائمہ I need yuor help! ......" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"او۔کے" صائمہ نے کہا وہ بھی سنجیدہ تھی۔

آج مسلسل جنگ کر کے اپنے ساتھ وہ شام ڈھلے پہنچا۔ آج اس نے اعتراف کیا تھا کہ اسے فرق پڑتا ہے۔ بہت فرق پڑتا ہے اریشہ کے رویے سے۔ وہ شرمندہ تھا اپنی بے رخی پر۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے اریشہ کے جذبات کا احساس نہ کر کے اس کے ساتھ برا کیا ہے۔ آج وہ اپنے کیے پر پشیمان تھا اور اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ محبوب کی بے حسی کتنی تکلیف دیتی ہے وہ سیدھا اوپر جانے لگا کہ پیچھے سے شانی اس کے لیے پانی لے آیا۔

"صاحب باجی نہیں ہیں......"

اس کے قدم وہیں تھم گئے......

"کیا مطلب؟ کہاں ہے اریشہ؟" وہ حیران ہوا اور پلٹا۔

"پتہ نہیں مگر آج دوپہر وہ بیگ لے کر چلی گئی کہیں......" وہ بولا۔

"کیا؟......!! کہاں گئی۔ الفاظ تھے یا بم تھے

حیان نے سر تھام لیا۔

اس نہج پر تو سوچا ہی نہیں کہ میں نے اس سے تین دن بات ہی نہیں کی...... "اف میرے خدا یہ کیا ہو گیا مجھ سے میں اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلتا رہا اور اسے فراموش کر دیا۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"بتایا نہیں کہاں جا رہی ہے؟" اس نے سر اٹھا کر حیران و پریشان سے شانی کو دیکھا۔

"پوچھا تھا صاحب مگر کہا کہ پتہ نہیں۔" بے بے بھی آ گئی۔

اس نے تیزی سے فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا...... مگر فون بھی بند تھا۔

"کب نکلی؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"بھی کوئی دو بجے کے قریب۔" بے بے نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے نا صاحب...... بی بی جی بھی بڑی روئی ہوئی لگ رہی تھی...... وہ بھی پریشان تھی۔" بے بے نے فکرمندی سے پوچھا۔

حیان نے گھڑی دیکھی جو رات کے سات بجا رہی تھی۔

"نہیں بے بے سب ٹھیک نہیں ہے۔" حیان کہہ کر باہر نکل گیا۔

"اللہ خیر کرے۔" بے بے نے بے اختیار کہا

"آمین!" شانی نے بھی کہا اور پانی واپس لے گیا۔

ظاہر ہے وہ بھی گھر کے مکین تھے اتنا تو اندازہ تھا ہی کہ سب نارمل نہیں ہے گھر میں اریشہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکل رہی تھی، اس جھگڑے کے بعد۔ اور صاحب تو آتے ہی دیر سے تھے اور جلدی چلے جاتے تھے۔ کچھ تو معاملہ گڑبڑ تھا۔

"اماں ایک بات تو بتاؤ" شانی نے بے بے سے کہا۔

"ہاں پتر پوچھ۔"

"بی بی صاحب کی بیوی ہی ہے نا؟"

"کیوں؟ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے تو۔" وہ حیران ہو کر بولی۔

"کیوں کہ لگتا نہیں ہے دونوں اپنی اپنی دنیا میں جو رہتے ہیں۔ شروع شروع میں جب وہ آئی تھی تو ساتھ میں کھانا وغیرہ بھی کھا لیتے تھے مگر پھر جب سے وہ جانا شروع ہوئی ہے پڑھنے کو تب سے تو کئی کئی دن ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھتے...... یہ کیسا رشتہ ہو گیا۔"

"بیٹا یہ بڑے لوگ ہیں اور ان کی باتیں صرف یہ ہی جانیں اور کون جانے بھلا؟" بے بے کی اپنی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اسے کیا بتاتیں۔ وہ بچارے سیدھے سادے لوگ تھے اتنے پیچیدہ رشتے ان کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

وہ مسلسل اسے فون کرنے میں لگا ہوا تھا اور فون بند تھا۔

"یہ میں سڑکوں پہ گاڑی کیوں بھگا رہا ہوں بے وقوفوں کی طرح۔" اسے خود پر غصہ آنے لگا اور ساتھ میں اروشہ پر بھی جو بنا کچھ بتائے کہیں چلی گئی تھی۔

"وہ...... وہ اپنی دوست کی طرف تو نہیں گئی......؟" اس کے ذہن میں فوراً صائمہ کا خیال آیا "ہو سکتا ہے مگر میرے پاس تو اس کا نمبر ہی نہیں ہے میں تو صرف ایک بار ملا ہوں اس سے۔" غصے سے اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔

"پھر کہاں گئی ہو گی وہ اتنے بڑے شہر میں۔" اس نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے لگا کہ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ اس شہر میں کتنے لوگوں کو جانتی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام آباد نہ چلی گئی ہو۔ گھر فون کروں...... "فوراً خیال آیا۔

"مگر پوچھوں گا کیا وہ لوگ تو الٹے سوال کریں گے مجھ سے اور بڑے بابا...... اف بڑے بابا پریشان ہو جائیں گے۔"

"یا خدا کیا کروں...... وہ نگاہیں آسمان پر اٹھا کر بولا جہاں چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔

وہ چاند کو گھورے گیا اپنے اردگرد سے بے خبر ہو کر۔

"یہ چاند شاید اسے دیکھ رہا ہو......" نہ جانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال آیا۔ پھر چند لائنیں اسے یاد آئیں جو اس نے کہیں پڑھی تھیں:

اے ہجر کے مہتاب سن
ہم بھی ہیں تیرے ہم سفر
ہم سے نہ اجتناب کر
جب بخت میں نہ چین ہو
کسی سے کیا گلہ کریں
راستے میں انہیں روک لیں
کیسے یہ حوصلہ کریں

☆......☆......☆

"ہوں اب کیا کرو گی......؟" صائمہ نے سارا ماجرا سننے کے بعد کہا۔

"پتہ نہیں یار کہ کیا کروں گی تم بتاؤ میرے دماغ نے تو کام کرنا بند کر دیا ہے۔" رو رو کر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ساتھ میں سوزش بھی آ گئی تھی ان میں۔

"یار ایک تو تم ہیروئنز کی طرح رونا بند کرو پہلے، پھر بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" اس نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"حد ہے بھئی میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ...... وہ یقیناً پریشان ہوں گے تمہارے لیے۔ پتہ ہے اروشہ یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں جب تک ان کے سامنے ان کی دسترس میں رہو انہیں احساس ہی نہیں

ہوتا مگر جب ان کے سامنے سے غائب ہو جاؤ تو پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے ہیں۔ مگر سامنے رہتے ہوئے اظہار نہیں کرتے۔''

''وہ بھی یقیناً تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے ...... تم چلی جاؤ واپس۔''

''نہیں یار میں اب ان کے گھر نہیں جاؤں گی بلکہ میں اب بڑے والے گھر جاؤں گی ...... یار ایسا کرو کہ مجھے تم کوچ میں بٹھا دو میں آگے چلی جاؤں گی۔'' وہ ضدی بچے کی طرح بولی

''اکیلے؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ہاں ......!'' وہ اٹل لہجے میں بولی

''ہوں ......'' اس نے گردن ہلائی۔

''اچھا تم ذرا فریش ہو جاؤ۔ اوکے پھر تمہیں چھوڑ آتی ہوں ......'' وہ کہہ کر اس کے لیے کچھ لانے کو چلی گئی۔

وہ آئی تو اروی نہیں تھی اس کی نظر سیل پر پڑی اس نے جلدی سے آن کیا اور نمبر تلاش کرنے لگی۔

☆......☆......☆

''یا خدا، کیا کروں؟'' وہ پچھلے دو گھنٹوں سے خوار ہو رہا تھا۔ مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ آخر کو اس نے گھر فون کیا۔

''کیا حال ہے ریحان تمہارا؟'' اس کی آواز سن کر وہ بولا۔

''ٹھیک ہوں بھائی آپ سناؤ' اروی کیسی ہے؟'' اسے حیان کے فون پر حیرانی ہوئی کیونکہ وہ خود کبھی فون نہیں کرتا تھا ...... مگر ظاہر نہیں کیا۔

''کئی دنوں سے بات ہی نہیں ہوئی اروی سے ہماری۔'' وہ بولا۔

اس کے دل میں امید کا آخری دیپ بھی بجھ گیا مطلب وہ وہاں بھی نہیں ہے۔

''ہیلو، ہیلو، بھائی ...... ریحان دوسری طرف تھا مگر اس نے فون بند کر دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' فائقہ نے پوچھا۔

''حیان بھائی کا تھا ...... وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔

'اچھا واقعی اروی سے بات ہوئی ...... میں ملی بھی نہیں اس سے۔ شادی کے بعد بس فون پر ہی بات ہوئی تھی۔'' وہ پر جوش تھی۔

''نہیں شاید فون کٹ گیا تھا'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ ...... وہ آ رہے ہیں نا منگنی پر؟''

''پتہ نہیں حیان بھائی سے میری ٹھیک سے بات نہیں ہوئی ہے۔''

''او کے ٹھیک ہے!''

''چلو پھر چلتے ہیں سارے ڈھولکی لے کر بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی چلتے ہیں۔'' وہ کہہ کر اندر چلی گئی جہاں سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔

''بھئی ٹھیک سے گانا گاؤ تم سب ابھی تک ایک بھی ڈھنگ کا گانا نہیں گایا گیا تم لوگوں سے۔'' شائزے چمچ بجاتے بجاتے رک گئی۔

سارے ہی ہنس دیے۔

''تم ٹیپو خراب کر دیتی ہو بجاتے بجاتے رک جاتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ ٹھیک سے گاؤ۔'' سائرہ کو غصہ آ گیا کیونکہ یہ تیسری دفعہ ہوا تھا۔

''ہاں نا تو وہ گانے گاؤ نا جو مجھے بھی آتے ہیں۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''چلو جی یہ کیا بات ہوئی بھلا۔'' سحرش نے کہا۔ ''رہنے دیں اسے بھابھی ...... پھپھو آئیں ہم اپنا ہی گانا گاتے ہیں۔''

''ہاں بھئی تم رہنے دو یہ سب میں بجاتی ہوں چمچ۔'' فائقہ نے چمچ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''ہاں بجاؤ تم خود ہی مجھے بھی نہیں بجانا۔'' وہ غصے سے پیچھے ہو گئی۔

سب ہنس دیے ...... گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ عثمان کی منگنی اسکی خالہ زاد سے ہو رہی تھی

اسی لیے سارے جمع تھے اور آج عالیہ چچی نے خصوصی طور پر مدعو کیا تھا سب کو ڈھولکی کے لیے اسی لیے سارے موجود تھے۔

☆......☆......☆

''اپنا خیال رکھنا اروی اور پہنچ کر فون ضرور کر دینا۔'' صائمہ اسے چھوڑنے خود آئی تھی۔

''ہاں ضرور اور تھینک یو سو مچ! سب چیزوں کے لیے'' وہ اسے گلے مل کر بولی۔

''چل اپنا خیال رکھیں۔'' وہ مسکرائی

''ہوں......'' اروی نے کہا اور بس میں بیٹھ گئی۔ بس روانہ ہوگئی۔

صائمہ واپس گاڑی میں آئی اور فون تلاش کرنے لگی۔

اف لگتا ہے گھر بھول آئی ہوں۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔

گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے فون اٹھایا اور نمبر ملایا۔

فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس کا ارادہ پولیس اسٹیشن جانے کا تھا وہ رکا اور unknoun نمبر دیکھا۔

''یہ کس کا ہے؟'' پھر بھی فون کان سے لگایا

''ہیلو......'' وہ بولا۔

''حیان...... حیان فاروقی!'' دوسری طرف سے لڑکی کی آواز تھی جو شاید کنفرم کرنا چاہتی تھی کہ فون اٹھانے والا حیان ہی ہے۔

''جی بول رہا ہوں۔'' اس کی آواز میں تھکن واضح تھی۔

''میں صائمہ بات کر رہی ہوں اروی کی دوست۔''

''جی جی...... ہاں کہاں ہے وہ، کیسی ہے؟ آپ کے پاس ہے کیا؟'' امید کی کرن نظر آئی وہ فوراً بول اٹھا۔

اس کی اس بے تابی پر وہ شرمندہ ہوگئی...... واضح پتہ چل رہا تھا کہ وہ کتنا پریشان ہے۔

''سوری سر! وہ ٹھیک ہے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''کہاں؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''بس میں...... وہ اسلام آباد جا رہی ہے۔''

''اوہ...... اوکے تھینک یو سو مچ صائمہ۔ یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ وہ واقعی اس کا شکر گزار تھا اس نے گاڑی کا رخ موٹروے کی طرف کر لیا۔

☆......☆......☆

عالیہ چچی کمرے میں آئیں۔ ''مما مما!'' عثمان کتاب رکھ کر بولا۔

''بیٹا یہ سب لوگ تمہاری منگنی کی ڈھولکی بجا رہے ہیں اور تم یہاں بند ہو۔'' وہ ڈھولکی کی آواز کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

''بس سر میں درد تھا اسی لیے آ گیا۔ کام تھوڑا زیادہ تھا نہ آفس میں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا جیسے ٹال رہا ہو۔

''بیٹا تم خوش تو ہو؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''آپ کو کیا لگتا ہے ماما؟'' وہ الٹا ان سے سوال کر بیٹھا۔

''مجھے......'' وہ رک گئیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم خود کو خوش ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔'' ان کی آواز نم تھی۔ عثمان کے دل کو کچھ ہوا۔

''نہیں ماما...... ایسا نہیں ہے بالکل بھی۔'' وہ ان کے ہاتھ چوم کر بولا۔

''میں جانتی ہوں بیٹا کہ تم نے زندگی میں پہلی بار اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور مجھے افسوس ہے

سنں کچھ بھی نہیں کرسکی تمہارے لیے۔"
"پلیز ماما...... اپنے آپ کو الزام نہ دیں۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں لڑسکتا ناں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ لیمپ کی مدہم سی روشنی میں وہ واضح طور پر اپنی ماں کی آنکھ میں موجود نمی کو دیکھ سکتا تھا۔ ان کے چہرے پر عجب درد کی کیفیت تھی جیسے احساس ندامت ......اس کا دل اندر سے کٹ گیا اس نے ہمت کر کے کہا "ماما میں ٹھیک ہوں بلکہ مطمئن ہوں اور یہ خوشی سے بڑی بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افشاں ایک اچھی ہمسفر ثابت ہوگی۔" وہ مسکرا دیا۔

انہوں نے بڑھ کر فخر سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ مجھے اپنے بیٹے کی سوچ پر فخر ہے اللہ تمہیں ضرور صبر کا پھل دے گا۔" انہوں نے دل کی گہرائیوں سے اپنے اچھے بیٹے کے لیے دعا کی...... زندگی کی ہر خوشی کے لیے اور ماں کی دعا ہی تو ہے جو سب کچھ کرسکتی ہے کسی جادو کی چھڑی کی طرح۔

"چلو بچوں اب سونے چلے جاؤ...... رات کے بارہ بج رہے ہیں۔" بڑے تایا نے کہا۔

"جی ابو بس جارہے ہیں۔" سائرہ نے ڈھولکی اٹھادی۔ سنبھل پھپھو اور ثمرین پھپھو دونوں چلی گئی تھیں مگر مہوش اور عیشا رک گئی تھیں۔

"مہوش تم میرے ساتھ سوجانا۔ اروی تو ہے نہیں اب اس کمرے میں۔" سائرہ نے اس کی کمی محسوس کی۔

شہلا نے ایسے دیکھا جیسے کڑوا بادام منہ میں آجائے تو چہرے کے زاویہ بدل جاتے ہیں نا...... ہونہہ وہ سر مار کر اٹھ گئیں۔

سائرہ نے محسوس کیا مگر خاموش رہی۔

"آج رات بہت باتیں کریں گے ہم تینوں۔" شانزے مزے سے فائقہ اور عیشاء سے بولی۔

"ہاں بڑے قصے ہیں سنانے کو......" فائقہ نے بھی کہا۔

"یار دل کررہا ہے چائے پینے کا...... ممضو بابا تو سو گئے لگتا ہے۔" فائقہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہاں تو خود بناؤ ہم دونوں کے لیے بھی لیتی آنا۔" عیشاء نے کہا اور فوراً دوڑ گئی کہ کہیں وہ انکار نہ کردے اور اسے بنانی پڑ جائے۔

"یار اتنے دنوں بعد آئی ہوں میں ...... شانزے میری بہن نہیں ہے ......" وہ مسکا لگا کر بولی۔

"نہیں جانو تمہاری بہن ہوں...... کیوں نہیں ہوں بس میری چائے میں چینی ٹھیک سے ڈالنا" وہ اس کی تھوڑی پکڑ کر پیار سے بولی۔

"حد ہے بھئی مجال ہے جو کوئی کام کردے۔"

"کار خیر کرنے جارہی ہو تو اپنے بھائی کو نہ بھولنا۔" ریحان نے ہانک لگائی اور فائقہ نے غصے سے پلٹ کر ریحان کو دیکھا

شانزے اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

"بہتر تھا کہ نام ہی نہ لیتی چائے کا مجھے کیا پتہ تھا دیگ چڑھانی پڑ جائے گی۔" وہ غصے سے سوس پین میں پانی بھر کر بولی۔ پانی رکھ کر وہ باہر آئی۔

اتنے میں وہ باہر آئی اور لائٹس آف کرنے لگی۔ ٹرے کے ساتھ وہ نکلی۔ پیچھے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی کہ صدر دروازہ کھلا۔

"ہیں اس وقت کون جارہا ہے؟" وہ گھڑی دیکھ کر بولی جو 12-45 بجا رہی تھی۔ وہ واپس آئی۔

"تم......اس وقت؟" اروی کو دیکھ کر حیرت کے ساتھ اسے خوشی بھی بہت ہورہی تھی۔

"ہائے اروی تمہیں کتنا یاد کررہی تھی میں۔"

وہ ٹرے رکھ کر اس کی طرف بڑھی اور گلے لگ گئی۔

لائٹس آف تھیں بس لاؤنج میں ایک نائٹ بلب روشن تھا...... جس کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ واضح نہیں تھا اور نہ ہی تاثرات نمایاں تھے۔

''رکو میں لائٹ جلالوں۔'' وہ فوراً بڑھی اور لائٹ آن کی۔

اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ بے ترتیب حلیہ تھا لگتا تھا کئی دن سے کپڑے نہیں بدلے ابھی بھی وہ اسی روز والے جوڑے میں تھی جس میں وہ حیان کے لیے تیار ہوئی تھی۔ بال ایسے تھے جیسے کئی دن سے توجہ کے منتظر ہوں اور آنکھیں رورو کر سوجی ہوئی تھیں۔

''اروئی یار یہ کیا حلیہ ہے اور حیان بھائی کہاں ہیں؟'' فائقہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ''تم، تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں یار ٹھیک ہوں میں!......اور اکیلی آئی ہوں حیان نہیں آئے ساتھ۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولی ''شاید آجائیں وہ بھی......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کیا تم لڑ کر آئی ہو اروئی؟'' وہ پریشان تھی۔

''نہیں......نہیں یار لڑ کر کیوں آؤں گی......بس چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں ناں اس لیے آگئی۔'' وہ زبردستی مسکرائی ''انہوں نے ہی بس میں بٹھایا تھا۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''یار بس طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو جس طرح تھی نا اسی طرح اٹھ کر آگئی۔'' وہ اپنے حلیے کو دیکھ کر بہانہ لگا کر بولی۔

''ہوں مگر اتنی رات کو کیوں؟ آنا تھا تو پہلے آتی ناں۔'' ہم ڈھولکی بجارہے تھے وہ ہنسی۔

''اچھا یار بس ...... راستے میں بس خراب ہوگئی تھی ناں۔'' اس نے پھر سے جھوٹ بولا۔

''ڈھولکی کیوں؟'' وہ موضوع بدل گئی۔

''لو تمہیں پتہ ہی نہیں پرسوں عثمان بھائی کی منگنی ہے بھئی۔''

وہ حیران ہوئی۔ ''اوہ......مبارک ہو بھئی......یاد آیا بتایا تھا مجھے حیان نے۔'' وہ جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔

''خیر مبارک......اچھا تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو جاؤ آرام کرو۔''

''ہوں......'' کہہ کر وہ بڑھنے لگی۔

''حیان بھائی کے روم میں جانا کیونکہ تمہارا کمرہ آل ریڈی فل ہے۔'' وہ اسے چھیڑ کر بولی۔

''کون ہے وہاں؟'' وہ مڑی۔

''سائرہ باجی اور مہ وش ہیں۔'' وہ مسکرائی ''ویسے بھی لڑکیوں کا روم شادی کے بعد بدل جاتا ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولی اور آنکھیں مٹکائیں۔

''ہوں......'' وہ چپ کر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ شدید تھک گئی تھی۔ چند منٹ تک وہ بند دروازے کو گھورتی رہی پھر قدم بڑھائے۔ لائٹ جلانے کے بعد اس نے کمرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔

مسز فاروقی......ایک آہ نکلی۔

☆......☆......☆

''اوئے تم چائے لینے گئی تھیں کہ پائے چڑھادیے تھے جو تمہیں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔'' فائقہ جیسے ہی داخل ہوئی تو عیشا نے چڑھائی کردی۔

''یار وہ اروئی آئی ہے......'' وہ کچھ پریشان سی بولی۔

''کیا؟ اس وقت؟'' عیشا اور شانزے نے بیک وقت کہا۔

''ہاں مجھے بھی عجیب لگا......اور وہ آئی بھی اکیلی ہے...... یہ زیادہ حیرت کی بات ہے۔'' وہ ٹرے بستر پر رکھ کر بولی تو وہ دونوں بھی اچھل کر اس کے قریب ہوگئیں۔

''اس وقت؟ اکیلی۔'' شانزے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہوں!'' اس نے سر ہلایا۔

''یقیناً کچھ ہوا ہے؟'' عیشا نے سوچتے

ہوئے کہا۔
"ہوا ہوگا جھگڑا حیان بھائی سے اور وہ غصے میں آ گئی ہوگی...... یہ حیان بھائی بھی نہ کبھی نہیں بدلیں گے پہلے شزا سے جھگڑے کیے اب بیچاری اروئ کے جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔" شانزے نے غصہ سے کہا۔
"بیچاری اروئ...... عجیب ہی اس کی زندگی ...... مامی کی کڑوی باتوں سے بچی تو بڑے بابا نے حیان بھائی سے شادی کروا ڈالی۔" عیشا نے کہا اور افسوس سے سر ہلایا جبکہ فائقہ خاموشی سے اروئ کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شانزے کو اس کا یوں بولنا بالکل نہ بھایا تھا مگر چونکہ حقیقت تھی تو چپ رہی۔

☆......☆......☆

وہ رات دیر سے گھر پہنچا...... گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ سارے راستے پریشان ہی رہا کہ کہیں گھر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوگیا ہو اس کے اس طرح لوٹنے سے......اور یقیناً بڑے بابا بھی ناراض ہوں گے اور ہونا بھی تھا کیونکہ اس بار غلطی سراسر حیان کی اپنی تھی مگر گھر کی خاموشی اور سکون زدہ ماحول بتا رہے تھے کہ طوفان تھما ہوا ہے۔
اس کا ارادہ سب سے پہلے اروئشہ سے ملنے کا تھا کیونکہ آج وہ اس کی وجہ سے بہت بے چین اور پریشان رہا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھا مگر پھر دروازے پر ہی رک گیا وہ سو رہی ہوگی۔ غصے میں ہے وہ کہیں آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ رات کے اس پہر وہ کوئی بھی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا اسی لیے صبح پر بات ٹال کر وہ پلٹ آیا تھکن کے مارے اس کا برا حال تھا۔ دماغ سوچ سوچ کر شل ہو رہا تھا اس کو اعصاب بہت بھاری لگ رہے تھے گردن کو دباتا ہوا وہ کمرے میں آیا...... اروئ کے پرفیوم کی مخصوص خوشبو نے اسے خوش آمدید کہا۔

یہ پرفیوم؟؟......وہ حیران ہوا کہ یہ خوشبو اس کے کمرے میں کیوں ہے۔ پھر جلدی سے اس نے لائٹ جلائی تو کمرہ روشنی میں نہا گیا اور تاریکی جیسے کہیں دور جا سوئی۔
پہلی نظر اس کی کمرے کے وسط میں موجود بیڈ پر پڑی جہاں اروئ بے خبر سو رہی تھی......اسے دیکھتے ہی ایک عجیب سا سکون اس کے اندر سرایت کر گیا کہ وہ ٹھیک ہے وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔
وہ ابھی بھی اسی جوڑے میں تھی۔ حلیہ اس کا بے حال تھا۔ جیسے کئی دن وہ عذاب میں رہی ہو۔ اس کا حلیہ صاف الفاظ میں اس پر گزرے برے اور کڑے حالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کو عجیب سے ملال نے گھیر لیا بہت زیادتی کر دی میں نے شاید انجانے میں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر موجود بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا چند ثانیے تک وہ اسے دیکھتا رہا "ایک مختلف عورت!" اس نے مسکرا کر کہا اور پھر فریش ہونے کے لیے چل دیا۔
نہا دھو کر تازہ دم ہوا پھر دماغ پر نیند سوار ہونے لگی کیونکہ اب وہ پرسکون ہوگیا تھا لہٰذا بستر پر آیا اور پھر گہری نیند سو گیا۔
وہ صبح اٹھی تو پہلی نظر اس کی حیان پر پڑی۔ وہ کتنا معصوم لگ رہا تھا سوتا ہوا بالکل کسی بچے کی طرح۔ جسے پتہ نہ ہو کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے جسے پتہ نہ ہو کہ دل دکھانا کیا ہے اور منانا کیا ہے، وہ اسے کتنے ہی وقت تک دیکھتی رہی۔
شاید یہ میرا وہم ہے۔ اس کا دل بجھ گیا۔ وہ کیسے آسکتے ہیں یہاں انہیں کیا خبر میری اور نہ ہی فکر دل بھر آیا۔
اسے جھٹکا لگا "یہ...... یہ ہیں یہاں واقعی۔"
وہ فوراً پلٹی اب وہ دوسری طرف منہ کیے سو رہا تھا۔
"یہ کب آئے......؟" اسے شاک لگا۔

دل میں آیا کہ اٹھائے اور سارے حساب ابھی بے باق کردے مگر پھر رک گئی۔
اس نے بیگ سے کپڑے نکالے اور پھر واش روم میں گھس گئی۔
وہ سو کر اٹھا تو فریش تھا اپنے پہلو میں نگاہ دوڑائی تو وہ موجود نہیں تھی۔
''اوہ یہ مجھ سے پہلے اٹھ گئی۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے اپنے بال درست کیے ہاتھ کی انگلیوں سے اور کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا وہ اٹھ کر کھڑکی کے پردے کھسکا چکی تھی جس سے دن کی روشنی نئی امید کی طرح اندر آرہی تھی وہ باہر دیکھ کر مسکرایا۔ باہر ہوا درخت کے ساتھ اٹھکھیلیاں کررہی تھی۔ سورج ابھی اپنا سر اپا ابھار رہا تھا۔ اس کی روشنی کی کرنیں اپنے جوبن پر نہیں آئی تھیں صبح کی ٹھنڈی اور خوشگوار سی ہوا چل رہی تھی وہ مسکراتا رہا باہر دیکھ کر نجانے کتنے عرصے بعد پھر اس نے قدرت کی خوبصورتی کو محسوس کیا تھا۔ وہ ایک وقت میں عاشق ہوا کرتا تھا نیچر کا اس کو قدرتی خوبصورتی سے بیحد لگاؤ تھا۔ اس خوبصورتی کو دیکھنے اور اس سے محظوظ ہونے کے لیے وہ کتنے لمبے لمبے سفر کیا کرتا تھا۔ پھر جیسے سب ختم ہوگیا تھا...... زندگی رک گئی تھی...... اس نے اپنے ہر شوق پر بند باندھ دیے تھے۔ انسان کا اگر دل خوش ہو تو ظاہری حسن قدرتی رنگینی خوبصورت موسم یہ سب اچھا لگتا ہے اور اگر انسان اندر سے دکھی ہو تو ہر چیز بے معنی ہوجاتی ہے۔
اور اب وہ پھر سے محسوس کرنے لگا تھا ان سب کو...... اندر کا غبار اگر ختم ہوجائے تو انسان ہلکا پھلکا ہوجاتا ہے اس نے اپنی زندگی کی کتاب میں شزا کے نام کے اوراق کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ یادوں کی قید سے رہائی پالی تھی اس نے اس لیے آنے والی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار تھا مگر دوسری طرف کے حالات ابھی درست نہیں ہوئے تھے۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ وہ نہا کر نکل آئی چند لمحے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
حیان نے مسکرا کر سلام کیا ''گڈ مارننگ!'' وہ مسکرادیا۔
What so good about this "morning?" ''اس کا انداز بالکل بے لچک تھا۔
''اف یہ ابھی بھی خفا ہے۔'' اس نے سوچا۔
''اروشہ آئینے کے سامنے آئی اور حیان کے عکس کو اس نے آئینے میں دیکھے۔ لمحے بھر کو نظریں چار ہوئیں حیان مسکرادیا جبکہ اس نے نفرت سے آنکھیں پھیر لیں جیسے بات کرنے کا ارادہ ہی نہ رکھتی ہو۔
وہ تیزی سے اپنے بالوں کو بے دردی سے رگڑ کر اپنے غصے کا اظہار کررہی تھی۔ اس کے اطوار دیکھ کر وہ زیر لب مسکرادیا۔
''لگتا ہے محترمہ کو ابھی بھی مجھ پر بہت غصہ ہے۔'' وہ بولا۔
اروشہ نے بالکل نوٹس نہیں لیا اس کے ہاتھ پاؤں مسلسل کام کرنے میں لگے تھے۔ وہ تیزی سے اپنے بالوں کو خشک کرکے کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ بالکل بھی حیان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی
حیان نے بستر چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا...... وہ چلتا ہوا اروشہ کے قریب آیا جو پہلے ہی کھسک جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ کم از کم اپنے دن کا آغاز کسی برے واقعہ سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حیان اس کے روبرو آیا۔
''اروشہ!'' وہ مخاطب ہوا۔ اس کا لہجہ بہت شیریں تھا۔
اروشہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔
''کل کیا بے وقوفی کی تھی تم نے؟'' لہجہ اب بھی ویسا ہی تھا اور آنکھوں میں شرارت تھی...... وہ

ناراض بچے کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

''مجھے جو ٹھیک لگا وہ ہی کیا۔'' وہ بغیر زاویہ بدلے بولی۔

''وہ ٹھیک تھا' یوں بغیر بتائے گھر سے نکل جانا کوئی اطلاع نہیں کرنا۔ اور یہ رات کو ادھر آنا...... اگر کوئی دیکھ لیتا تو فساد برپا ہو چکا ہوتا۔'' اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''وہ بالکل ٹھیک نہیں تھا اروبشہ۔'' وہ ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

''تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی you had to wait for me''

''ایکسیو زمی ...... مسٹر فاروقی۔'' وہ شاکی نگاہیں اٹھا کر حیرت سے پر لہجے میں بولی۔

''مجھے آپ کا انتظار کرنا چاہیے تھا......'' وہ انگلی کا اشارہ بے یقینی سے اپنی طرف کرتے ہوئے بولی ''شاید آپ بھول رہے ہیں مسٹر فاروقی میں نے شاید تین دن آپ کا انتظار کیا تھا۔'' اسے حیان کی اس بے رخی پر شدید غصہ آیا۔

حیان کو اپنے چنے گئے الفاظ کی غلطی پر شرمندگی ہوئی۔ وہ بات بدل کر بولا ''پھر بھی اروبشہ آپ مجھے بتا سکتی تھیں کہ آپ یہاں آنا چاہتی تھیں میں آپ کو خود لے آتا۔''

''میں یہاں نہیں آنا چاہتی تھی' مسٹر فاروقی بلکہ میں آپ کے قفس سے نکلنا چاہتی تھی' وہاں اب میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ضبط سے اس کا گلا بھر گیا۔

''آپ...... آپ......'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم بڑے بابا!'' فائقہ چائے کا کپ اور پانی کا گلاس لے کر ان کے کمرے میں آئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا جانی آؤ آؤ۔'' وہ بڑی مشکلوں سے اٹھے۔

''بڑے بابا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ......'' وہ فکر مندی سے ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ کر بولی۔ وہ کتنے کمزور لگ رہے تھے۔ بیماری کی وجہ سے ان کا جسم کمزور ہو گیا تھا۔ چہرے پر گزشتہ برسوں کی تھکن واضح ہونے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہنے والے انسان تھے۔ چھوٹی موٹی تکلیفوں کو وہ زیادہ سر پر سوار نہیں کرتے تھے مگر اس دفعہ ان کا کمزور اور ضعیف بدن ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اس پر وقت گزرنے کی واضح نشانی موجود تھی کہ اب وہ صحت مند نہیں رہا تھا بلکہ بوڑھے درخت کی جڑوں کی طرح کمزور ہو گیا تھا۔

''نہیں بیٹا دیکھو میں کتنا فٹ ہوں ...... کیا تمہیں نہیں لگتا۔''

وہ جسم کو اکڑا کر بولے جس سے انہیں تکلیف ہوئی مگر ظاہر نہیں کیا۔

فائقہ مسکرادی ''لگتا ہے بڑے بابا...... بالکل لگتا ہے۔''

''اچھا بابا...... اروبشہ آئی ہے'' وہ پر جوش لہجے میں بولی

''اچھا۔'' بوڑھا اور جھریوں سے بھرا چہرہ ایک دم مسکرا اٹھا۔

''حیان بھی ہوگا' چلو پھر میں خود ان سے مل کر آتا ہوں۔ کافی عرصے بعد وہ آئے ہیں......'' وہ بھی اٹھنے لگے۔ ''نہیں بابا آپ رکیں میں بلا لاتی ہوں۔'' فائقہ نے تیزی سے انہیں اٹھنے سے روکا۔

مگر وہ ضدی بچوں کی طرح پھر بھی اپنے من کی کرنا چاہتے تھے وہ ہنستے ہوئے اٹھے ''اب میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں کہ چل پھر نہ سکوں۔'' جیسے وہ اٹھے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا وہ ایک دم بستر پر بیٹھے فائقہ نے تیزی سے پانی پلایا ''بابا آپ ٹھیک تو ہیں نا وہ فکر مندی سے بولی۔

''ہاں! ...... ہاں میں ٹھیک ہوں چلو چلتے ہیں۔'' ذرا ان کی طبیعت سنبھلی تو پھر چلنے کو بیتاب نظر

آئے۔

فائقہ انہیں سہارا دے کر اوپر لائی اور پھر وہ واپس پلٹی۔

''جی ماما آ رہی ہوں.....بڑے بابا! ماما آواز دے رہی ہیں، آپ چلیں میں ان کی بات سن کر آتی ہوں۔''

''ہاں بیٹا.....شکریہ.....اوپر لانے کا۔'' انہوں نے پیار دیا۔

''بڑے بابا آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں ناں۔'' وہ ان کا ہاتھ چوم کر بولی جو سانس اکھڑنے کی وجہ سے لرز رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''آپ..... آپ بہت سخت انسان ہیں حیان.....آپ دوسروں کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے.....شاید آپ کے نزدیک دوسرے انسانوں میں جذبات نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔'' وہ دوبارہ بولی۔

''اروینشہ ایسا نہیں ہے۔'' وہ تڑپ اٹھا۔

''ایسا ہی مسٹر فاروقی بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''سب آپ کے بارے میں بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ ایک بے حس انسان ہیں جسے دوسروں کے جینے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جسے فرق نہیں پڑتا کہ اگلا بندہ اس کی وجہ سے کتنی اذیت اور تکلیف میں ہے میں نے یہ تین دن جس کانٹوں بھری سیج پر گزارے ہیں ناں وہ مجھے ہی پتہ ہے.....ایسا لگتا تھا کہ صحرا جس میں تپتی ریت ہے، ننگے پاؤں بنا کسی سائبان کے بس چلی جا رہی ہوں.....ایسی سمت جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔''

بڑے بابا کے قدم اندر سے آنے والی اروینشہ کی آواز پر تھم گئے۔

''میرا تو کل بھی کوئی مستقبل نہیں تھا کوئی منزل نہیں تھی بس جیسے جا رہی تھی بلا مقصد..... پتہ نہیں کہاں سے آپ میری زندگی میں آئے اور...... اور......'' وہ آگے بول نہیں پائی۔

''دیکھو اروینشہ......'' حیان کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ سارے الفاظ جو اس نے سوچ کر رکھے تھے اس کے دماغ سے بھک سے اڑ گئے۔ اسے اس قسم کے ری ایکشن کی امید نہیں تھی۔ نہیں جانتا تھا کہ اس نے اتنی بری طرح اسے ہرٹ کیا ہے......آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا سا آ گیا وہ اروینشہ کو اسی مقام پر دیکھ رہا تھا جہاں کبھی وہ کھڑا تھا......اور حیان کی جگہ شزا کھڑی تھی۔ وہ بھی ایسے ہی ٹوٹا تھا بالکل ایسے ہی بکھرا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیسے اور کن الفاظ میں اروینشہ کو سمجھائے کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم اس کے لیے جگہ نکال سکتا ہے...... دنیا والوں کے لیے اس کے چھوٹے سے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس نے اس دل میں تھوڑی جگہ بنانے کی کوشش کی ہے خاص اس کے لیے...... یہ سارے الفاظ وہ صرف سوچ سکا مگر لبوں پر اب بھی تالا پڑا تھا۔

اروینشہ نجانے کتنی ساعتوں سے منتظر تھی کہ حیان اس سے معافی مانگے تو وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے مگر وہ خاموش تھا۔

اروینشہ کو اس پر شدید غصہ آیا۔

''مسٹر فاروقی آپ...... آپ نہایت مردہ دل انسان ہیں جس کے ساتھ زندگی گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں۔''

''اروینشہ!!'' وہ بے یقینی سے بولا۔ اس کے الفاظ تھے یا خنجر جو سیدھا اس کے دل میں اتر گئے۔ شدید اذیت کے ساتھ......

وہ غصے سے پلٹی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ جانے بغیر کے دونوں کی گفتگو کسی تیسرے بندے نے بھی سن لی ہے۔

بڑے بابا کے قدم لڑکھڑا گئے...... دیوار کا

سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ زمین بوس ہو جاتے ۔ وہ آہستہ آہستہ شکستہ قدموں سے واپس پلٹ گئے......

دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں پھر باہر نکل گئی...... پیچھے حیان سوچوں کے جال میں الجھ گیا۔ اس نے انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں اور آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا......

''میں مردہ دل انسان ہوں......کیا واقعی میں جذبات کو محسوس کرنے سے قاصر ہو گیا ہوں کیا میں واقعی ایسا ہوں؟'' اروشہ کے الفاظ نے بہت گہرا گھاؤ دیا تھا اسے...... وہ تو معاملات کو سلجھا لینا چاہتا تھا مگر اب حالات شاید اس کے کنٹرول میں نہیں رہے تھے۔

☆......☆......☆

وہ باہر ٹیرس میں آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تا کہ اندر کے غبار کو دبا دے ۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں کسی کو بھنک بھی پڑے کہ ان دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے ۔ وہ خود ہی معاملات کو نمٹا لینا چاہتی تھی۔ اگرچہ ایسا کرنا اسے وبال جان لگ رہا تھا۔

بڑے بابا مشکلوں سے اپنے کمرے میں واپس آئے...... انہیں شدید جھٹکا لگا تھا، ان دونوں کی باتیں سن کر...... ضمیر پر منوں بوجھ آ پڑا تھا۔

''میرے فیصلہ کیسے غلط ہو گیا میرے خدا ......'' انہوں نے اوپر کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا ''میرے خدا تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے بچوں کے لیے نہایت مناسب فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہ دونوں ہی لوگوں کے ڈسے ہوئے تھے میں نے دونوں کو شادی جیسے بندھن میں باندھ دیا...... کہ وہ ایک دوسرے کو سنبھال لیں گے مگر میں غلط تھا...... انہوں نے تو ایک دوسرے کو قبول ہی نہیں کیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی......'' انہیں شدید صدمہ ہوا تھا۔

کھانسی کا شدید دورہ پڑا یہاں تک کہ ان کا سانس بری طرح اکھڑ گیا اور آنکھوں میں پانی آ گیا وہ گہرے سانس کھینچ رہے تھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے سینے میں کسی نے سانس کو زور سے کھینچ لیا ہو وہ سینے پر ہاتھ رکھے سانس لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر سانس نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے گلاس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر...... وہ بستر پر ڈھے گئے......

''ارے تم یہاں کیا کر رہی ہو اروشہ؟'' عثمان اپنے کمرے سے نکلا تو ٹیرس پر ہاتھ باندھے کھڑی اروشہ پر نظر پڑی تو اس کی طرف آ گیا

''کچھ بھی نہیں بس سردیوں کی خوبصورت صبح کو انجوائے کرنے کی کوشش کی اور بس۔'' وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ جما کر بولی۔

''ہوں......اچھی بات ہے مجھے تو خود صبح کی ٹھنڈی ہوا وہ بھی سردیوں کی بہت پسند ہے'' وہ بہت پر زور دے کر بولا...... دونوں مسکرا دیے۔

''بائی دا وے مبارک ہو ...... آپ کی منگنی ہو رہی ہے؟''

عثمان کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی...... جسے اروشہ نے شدت سے محسوس کیا...... آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔

''تھینکس!'' جواب مختصر تھا۔

''کیا آپ خوش نہیں؟'' وہ سنجیدہ ہوئی تبھی ہوا کے جھونکے کی وجہ سے اس کے بال اڑ کر چہرے پر بکھر گئے۔

اس وقت عثمان کا دل شدت سے چاہا کہ کاش وہ حق رکھتا ہوتا ان بالوں پر، اروشہ کی ذات پر کہ وہ ان حسین زلفوں کو اپنی انگلی میں لپیٹ کر خود اس کے صبیح چہرے سے ہٹا سکے جو اس کے چہرے پر بکھر کر شرارت کر رہی تھیں......

''خوش'' اس نے ایک لمبا سانس لیا پھر

توقف سے کہا۔

''خوش ہی ہوں یار آخر کو منگنی ہورہی ہے۔''

وہ مسکرایا...... یا پھر ناکام کوشش کی تھی۔

''اللہ آپ کا جیون ساتھی آپ کی خواہش کے مطابق دے...... جو آپ کو بہت چاہے اور جسے چاہنے کے لیے آپ مجبور ہو جائیں۔'' وہ تہہ دل سے دعا دے کر بولی'' کیونکہ زبردستی کے رشتے پائیدار نہیں ہوتے ...... یہ نبھائے نہیں جاتے بلکہ ڈھونے پڑتے ہیں۔'' آخری جملہ وہ بول نہیں پائی۔

''شکریہ!'' وہ مسکرایا ...... ''ایک بات پوچھوں؟''

''جی ضرور......'' وہ مسکرائی۔

''تم حیان کے ساتھ خوش ہو؟''

''آپ کو نہیں لگتی کیا؟'' وہ لہجے کو ہلکا پھلکا بنا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ پھر مسکرا دی۔

اس کی گہری آنکھوں کی وہ تاب نہ لا سکا اور نظریں پھیر کر بولا

''پتہ نہیں......'' ساتھ ہی کندھے اچکائے

''کیا مطلب؟'' آس پاس گھنٹیاں بجیں...... کچھ غلط ہونے کی...... کہیں میرا بھرم نہ ختم ہو جائے میرے مالک!'' اس نے تہہ دل سے کہا۔

''حیان جیسے بندے کے ساتھ نبھا کرنا ذرا مشکل ہے...... وہ شروع ہی سے موڈی رہا ہے...... لوگوں کے ساتھ زیادہ گھلتا ملتا نہیں ہے۔ اور شزا کے بعد تو جیسے وہ پتھر کا بن گیا ہے۔'' وہ افسوس کرتے ہوئے بولا

''نہیں ایسا نہیں ہے...... وہ اچھے ہیں......''

وہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''او۔ کے اب میں چلتی ہوں۔ تھوڑا کام ہے مجھے۔'' وہ حیان پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے کترا کر نکل گئی۔

عثمان نے ریلنگ پر ہاتھوں کو مضبوطی سے جما لیا اور نیچے گارڈن میں لگے ہوئے ڈھیروں پودوں کو دیکھنے لگا جو ہوا کے ساتھ مستیاں کرنے میں مشغول تھے۔

☆......☆......☆

فائقہ نے دروازے پر دستک دی۔

حیان سر تھامے بیٹھا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اروِیشہ کی غلط فہمی کس طرح ختم کرے وہ کچھ زیادہ ہی ناراض معلوم ہو رہی تھی۔

دوسری دستک ...... اور پھر تیسری دستک ...... فائقہ مسلسل دستک دے رہی تھی۔ حیان نے چڑ کر زور سے کہا۔

''آ جاؤ بھئی کیا مسئلہ ہے؟''

وہ اندر آئی۔ حیان کی سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

''بھائی وہ...... میں تو بڑے بابا کا پوچھنے آئی تھی۔''

''وہ آپ کے پاس آئے تھے ناں......'' میں نے سوچا جا رہی ہوں تو ساتھ ہی لے جاؤں۔''

''کیا؟ کب آئے تھے وہ......'' حیان حیران ہوا۔ ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

''کوئی آدھا گھنٹہ پہلے میں انہیں باہر ہی چھوڑ کر گئی تھی انہیں...... وہ اندر نہیں آئے کیا؟'' وہ بھی حیران ہوئی۔

حیان کو شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

''اف خدایا کہیں بڑے بابا نے سب سن تو نہیں لیا......'' یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا...... اسے آتا دیکھ کر وہ تیزی سے سائیڈ پر ہوئی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے اسے نذیر فاروقی ملے۔ ''حیان کیا ہوا ہے یار کہاں دوڑے جا رہے ہو؟'' وہ اس کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر بولے۔

''بعد میں بات کرتا ہوں چچا'' وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''بڑے بابا'' وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا زمین اس کے قدموں سے سرک گئی۔

بڑے بابا بستر پر گرے ہوئے تھے۔ وہ ان کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''بڑے بابا...... اٹھیں...... پلیز!'' وہ رو پڑا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے جبکہ دوسری طرف بڑے بابا دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر تھے۔ وہ زور سے چلایا ''بڑے بابا اٹھیں ناں دیکھیں آپ کی جان...... آپ کا حیان آیا ہے بڑے بابا پلیز مجھ سے بات کریں......'' وہ انہیں جھنجوڑ رہا تھا۔ اس کا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

اس کی آواز سن کر نذیر فاروقی تیزی سے اندر آئے۔

''بابا...... حیان کیا ہوا ہے انہیں؟'' وہ بھی گھبرا گئے۔

''چچا، بابا مجھ سے بات نہیں کر رہے۔'' وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

وہ ان کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھا ہوا تھا...... اور بار بار ان کے چہرے کو دیوانوں کی طرح چومتا اور ہاتھ پھیر رہا تھا۔

نذیر فاروقی نے تیزی سے سیل فون پر نمبر ڈائل کیا اور باہر نکلے۔

''ناصر...... عثمان، شہزاد'' وہ زور سے باہر آ کر بولے۔

''کیا ہوا ہے بابا کو؟'' شہریار سب سے پہلے ان کی آواز سن کر دوڑا آیا۔

باقی بھی آہستہ آہستہ جمع ہونے لگے۔ ''بابا آپ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

''گاڑی نکالو...... گاڑی نکالو جلدی......'' وہ بولے۔

''ناصر اور عثمان آؤ۔ بابا...... بابا کی طبیعت بہت خراب ہے آؤ۔''

''کیا ؟ بابا......'' اروی پاگلوں کی طرح کمرے کی طرف دوڑی۔

کمرے کا عجیب منظر تھا۔ حیان بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''بابا مجھ سے بات کریں ناں'' وہ ضدی لہجے میں بول رہا تھا۔

''مسٹر فاروقی!'' ارویشہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی...... اس کے اپنے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے...... دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''کیا ...... کیا ہوا ہے؟ ہچکیوں کے درمیان اس نے پوچھا۔

اتنے میں کمرے میں سب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ گھر کے مرد تیزی سے حرکت میں تھے۔ ''عثمان اٹھاؤ بابا کو۔'' عثمان نے سہارا دیا...... ریحان نے حیان کو سنبھالا۔ ''بھائی پلیز...... وہ......''

''نہیں...... نہیں میں اپنے بابا کو نہیں چھوڑوں گا۔''

''بیٹا بابا کو ڈاکٹر کی طرف لے کر جا رہے ہیں پلیز میرے بچے'' ناصر فاروقی تیزی سے بڑھے اور اسے ہٹایا۔

سبھی جانتے تھے کہ حیان بابا کے سب سے نزدیک ہے۔ وہ کتنی شدت سے انہیں چاہتا ہے اس کا احساس سب کو ہو رہا تھا۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر پاگل ہوئے جا رہا تھا۔

عثمان شہزاد اور نذیر نے انہیں سنبھالا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے۔

''میں بھی جاؤں گا......'' حیان تیزی سے بیڈ سے اٹھا...... اور کمرے سے نکل گیا۔

''دیکھو ذرا بے وقوفوں کی طرح انہیں لیے بیٹھا رہا، دس منٹ یہ نہ ہوا کہ دماغ سے کام لے اور

ایمبولنس کو فون کرے۔'' شہلا نے زور سے سر مارا۔

''حد ہے امی آپ کی...... آپ کو اس وقت بھی ایسی باتیں سوچ رہی ہیں۔'' سائرہ ناگواری سے بولی۔ ''ان کی حالت نہیں دیکھی کیا آپ نے؟ ......ان کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ کتنے برے حال میں تھے وہ۔'' وہ بولی

''رہنے دو بی بی...... عقل مند انسان وہ ہے جو موقع کی مناسبت سے کام کرے خود کو بڑا عقلمند گردانتا ہے وہ...... ہونہہ......''

''امی آپ سے بحث بالکل لاحاصل ہے۔ کاش کہ آپ کے پاس احساس نامی کوئی چیز ہوتی۔'' سائرہ نے کہا اور اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔

''باجی کیا ہوا ہے بڑے بابا کو؟'' مہوش نے پوچھا۔

''پتہ نہیں......'' اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''فائقہ تم بڑے بابا کے پاس گئی تھیں ناں صبح؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''جی ماما میں گئی تھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی صبح ہی۔''

''تو بتانا تھا بیٹا صبح ہی ڈاکٹر کو بلا لیتے......'' وہ خفا ہوئیں۔

''ارے ماما...... مجھے پتہ ہے لیکن میں نے انہیں کہا تھا وہ بولے کہ میں ٹھیک ہوں بس کھانسی ہے۔'' پھر میں انہیں اوپر چھوڑنے بھی گئی تھی۔

فائقہ، عالیہ، مہوش اور سائرہ لاؤنج میں بیٹھے تھے جبکہ شہلا اور شانزے کچن میں تھیں۔

''ارے انہیں اوپر جانے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ اور اوپر سے تم بے وقوف انہیں اتنی ٹھنڈ میں اوپر لے گئیں جبکہ ان کی طبیعت بھی ناساز تھی۔'' مہوش نے افسوس سے کہا۔

''وہ حیان بھائی سے ملنا چاہتے تھے وہ بھی خود جا کر۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''چلو بس اب دعا کرو کہ سب خیر خیریت رہے...... اللہ بابا کو حفظ و امان میں رکھے۔'' عالیہ چچی نے دعا کی۔

سب نے اکٹھے آمین کہا۔

''ارے اروی کہاں ہے کسی نے دیکھا ہے؟'' سحرش بھابی، اوپر سے سوئیٹر پہن کر نیچے آئیں۔

''نہیں بھابھی پتہ نہیں۔'' فائقہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''ویسے یہ لوگ کب آئے تھے؟''

''پتہ نہیں...... رات کو اروشہ تو اکیلے ہی آئی تھی بارہ بجے کے بعد حیان بھائی تو نہیں آئے تھے۔'' فائقہ کو یاد آیا۔

''اچھا!!'' سائرہ نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی ورنہ حیان صبح ہی صبح کہاں سے آتا؟'' مہوش نے کہا۔

''نہیں یار وہ اکیلی ہی تھی...... حیان بھائی نہیں تھے'' اس نے دل میں کہا۔ میں خاموش رہی ...... یہ مناسب نہیں ہے بات کا۔

اروشہ بڑے بابا کے کمرے میں مصلیٰ بچھائے زار و قطار رو رو کر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے بڑے بابا کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی ''یا خدا...... تو نے بابا کو مجھ سے چھین لیا ہے لیکن اب میرے بڑے بابا کو مجھ سے نہ چھیننا......'' وہ اتنی زور زور سے رو رہی تھی کہ ہچکیوں کے باعث پورا جسم لرز رہا تھا...... وہ مسلسل سجدے میں گری ہوئی تھی اور روئے چلی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

سحرش نے فون کیا شہریار کو...... گھر میں سبھی بہت پریشان تھے۔ خیریت معلوم کرنے کو شہلا چچی نے ہی کہا تھا۔ اسی لیے سحرش نے کال کی۔

''ہیلو شہریار...... کیسے ہیں بابا؟'' وہ فون

ریسیو ہوتے ہی تیزی سے بولی۔
''بس دعا کرو...... بابا ٹھیک نہیں ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔
سحرش کا منہ لٹک گیا ''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' وہ بولی۔
''نہیں...... فی الحال تو نہیں بس تم سب دعا کرو...... آگے اللہ کی مرضی'' رابطہ منقطع ہوا۔
''کیا ہوا ہے بھابھی؟ کیا کہا ہے بھائی نے'' سائرہ نے سحرش کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بولی۔
''بڑے بابا ٹھیک نہیں ہیں'' وہ صوفے پر بیٹھ کر بولی۔
''الٰہی خیر......'' عالیہ چچی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''اللہ انہیں صحت عطا کرے اور وہ خیر عافیت سے واپس لوٹ آئیں۔'' انہوں نے دعا کی۔
''آمین۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔
دوپہر کا ایک بجنے کو تھا اور گھر میں عجب افسوس بھری فضاؤں نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ بھرا پرا گھر ہونے کے باوجود ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ گھر کا ہر مکین بس بڑے بابا کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھا بڑے بابا کی ذات اس گھر کی یکجہتی کی نشانی تھی۔ ان ہی کی وجہ سے وہ سب ایک مٹھی کی طرح تھے گھر میں ان کا مکمل ہولڈ تھا...... سب ان کی عزت کرتے تے ان کی ہر بات مانی جاتی تھی مختصر الفاظ میں بڑے بابا کی ذات کو گھر میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔
''بیٹا ذرا اپنی امی کو بھی فون کر دو اور ساتھ ہی ثمرین کو بھی بتا دو کہ بڑے بابا کی طبیعت ناساز ہے'' شہلا چچی نے کہا۔
''رہنے دیں بھابی خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی وہ بچاریاں۔ ابھی انشاء اللہ سب خیریت کی اطلاع آئے گی تو بتا دیں گے...... مجھے لگتا ہے کہ مناسب ہے کہ ابھی نہ بتائیں۔'' عالیہ چچی نے کہا
''جی چچی جان بالکل ٹھیک بات ہے۔'' سائرہ بھی ہمنوا ہوئی۔
''ہوں ٹھیک ہے۔'' شہلا چچی نے بھی ہامی بھری۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر مسلسل اپنی کوشش کر رہے تھے۔ بڑے بابا کو مصنوعی سانس دی جا رہی تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔
باہر کوریڈور میں سبھی مرد موجود تھے۔ جبکہ حیان مسلسل اندر دروازے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازے پر لگے شیشے سے جو خاص طور پر وزیٹرز کے لیے لگایا گیا تھا تا کہ وہ مریض کو باہر سے ہی دیکھ لیں اس پر جما ہوا تھا۔ آنکھیں اور ناک رو رو کر لال ہو چکی تھیں- بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے صرف شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ ہوا ٹھیک ٹھاک سرد تھی جو پسلیوں کے اندر سرایت کرتی جا رہی تھی مگر اسے چنداں احساس نہیں تھا وہ دنیا سے بے خبر بس بابا کو دیکھے جا رہا تھا۔
''بیٹا بیٹھ جاؤ تم پچھلے گھنٹے سے یہاں کھڑے ہو۔'' ناصر فاروقی نے اسے پیار سے ہٹانے کی کوشش کی۔
''نہیں چچا پلیز...... مجھے یہیں رہنے دیں مجھے بابا کو دیکھنا ہے۔'' وہ ضدی بچے کی طرح بولا جو کسی بھی طور پر اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔
''اچھا چلو یہ چائے پی لو......'' انہوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ''پی لو بیٹا...... تمہیں سردی لگ جائے گی ورنہ بیٹا...... تم نے سوئیٹر بھی نہیں پہنا ہوا ہے۔'' وہ اسے چائے تھما رہے تھے۔
وہ مڑا اور کہا ''پلیز چچا مجھے بابا کے پاس چھوڑ دیں...... میں ٹھیک ہوں کچھ نہیں ہو گا مجھے...... پلیز'' وہ التجا کر کے بولا۔ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''او کے!'' وہ بولے اور پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئے۔

وہ پھر دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

ریحان نے سرگوشی کی ''مجھے پتہ نہیں تھا حیان بھائی بابا کو اتنا چاہتے ہیں دیکھیں کیا حال بنا لیا ہے۔'' وہ افسوس سے بولا۔

''ہوں......واقعی'' شہزاد نے بھی تائید کی۔

وہ چاروں دیوار کے ساتھ نصب کرسیوں پر بیٹھے تھے سبھی ڈاکٹرز کا انتظار کر رہے تھے جو مسلسل اندر جدوجہد کر رہے تھے کہ شمشیر فاروقی کی جان بچا سکیں۔

''یا اللہ پلیز......بڑے بابا کو مجھ سے نہ چھیننا پلیز I beg you او'' وہ مسلسل دعا کر رہا تھا۔ جبکہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ نذیر فاروقی اٹھے اور اپنے کندھوں سے شال اتار کر حیان کو اڑھا دی اسے ہوش ہی نہیں تھا وہ بے خبر بس دیکھے جا رہا تھا ''حوصلہ بیٹا......حوصلہ اللہ بہتر کرے گا۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

اتنے میں ڈاکٹر باہر آیا۔

وہ سارے آگے بڑھے۔

''ڈاکٹر......میرے بابا!'' حیان بے چینی سے بولا۔

''وی آر سوری! ہم انہیں بچا نہیں پائے۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

حیان پر یہ الفاظ کسی بم سے کم نہیں تھے۔ وہ بالکل پتھر کا ہو گیا جبکہ سبھی کو شاک لگا۔

وہ تیزی سے اندر بڑھے جہاں نرس بابا کے منہ پر کپڑا لگا رہی تھی۔

''یا خدا یہ کیا ہو گیا......'' نذیر فاروقی ڈھے گئے......شہزاد نے جلدی سے سہارا دیا۔

''بڑے بابا......'' ریحان بڑھا اور ان سے لپٹ گیا۔ حیان کے علاوہ سبھی کمرے میں موجود تھے۔

''بابا......'' حیان کے منہ سے شکستہ الفاظ ادا ہوئے اور وہ کوریڈور میں ہی دوزانو بیٹھتا گیا۔

☆......☆......☆

بڑے بابا کی موت سے شمشیر ولا میں کہرام بپا ہو گیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اروشہ یہ خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ سائرہ نے بڑھ کر اسے سنبھالا اور فائقہ اور سائرہ نے اسے لٹایا۔ پورے خاندان میں شمشیر فاروقی کے جہان فانی سے کوچ کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی اور لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ شمشیر فاروقی نہایت ملنسار انسان تھے اس بات کی گواہ وہاں موجود بھیڑ تھی......شہر بھر سے ان کے ملنے ملانے والے ان کے جنازے میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔

''بابا...... بابا'' سنبل، ثمرین پھپھو دونوں چلائیں جبکہ سائرہ نے سنبل پھپھو کو سنبھالا اور سحرش نے ثمرین کو سنبھالا۔ سنبل پھپھو پر غشی کا دورہ بار بار پڑ رہا تھا۔

''عیشاء......شانزے پھپھو کو اٹھانے میں میری مدد کرو۔'' سائرہ نے کہا۔

اروشہ خاموشی سے بھیڑ سے اٹھی اور بڑے بابا کے کمرے میں آ کر ان کے بستر پر بیٹھ کر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بڑے بابا۔ ایک آہ نکلی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

تدفین کے بعد سارے مرد گھر آ گئے سوائے حیان کے وہ بابا کی قبر پر بیٹھا مسلسل رو رہا تھا۔ آج وہ بالکل بکھر گیا تھا اس کی زندگی کا واحد سہارا اس کی زندگی کا مقصد، مرکز۔ وہ ذات آج منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔

''یار جلدی آ جا تیری بڑی یاد آتی ہے۔'' پاس ہی بڑے بابا کے الفاظ اس کے کان میں گونجے ''بابا......مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے آپ، بابا

اٹھیں ناں مجھ سے بات کریں دیکھیں آپ کا بیٹا آیا ہے۔'' وہ بلک رہا تھا مگر سننے والا اب بالکل بے بس تھا۔ اس کا ناطہ اب اس فانی دنیا اور یہاں کے مکینوں سے نہیں تھا اب تو وہ کسی اور ہی منزل کا راہی تھا۔ لافانی منزل کا...... جس نے لافانی دنیا کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے اس فانی سے سے سارے تعلق توڑ کر...... وہ قبر سے لپٹ گیا۔ قبر کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اس کی شرٹ پر لگ گئی تھی مگر وہ بالکل انجان بس لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھی قبر میں اپنے جان سے پیارے بابا کے ساتھ جا لیٹے......

☆......☆......☆

''یار یہ حیان کہاں ہے؟'' رات کے نو بجے ذرا لوگ واپسی کے لیے اجازت مانگی اور گھر میں رش کم ہوا تو ناصر صاحب کو خیال آیا۔ ''جاؤ دیکھو ذرا۔'' انہوں نے ریحان سے کہا۔

''جی پاپا......'' وہ اٹھ گیا۔

وہ سارے گھر میں دیکھ آیا 'پاپا وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ پریشان تھا۔

''کیا...... گھر پر نہیں ہے پھر کہاں ہے صبح سے اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے'' وہ بھی پریشان ہوئے۔

سارے افراد لاؤنج میں بیٹھے تھے سب غمگین تھے۔ آخر کو بڑے بابا سے دائمی جدائی کا غم بڑا ہی بہت تھا۔

''پاپا وہ قبرستان سے تو آیا تھا ناں؟'' عثمان کو خیال آیا۔

''فون کرواسے فوراً'' انہوں نے کہا۔

فون مسلسل بج رہا تھا مگر وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔

''جاؤ تم دونوں...... عثمان اور شہر یار دیکھ کر آؤ قبرستان اسے'' نذیر فاروقی نے تشویش سے کہا۔

''حد ہے بھئی اس لڑکے کی تو...... دیکھ نہیں رہا کہ ہم ویسے ہی پریشان ہیں مگر اسے ہماری فکر ہی کہاں ہے؟'' شہلا چچی نے غصے سے کہا اور اٹھ گئیں

☆......☆......☆

''عثمان تم رکو میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' شہر یار نے عثمان کو گاڑی میں رکنے کا کہا اور خود قبرستان میں داخل ہوا۔

وہ قبر پر پہنچا تو دیکھا کہ حیان قبر سے لپٹا رو رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''حیان...... حیان! میرے بھائی اٹھ......'' وہ اسے شانوں سے تھام کر بولا۔

''نہیں پلیز مجھے بابا کے پاس رہنے دو۔ پلیز۔'' وہ قبر سے لپٹ کر بولا۔

''یار تم بابا کو تکلیف دے رہے ہو...... دیکھو انہیں تکلیف نہ دو۔''

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا ''چلو اٹھو میرے بھائی جانے والوں کے ساتھ ہم جا نہیں سکتے۔ چلو اٹھو شاباش!'' وہ اسے بچوں کی طرح منا رہا تھا۔

وہ اٹھا اور خاموشی کے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑا۔

شہر یار اسے سہارا دے کر اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے مٹی سے اٹے تھے۔ شانوں پر موجود چادر آدھی سے زیادہ زمین پر تھی۔

نذیر صاحب آگے تیزی سے بڑھے اور اسے خود میں بھینچ لیا ''میرا بیٹا، کیا حال بنا لیا ہے تم نے۔'' جبکہ دوسری طرف بالکل بے حسی طاری تھی۔

گھر کے سبھی افراد یہاں تک کہ شہلا چچی کو بھی اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔

''جاؤ بیٹا اسے اوپر لے جاؤ' میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔'' عالیہ چچی نے پیار بھرے لہجے میں کہا جبکہ آنکھوں سے اشکوں کو دوپٹے کے پلو میں جذب کیا۔

''اریشہ تم بھی جاؤ اس کے ساتھ...... انہیں

تمہارے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ پلیز جاؤ۔'' سائرہ نے کہا۔

''جی ہاں وہ خاموشی سے اٹھی اسے پتہ تھا کہ مسٹر فاروقی بابا کے بہت کلوز ہیں مگر اس حد تک اسے بھی اندازہ نہیں تھا بے شک بابا کی جدائی کا بوجھ پہاڑ معلوم ہو رہا تھا مگر مسٹر فاروقی کا تو حال بالکل بے حال ہو گیا تھا۔

''لائیں چچی میں لے جاتی ہوں۔'' وہ دوپٹہ درست کر کے چچی کی طرف بڑھی، جو اوپر جانے لگی تھیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی...... حیان بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھا تھا جبکہ کراؤن پر اس کا سر ٹکا تھا۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے آہستگی سے آگے بڑھی۔

وہ قریب آئی...... کمرے میں صرف ایک لیمپ جو اس کی سائڈ ٹیبل پر پڑا تھا بس وہ روشن تھا۔ قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم تھیں آنسو کی لکیریں اس کے رخساروں پر موجود تھیں۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کیا کہے۔

چند ثانیے بس وہ اسے دیکھتی رہی...... اس پل صرف وہ مسٹر فاروقی سے ہمدردی محسوس کر رہی تھی...... صبح والا غصہ...... کہیں دور جا سویا تھا...... وہ اس کا درد خود اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی اس نے گلا کھنکارا......

''مسٹر فاروقی......'' وہ نرمی سے بولی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ارویشہ کا دل چیر گیا۔

کتنا درد تھا ان آنکھوں میں جیسے کوئی متاع جان کھو دی ہو کتنا کرب تھا۔ اداسی لیے ہوئے وہ آنکھیں اپنا درد خود اپنی زبان سے کہہ رہی تھیں۔

وہ آہستگی سے ساتھ بیٹھی ''یہ آپ کے لیے چچی نے بھجوایا ہے۔''

وہ ٹرے آگے رکھ کر بولی۔

''نہیں چاہیے......'' وہ ہاتھ سے اسے پرے کھسکا کر بولا۔

''پلیز مسٹر فاروق...... بابا کے لیے...... پلیز۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

بابا کے نام پر حیان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے مزاحمت ختم کر دی اور چپ کر کے دودھ کا گلاس تھام لیا۔

اروی نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور الماری کی طرف بڑھی اس کے کپڑے نکالنے کے لیے۔

''مسٹر فاروقی پلیز چینج کر لیں باہر بہت ٹھنڈ ہے اور آپ کے کپڑے ابھی بھی نم ہیں۔'' وہ پاس آ کر بولی۔

''ہوں......'' اس نے کہا اور چپ کر کے اٹھ گیا۔

وہ ہاتھ لے کر نکلا تو زور زور سے چھینکیں آ رہی تھیں۔

وہ چپ کر کے بستر میں لیٹ گیا اس کا سر پہاڑ جیسا بھاری ہو رہا تھا۔ وہ سر مسلنے لگا ''اچھوں'' وہ زور سے چھینکا۔

''مسٹر فاروقی آپ ٹھیک ہیں۔'' ارویشہ کی ابھی آنکھ لگی تھی کہ آنکھ اس کی چھینک سے کھل گئی۔

''ہوں......'' اس نے کہا اور کروٹ بدل لی جبکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆......☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا اسے گھٹن ہونے لگی اسے بابا کی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ایک نظر ارویشہ پر ڈالی اور پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔

دروازہ کھولتے ہی اسے بابا کی خوشبو محسوس ہوئی اسے لگا کہ بابا ابھی بھی اندھیرے کمرے میں لیٹے ہیں۔ اس نے ہاتھ سے سوئچ بورڈ دبایا اور لائٹ جلائی۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا بابا کے بستر پر پہنچا ''بابا...... میرے بابا!'' الفاظ اس کے منہ

سے ادا ہوئے اور آنکھیں بہہ نکلیں۔

''مجھے معاف کر دیں بابا پلیز...... میری وجہ سے ہوا نا یہ سب۔'' لاشعوری طور پر وہ خود کو اس کا ذمہ دار گردان رہا تھا۔ اس کے اندر بہت گھٹن تھی جو کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو زنداں میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ زمین پر ڈھے گیا اور بستر پر ہاتھ رکھ کر سر بستر سے ٹکا کر رونے لگا۔

''بابا نے یقیناً ہماری باتیں سن لی ہوں گی وہ...... وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ بابا مجھے معاف کر دیں پلیز ایک بار صرف ایک بار پکاریں بابا مجھے پلیز دیکھیں آپ کا حیان رو رہا ہے بابا...... آپ کے لیے رو رہا ہے۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ بستر پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور ساتھ میں اشکبار بھی تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پلٹ کر دیکھا...... مسٹر فاروقی...... وہ بستر پر نہیں تھے وہ کمرے سے نکلی گھبرائی سی۔

''کہاں جا رہی ہو اروی؟'' سائرہ ہاتھ میں گلاس تھامے اوپر آ رہی تھی۔

''باجی! وہ مسٹر فاروقی...... آپ نے دیکھا انہیں؟'' وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''نہیں تو...... کہاں ہے حیان؟'' وہ بھی پریشان ہوئی۔

''پتہ نہیں'' اس نے کندھے اچکائے ''کہاں گئے ہوں گے؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

پھر بجلی کی تیزی سے خیال اس کے ذہن میں آیا ''ہاں...... ہاں وہیں ہوں گے۔'' وہ بولی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

''اف اللہ یہ لڑکی بھی ناں......'' اس نے سر مارا اور پانی لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ''یہ پانی دے دوں ان کو پھر جاتی ہوں۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔

وہ جیسے ہی کمرے میں بھاگ کر آئی تو منظر دیکھ کر اس کے قدم تھم گئے۔ عجیب سوگوار ماحول تھا۔ کمرے میں روشنی بہت مدھم تھی۔ بیڈ کے کناروں پر ہاتھ رکھے زمین پر وہ بیٹھا تھا۔ کمرے میں ہچکیوں سے رونے سے مدھم مدھم آواز آ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے آئی اور اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

چند ثانیے وہ خاموش رہی پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''پلیز مسٹر فاروقی حوصلہ کریں۔ آئی نو کہ لوس بہت بڑا ہے ہم سب کے لیے خاص کر آپ کے لیے مگر پھر بھی صبر سے کام لیں۔'' اس نے ہاتھ سے زور ڈالا اس کے کندھے پر......

''اروشہ صبر کیسے کروں میں، آج مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے میرے خدا نے...... دیکھو میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا کر بولا۔ اروشہ نے اسے دیکھا...... بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کپڑے سلوٹوں سے پر تھے اس ہارے ہوئے جواری کی طرح جس نے ایک ہی بازی میں اپنا سب کچھ ہار دیا ہو۔

☆......☆......☆

''عثمان تم نے اروی کو دیکھا ہے وہ نیچے آئی تھی ناں حیان کو دیکھنے وہ کمرے میں نہیں تھا۔''

''اچھا۔ میں باہر سے ہی آ رہا ہوں۔ وہ باہر تو نہیں ہیں۔ چلیں پھر آئیں دونوں دیکھتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ بابا کے کمرے میں ہی ہو گا...... آئیں دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ بولا

''ہاں چلو ویسے بھی آج کل اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے بہت بڑا صدمہ لگا ہے اسے۔'' سائرہ نے افسوس سے کہا۔

''جی ٹھیک کہا۔'' عثمان نے اتفاق کیا۔

☆......☆......☆

اروشہ بھی رو پڑی۔ اس کے ساتھ ''میں سمجھ

سکتی ہوں مسٹر فاروقی جب آپ کا اپنا جس پر آپ کی زندگی منحصر ہو چلا جائے تو بہت...... بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ اسے دیکھ کر کرب سے بولی۔ میں نے بھی جب اپنے بابا کو کھویا تھا تو بہت اذیت ہوئی تھی مجھے۔'' وہ پرویز فاروقی کو یاد کر کے رو دی۔

''اروشہ وہ...... وہ میرے بابا ہی نہیں تھے۔ وہ میرے سب کچھ تھے۔'' میری ماں، میرے باپ، میرے دوست، میرے سب کچھ...... سب کچھ تھے وہ آج میری دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔'' وہ بلک پڑا۔

عثمان اور سائرہ دواز ے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ عثمان نے دروازے کو سرکایا...... سائرہ کی آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔ حیان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''میرے لیے...... میرے لیے اس گھر میں سب کچھ ختم ہو گیا اروشہ میرے یہاں آنے کا مقصد صرف بابا ہوتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے کٹھن ترین دور میں میرا ساتھ دیا جب میں بالکل ناامید ہو چکا تھا ہر طرف مایوسیوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے تب...... تب انہوں نے مجھے سنبھالا...... اب مجھے کون سنبھالے گا؟ اروشہ میرا واحد سہارا تو آج رہا نہیں۔''

''پلیز مسٹر فاروقی۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''ایسا مت کہیں آپ پلیز...... میں ہوں ناں آپ کے ساتھ'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ حیان کا دل مردہ نہیں ہے بس اس نے خول چڑھا رکھا ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے خود کو کسی صورت کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اس میں احساس آج بھی روز روشن کی طرح زندہ ہے اور سانس لے رہا ہے۔ ہاں وقتی طور پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ مردہ دل ہو گیا ہو مگر جس طرح وہ بابا کے لیے رو رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اندر سے کتنا حساس انسان ہے۔

چند ثانیے وہ یوں ہی اسے دیکھے گیا۔ پھر قریب ہوا اور اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا...... اور پھر بلک پڑا۔

باہر سائرہ اور عثمان دونوں کھڑے دیکھ رہے تھے۔

''حیان نے آخر کار اروشہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا ہے وہ چاہتا ہے اسے۔'' سائرہ کے دل میں نجانے یہ خیال کیوں آیا اسے خود بھی سمجھ نہیں آئی بس پل بھر کے لیے دل میں حسد نے جنم لیا اس سے پہلے کہ وہ سر اٹھاتی اس نے اسے دبا دیا اور پھر آہستگی سے پلٹ گئی۔

''پلیز مسٹر فاروقی اب بس کریں...... آپ کتنا روئیں گے؟''

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور ساتھ میں خود بھی رو رہی تھی۔ حیان نے اس کی ٹانگیں مضبوطی سے تھامی ہوئی تھیں اور سر آغوش میں رکھے رو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کا سر سہلا رہی تھی۔

عثمان نے ایک حسرت بھری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر پلٹ گیا۔

☆......☆......☆

کل تک جہاں شمشیر ولا میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں وہاں آج صف ماتم بچھی تھی۔ عثمان کی منگنی کی تقریب کینسل کر دی گئی تھی جہاں اس کی منگنی کا فنکشن تھا وہاں آج بڑے بابا کی رسم قل تھی۔ صبح ہی سے سب تیاریوں میں لگے تھے خاص کر گھر کے مرد...... جنازے میں بہت سے لوگ شرکت کرنے سے محروم رہ گئے تھے...... سو آج ذرا بڑے پیمانے پر لوگوں کی آمد متوقع تھی۔

وہ صبح دیر تک سوتا رہا...... اروشہ نے بھی اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا تھا وہ خاموشی سے اسے سوتا چھوڑ کر نیچے آ گئی تھی۔

رات بھر وہ حیان کا درد بانٹتی رہی تھی ایک

اچھے ساتھی کی طرح۔ کل کو اس پر حیان کے بہت سے راز فاش ہوئے تھے کہ وہ کتنا حساس ہے عام لوگوں کی طرح اسے بھی نرم گرم لگتا ہے۔ بس زندگی نے اس سے کچھ زیادہ ہی سختی کی ہے...... اسی لیے وہ زندگی سے بیزار ہوگیا ہے۔ رات بھر وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر روتا رہا تھا شاید اسے واقعی کسی ساتھی کی ضرورت تھی غم بانٹنے کو۔ نجانے کیوں ارویشہ کو ایسا لگتا تھا کہ اس پر بہت بڑا بوجھ ہے جو وہ بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ روتے 'روتے' وہ ایک دم خاموش ہو جاتا پھر رونے لگتا تھا...... وہ اس کی اس حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ آخر وہ حیان فاروقی ہی تھا۔ وہ ایسی جادوئی کتاب کی مانند تھا جس کو پڑھ کر لگتا کہ سارے منتر ٹوٹنے آ گئے ہیں مگر ایک آدھ منتر کسی عجیب پہیلی کی مانند انسان کو الجھائے رکھتا تھا حیان کی گھٹن ارویشہ کے لیے وہ پہیلی ہی تھی۔

''بیٹا حیان کیسا ہے اب؟'' وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ چونک پڑی۔

''جی چچا جی وہ بہتر ہیں اب سو رہے ہیں۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

''ہوں......'' وہ خاموش ہوئے۔

''بیٹا ذرا حیان کا ٹھیک سے خیال رکھنا، بابا کے جانے کا سب سے زیادہ اثر اس ہی کی ذات کو ہوا ہے۔'' وہ ارویشہ کے سر پر دست شفقت رکھ کر بولے۔

''ہوں!'' اس نے سر کو خم دیا۔

''بابا...... سارے انتظام ہو گئے ہیں آ کر دیکھ لیں۔'' شہریار اندر آ کر بولا۔

''چلو بیٹا......'' وہ اس کے پیچھے چل دیے۔

• ظہر کے بعد فاتحہ وغیرہ کا انتظام تھا اور ایک بج رہا تھا۔ فاتحہ کے لیے لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ لوگ تو ویسے بھی اس ولا میں مدعو تھے آج کے روز بس فرق صرف اتنا تھا کہ یہ مجمع سوگ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

''ارویشہ...... تم یہاں بیٹھی ہو......'' سحرش بھابی اس کے پاس آ کر بولیں۔

''چلو فارغ ہو تو ذرا یہ چادریں ہی میرے ساتھ بچھوا دو۔ عورتوں کے لیے ڈرائنگ روم میں انتظام کرنا ہے۔ آ جاؤ شاباش!'' وہ چادریں اسے تھما کر بولیں۔

''جی بھابی!'' وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

''باجی آپ اپنے آپ کو سنبھالیں...... جانے والوں کے پیچھے صبر کرتے ہیں۔'' عالیہ چچی نے سنبل باجی کو دلاسا دیا۔

''ہائے عالیہ...... لڑکیوں کا میکہ ان کے ماں باپ سے ہی تو آباد ہوتا ہے۔ ماں باپ کی گرم آغوش اور ان کا سہارا ہی تو کسی عورت کو احساس دلاتا ہے کہ اس کے پیچھے اس کا میکہ آباد ہے۔ وہ جب چاہے بے دھڑک آ سکتی ہے۔'' وہ آہ بھر کر بولیں ساتھ ہی آنسو بہہ نکلے۔

''ٹھیک کہتی ہو باجی تم۔'' ثمرین نے بھی نرمی سے آنکھیں پونچھ لیں۔

'باجی آپ کا میکہ خدا سدا آباد رکھے۔ اللہ آپ کے بھائیوں کو صحت دے زندگی دے آپ ایسا کیوں سمجھ رہی ہیں کہ آپ کا میکہ ختم ہو گیا ہے۔'' عالیہ چچی نرمی سے ان کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''بابا کا کھو جانا ہم سب کے لیے کڑا امتحان ہوگا۔ ہم نے ان کے بغیر کبھی جینے کا تصور ہی نہیں کیا ہے مگر اب...... آہ اب تو جینا ہی پڑے گا۔ کائنات کے اصول تو سخت ہیں جسے آنا ہے۔ اسے جانا بھی ہے اور سب اسی بات کے پابند بھی ہیں۔'' عالیہ چچی نے دانائی سے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو تم عالیہ جسے آنا ہے اسے جانا بھی ہے۔ اللہ میرے بابا کی مغفرت فرمائے ان کے درجات بلند کرے انہوں نے ہاتھ اٹھائے۔''

''آمین۔'' ثمرین اور عالیہ بیک وقت بولیں۔

☆......☆......☆

حیان اٹھا تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو جسم نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ سر ایسے ہو رہا تھا جیسے دنیا کا سارا بوجھ اس پر آن پڑا ہو جسم الگ درد کر رہا تھا۔ جوڑ جوڑ چیخ رہا تھا۔

''اف خدایا!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ساتھ ہی چھینکیں شروع ہو گئیں۔ وہ چت لیٹا رہا۔

جاتے وقت جو کھڑکی گارڈن میں کھلتی تھی وہ کھول گئی تھی جہاں سے لوگوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ یونہی چند ثانیے لیٹا رہا پھر اس کے کانوں میں دعا کی آواز آئی۔ کوئی شخص مائیک پر اس کے بابا کی مغفرت کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔

گھٹن آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ دل پر بوجھ پڑ گیا۔ کاش! بابا کاش آپ اوپر نہ آتے...... کاش میری بات سن لیتے...... اتنی جلدی نہ کرتے؟ اس کے اندر غبار بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک بار پھر آنسو اشک بن کر بہہ نکلے اور بالوں میں جذب ہونے لگے۔

وہ ہر دعا پر آمین کہتا اور روتا جاتا۔

اس کی طبیعت کے پیش نظر کسی نے اسے اٹھایا نہیں تھا۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اریشہ بھی مصروفیت کی وجہ سے اوپر نہیں آپائی تھی۔ چند قریبی عزیز اب بھی موجود تھے جبکہ سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے۔

''باجی یہ منحوس ابھی تک ہے یہاں......''

فائزہ خالہ نے شہلا چچی کو اکیلے دیکھا تو آن لیا۔

''رہنے دو فائزہ...... یہ موقع درست نہیں ہے۔'' وہ آگے ہی تھکی ہوئی تھیں لہذا اسے جھاڑ دیا

فائزہ خالہ اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گئیں۔ ہونہہ ......وہ ہنکاری۔

اریشہ کو ذرا فرصت میسر آئی تو پہلا خیال اسے حیان کا آیا۔ وہ آہستگی سے سب کے درمیان سے کھسکی۔

وہ کمرے میں آئی تو وہ چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

''مسٹر فاروقی اٹھ جائیں......شام ڈھل چکی ہے۔'' وہ کمرے میں روشنی کر کے بولی۔

''لائٹس آف کر دو پلیز۔ تکلیف دے رہی ہیں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

وہ چلتے ہوئے اس کے سرہانے آئی۔ چھینکنے کی وجہ سے ناک لال ہو رہی تھی۔ آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

پلیز اٹھ جائیں مسٹر فاروقی!'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

جیسے ہی اس نے چھوا تو اسے لگا جیسے اس نے تپتی ہوئی بھٹی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

''آپ کو بخار ہے'' وہ گھبرا گئی۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ وہ کہہ کر تیزی سے پلٹی۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔

''انہیں سردی لگ گئی ہے اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اور ہاں ان کی خوراک کا بھی خاص خیال رکھیں۔'' ڈاکٹر ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

''جی ڈاکٹر صاحب!'' وہ دوائیوں کی چٹ تھام کر بولی۔

''آئیں ڈاکٹر صاحب۔'' ریحان ادب سے بولا اور چلا گیا۔

جبکہ اریشہ اس کے لیے کچن میں کھانا لانے چلی گئی۔

☆......☆......☆

''آج تو کافی تھک گئے ہم سب نہیں!'' شانزے نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔

سب لوگ فارغ ہو کر لاؤنج میں آ گئے تھے۔

دونوں پھپھو چلی گئی تھیں۔ ساتھ میں سائرہ

بھی لوٹ گئی تھی اسے بھی یونیورسٹی جانا تھا۔

''ہاں یار واقعی!'' فائقہ نے بھی ٹانگیں سیدھی کیں۔

ماشاء اللہ بڑے بابا کے کتنے جاننے والے تھے ناں مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کتنے لوگ ان کی تعزیت کو آئے تھے۔شانزے نے کہا۔

''ہاں بابا بہت خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔جو بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ بزنس ورلڈ میں ان کا نام ہے اسی لیے وہاں کے بھی بہت لوگ تھے۔''نذیر فاروقی نے افسردگی سے کہا

''رمضو بابا......پلیز چائے ہی پلا دیں۔''

عثمان نے آواز دی۔

''جی صاحب......''رمضو بابا نے جواب دیا۔

''بابا بس میرا کام ہو گیا ہے اب آپ سب کے لیے چائے بنالیں۔'' اروبیشہ نے سوپ پیالے میں ڈالا اور اسے ٹرے میں رکھ کر بولی۔

''جی بی بی جی جیسا آپ کہیں۔''

وہ ٹرے لے کر باہر آئی۔

''کہاں جا رہی ہو تم؟'' وہ لاؤنج میں سے گزرنے لگی تو شہلا چچی نے اسے روک لیا۔

''جی مسٹر فاروقی کے لیے سوپ لے کر جا رہی ہوں۔''وہ بولی

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں ناصر فاروقی نے کہا''جاؤ، جاؤ بیٹا......تم جاؤ۔''شہلا بیگم کو اس طرح اپنے دیور کی گستاخی ایک آنکھ نہ بھائی مگر وقت کی نزاکت کے باعث خاموش رہیں۔

وہ کمرے میں آئی حیان کی نا، نا کے باوجود اسے زبردستی سوپ پلایا اور پھر دوا دی۔وہ اس کی جی جان سے خدمت کر رہی تھی۔یہ وہی اروبیشہ تھی جو کل تک اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور آج داسی بنی اس کی خدمت کر رہی تھی۔کل تک کتنا غصہ تھا اس کے اندر مسٹر فاروقی کے لیے جسے وہ نکالنا چاہتی تھی

مگر آج حالات بالکل مختلف تھے۔

کل تک جسے وہ بے حس، مردہ دل اور نہ جانے کیا کیا سمجھ رہی تھی آج......آج وہ اسے دنیا کا سب سے حساس اور مظلوم انسان لگ رہا تھا جسے سہارے کی اشد ضرورت تھی۔

اور اس بار حیان نے بھی خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا اور یہ وہ ہرگز نہیں چھپا رہا تھا۔وہ تہہ دل سے اروبیشہ کا مشکور تھا جس نے کڑے ترین وقت میں اس کا ساتھ بالکل سائے کی طرح دیا تھا جو اکیلے انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے مگر اپنے ہونے کا احساس نہیں دلاتا بس تاریکی میں چھپ جاتا ہے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے مگر روشنی میں آتے ہی عیاں ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

آج وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔اس لیے وہ اٹھا فریش ہوا اور اپنا سامان پیک کر لیا۔اس سے زیادہ وہ یہاں نہیں رک سکتا تھا جب تک وہ یہاں رہے گا خود کو مجرم اور گناہ گار ہی گردانتا رہے گا۔بابا جان کا خود کو ان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا رہے گا اور یہ بات اس کے لیے جان لیوا تھی۔

وہ ہاتھ میں بیگ تھامے نیچے آیا۔

اسے یوں تک سک سا دیکھ کر سب حیران ہو گئے۔

''بیٹا کہاں جا رہے ہو؟'' وہ سب ناشتے کی میز پر تھے تو ناصر چچا بولے۔

زندگی آہستگی سے اپنی روٹین پر آ رہی تھی اور یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ لوگ جانے والے کو آخر بھول ہی جاتے ہیں اور دوبارہ اپنی زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔

''چچا میں واپس جا رہا ہوں۔'' لہجہ پھر سے بے لچک تھا۔پرانا حیان بولا۔

''مگر بیٹا تمہاری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔'' نذیر فاروقی کھڑے ہوئے اور اس کے پاس آئے۔

''چچا میں ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ پہنچ کر خیریت کی خبر کردوں گا اور پلیز مجھے رکنے کا نہیں کہیے گا کیونکہ میں نہیں رک پاؤں گا۔'' وہ التجائی لہجے میں بولا جیسے وہ یہاں سے فرار چاہتا ہے۔

''ہوں جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ جانتے تھے کہ وہ نہیں سنے گا۔

اروبیشہ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی کل تک وہ بستر سے اٹھ نہیں پار ہا تھا اور اب جانے کو بے تاب تھا ......ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی اس کا بخار چیک کر کے آئی تھی اسے اب بھی بخار تھا مگر وہ کسی طور اپنی بیماری کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس کا آج اسے احساس ہوا تھا۔

وہ اروبیشہ کی طرف پلٹا۔ ''تمہیں چلنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تم یہاں رہ سکتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' بظاہر وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا مگر نجانے کیوں اروبیشہ کو لگا کہ اس کی نگاہیں اور الفاظ ایک سے نہیں ہیں۔ زبان سے وہ اسے کہہ رہا ہے کہ اعتراض نہیں مگر اس کی آنکھیں بول رہی ہیں کہ چلو انکار نہ کرنا چلو میرے ساتھ میں تنہا نہیں لوٹنا چاہتا۔ اب میری ہم سفر نہیں میری ساتھی بن کر چلو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''یہ کیا چل رہا ہے؟'' شانزے نے فائقہ کے کان میں گھس کر کہا۔

''پتہ نہیں شاید محبت......'' شانزے مدہم سے مسکرائی۔

''ہوں ٹھیک ہے میں چل رہی ہوں۔'' وہ ایک دم ٹیبل سے اٹھ کر بولی۔ اروبیشہ نے خاص طور پر حیان کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک کو شدت سے محسوس کیا۔

''بیٹا پہنچ کر خاص طور پر خبر کرنا ورنہ ہمیں فکر لگی رہے گی۔'' نذیر چچا نے پھر سے یاد دہانی کرائی۔

''ضرور......'' وہ بولا پھر خدا حافظ کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

آج انہیں گھر آئے تیسرا دن تھا۔ حیان کی طبیعت اب بھی مکمل طور پر سنبھلی نہیں تھی مگر وہ خود کو بالکل صحت مند ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کرتا تھا۔ اروبیشہ اب بھی اس کا خیال رکھ رہی تھی جسے اسے ایسا کرنے سے روکا نہیں گیا تھا۔

اروبیشہ نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت بے چین ہے کوئی دکھ ہے جو اماوس کی اندھیری رات کی طرح اس کی روح میں اترا ہوا ہے جو اندر ہی اندر اس کا خون چوس رہا ہے وہ راتوں کو اٹھ کر باہر گارڈن میں ٹہلنے لگتا تھا حالانکہ دسمبر کی سردیاں تھیں اور راتیں یخ بستہ سرد ہو جاتی تھیں۔ بارشوں کی وجہ سے فضا میں کافی نمی تھی جو ہواؤں کے ساتھ مل کر کلیجے میں اتر جاتی تھی۔

اب بھی وہ پشمینہ کی چادر کاندھے پر ڈالے باہر کا چکر لگا رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سانس کے اخراج کے ساتھ دھواں اس کے نتھنوں اور منہ سے خارج ہو رہا تھا۔ دھند کی وجہ سے وہ اس کا صرف چہرہ دیکھ پا رہی تھی کیونکہ وہ روشنی میں نظر آرہا تھا۔ حالانکہ باقی جسم دھند میں لپٹا تھا۔ اروبیشہ جب بھی سانس خارج کرتی تب بھاپ کی تہہ شیشے کی کھڑکی پر جم جاتی تھی۔ اور آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔ کچھ دیر اسے یونہی دیکھنے کے بعد وہ باہر آ گئی۔

''مسٹر فاروقی'' وہ اس کے قریب جا کر بولی

''تم اندر جاؤ کافی ٹھنڈ ہے یہاں۔'' جیسے ہی وہ پلٹا اسے دیکھ کر بولا۔

''ٹھنڈ آپ کے لیے بھی اتنی ہی ہے۔'' وہ

''ٹھنڈ آپ کے لیے بھی اتنی ہی ہے۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''ہوں!'' وہ بولا۔

ناکافی روشنی میں وہ بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں گڑھوں میں گری معلوم ہو رہی تھیں سیاہ حلقے بہت واضح ہو رہے تھے جو مسلسل رت جگے کی غمازی کر رہے تھے، شیو بڑھی ہوئی تھی بال آدھے چہرے پر بکھرے تھے اور آدھے پیچھے تھے۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔

''پلیز مسٹر فاروقی دیکھیں مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر بولی کیونکہ وہ کوئی سوئیٹر پہنے بغیر آ گئی تھی۔

حیان نے اس کے چہرے پر دیکھا...... ہرنی سی آنکھیں وہ اسی پر وا کیے تھے اور مسلسل گھور رہی تھی۔ نہ جانے کیا تھا ان آنکھوں میں کہ وہ انکار نہیں کر سکا۔

وہ اندر آئے تو وہ کافی بنانے چلی گئی...... دو گرم کپ کافی کے لے کر وہ کمرے میں آئی تو وہ نائٹ بلب کی روشنی میں بیٹھا تھا۔

''کافی......'' اس نے بھاپ اڑاتا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسلسل کپ سے اٹھتی بھاپ کو گھور رہا تھا جیسے وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھا۔

''مسٹر فاروقی کوئی پریشانی ہے تو پلیز...... یو کین شیئر ود می!'' وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر صداقت سے بولی۔

دوسری طرف خاموشی تھی جو اقرار کی ترجمانی کرتی تھی۔

''پلیز......'' وہ دوبارہ بولی کیونکہ وہ اسے یوں اندر ہی اندر گھٹتے ہوئے اور اندر سے ٹوٹتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بکھر رہا تھا اور یہ اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں اسے احساس ہوا کہ وہ حیان کو کتنا چاہتی تھی وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی...... چاہے وہ اس سے کتنی ہی خفا کیوں نہ ہو...... وہ پھر بھی اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ حیان کے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت کنفیوز تھا ...... ندامت، احساس جرم اسے اندر سے جلا رہا تھا۔

اس نے اروشہ کو دیکھا جو بیتابی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی آنکھوں میں واضح التجا تھی جیسے کہہ رہی ہوں ''اس بار مجھے خود سے دور مت کرو...... مجھے بیگانہ نہ بناؤ۔ دیکھو میں تمہاری اپنی ہوں تم مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا۔ لوٹ آؤ میری طرف، لوٹ آؤ...... اپنا لو مجھے۔ میں کب سے تمہاری منتظر ہوں۔ اپنے کیے پر نادم ہوں...... لوٹ آؤ نا میرے محبوب اپنا لو مجھے۔''

وہ دونوں بنا پلکیں جھپکائے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر حیان نے سر جھکا لیا اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میرے دل پر بہت بوجھ ہے اروی...... بہت بوجھ ہے...... مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟''

''مجھے بتائیں کہ آپ کو کیا پرابلم ہے مسٹر فاروقی پلیز......''

اس نے مختصراً اسے سارا واقعہ بتا دیا۔ یہ سب سن کر تو لمحے بھر کو اروی کے قدموں سے زمین واقعی کھسک گئی۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

''مسٹر فاروقی یہ سب آپ اکیلے سہہ رہے ہیں اتنے دنوں سے...... ایک بار...... ایک بار تو مجھے اپنا سمجھ کر مجھ سے شیئر کرتے۔'' وہ برہم ہوئی۔

''ہو سکتا ہے جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا نہ ہو۔ بڑے بابا نے ہماری لڑائی نہ سنی ہو۔ وہ ویسے ہی پلٹ گئے ہوں۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں اروشہ ایسا نہیں ہوسکتا...... ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ مجھ سے ملنے خاص طور پر اوپر آئیں اور ملے بغیر ہی پلٹ جائیں۔ انہوں نے یقیناً کچھ سنا ہوگا اسی لیے پلٹ گئے...... انہیں میری وجہ سے...... میری وجہ سے دکھ ملا اروشہ...... ان کے حیان نے انہیں دکھ دیا ہے جسے وہ سہہ نہیں پائے اور مجھے سزا دینے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔'' وہ رو پڑا۔

''نہیں حیان آپ نہیں......'' اس نے پہلی بار اسے نام سے پکارا'' کیونکہ آپ نے تو کچھ کہا ہی نہیں تھا...... بول تو میں رہی تھی غصہ تو مجھے تھا آپ پر...... انہوں نے میری باتیں سن لی ہوں گی۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔ ''آپ خود کو ذمہ دار نہ کہیں مسٹر فاروقی بڑے بابا کی موت کی ذمہ دار میں ہوں...... صرف میں۔'' اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا اور بری طرح رو دی۔

حیان نے تڑپ کر اسے دیکھا جو اس کے ضمیر کا بوجھ خود اٹھانے کو بے تاب تھی۔ حیان کو اس پر بہت پیار آیا۔ وہ مڑا اور اسے خود میں بھینچ لیا۔ ''نہیں پلیز اروشہ تم یوں خود کو قصوروار نہ گردانو۔''

ہم دونوں کو بڑے بابا سے بہت محبت ہے اور ہم چاہ کر بھی انہیں دکھ دینے کا سوچ نہیں سکتے۔ یہ ہم دونوں ہی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا ہے۔ ہم سے۔ اب ہمیں رو کر انہیں اور دکھ نہیں دینا ہے...... ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ بڑے بابا نے زندگی میں کوئی فیصلہ بھی غلط نہیں کیا ہے...... انہوں نے ہر ایک کی بھلائی کو پیش نظر رکھ کر ہی فیصلہ کیا ہے۔

انہوں نے یقیناً میرا اور تمہارا اچھا ہی سوچا ہوگا اور مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم ہی میرے لیے بہترین جیون ساتھی ہو۔ بابا کا فیصلہ غلط نہیں تھا...... شاید اگر خود سے بھی ڈھونڈنا بھی چاہتا پھر بھی نہ ڈھونڈ پاتا میں مگر میں شکر گزار رہوں گا بابا کا زندگی بھر کہ انہوں نے تمہاری صورت میں مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔'' وہ بازوؤں کا گھیرا اس کے گرد تنگ کر کے بولا۔

''پلیز! مت رو اروشہ......! مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ آہستگی سے اس کے آنسو پونچھ کر بولا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں مسٹر فاروقی؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔ اسے لگا کہ جیسے اس کی مراد بر آئی ہو۔ اسے منزل مل گئی ہو، کتنا لمبا اور کٹھن انتظار کیا تھا اس نے اس پل کا...... وہ خوشی سے مسکرا دی۔

''ہاں...... بالکل سچ...... تمہیں پتہ نہیں ہے کیا کہ حیان فاروقی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' وہ اکڑ کر بولا اور پھر خود مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

بڑے بابا نے ان کو اٹوٹ بندھن میں باندھا تھا زندگی بھر کے لیے اور آج پھر وہ دونوں انہی کی بدولت نزدیک آئے تھے۔

''جانتے ہیں میں نے کتنا انتظار کیا ہے آپ کا مسٹر فاروقی کہ آپ یہ کہیں کہ آپ مجھے مانتے ہیں، میں آپ کی زندگی میں اہم حیثیت رکھتی ہوں'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔

''ہوں......'' اس نے سر ہلایا اور مسکرا دیا۔ آنکھوں میں موجود نمی خوشی کی چھبک بن کر ابھری۔ میں تمہیں اس دن یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں نے شزا کی ناسور جیسی یادوں کو اپنے ماضی میں ہی دفنا دیا ہے۔

میں نے اپنی زندگی کی کتاب سے وہ صفحے پھاڑ دیے ہیں، جو مجھے اذیت دیتے تھے۔ اس نے مجھے کسی آسیب کی طرح بس میں کر رکھا تھا۔ چاہ کر بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ڈوب جاؤں گا میں اندھیروں میں مگر پھر تم کسی بجلی کی طرح چمکیں اس دن...... اور مجھے جینے کا حوصلہ دیا۔'' وہ جذب سے بولا۔

بن کرسن رہا تھا۔ حیان کے منہ سے نکلے گئے الفاظ پھوار بن کر اس کے من آنگن میں محبت کے پودوں کو جلا بخش رہے تھے۔ اس کے جسم کا پور پور حیان کی محبت، اس کی سچائی کا ترجمان بنا ہوا تھا...... وہ خود کو ساتویں آسمان پر محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے من کا دیوتا جو پوری شان سے اس کے من کے تخت پر براجمان تھا وہ اس کی محبت کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ شانت ہوگئی تھی۔

''پتہ ہے اروی!'' وہ اس کے ہاتھ تھام کو جوش سے بولا ''میں نے جب اپنے بارے میں سوچا تا تب مجھ پر آشکار ہوا کہ لاشعوری طور پر تم میرے ساتھ رہی ہو...... جب جب میں خود کو سوچتا ہوں تب تب میں تمہیں سوچتا ہوں۔''

''ہاں میں نادم ہوں اپنے کیے پر...... میں نے لاپروائی برتی ہے تمہارے معاملے میں۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا...... بس ایک عجیب سی دیوار تھی جو مجھے تم تک آنے نہیں دیتی تھی...... مگر جب تم ایک دم یوں چلی گئیں تو احساس ہوا کہ جب تک تم سامنے ہو میں لاپرواہ رہتا ہوں مگر جب تم نظروں سے اوجھل ہوتی ہو تو میں دیوانہ وار تمہیں تلاش کرتا ہوں۔''

وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا...... اور وہ اسے سن رہی تھی۔

''میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کروں گا کہ میں بدل گیا ہوں۔ مگر ہاں تمہارے لیے میرے دل میں ایک خاص مقام ہے۔ دنیا والوں کی پرواہ حیان فاروقی نے نہ کل کی تھی اور نہ آج کی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں فخر محسوس کرتی ہوں کہ جناب حیان فاروقی نے اس کنیز پر نظر خاص عنایت کی ہے اور اسے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔'' وہ اترا کر بولی اور ہنس دی۔

وہ بھی مسکرا دیا۔

''اوہ پلیز یار اب ایسا بھی نہ کہو۔ کنیز و نیز نہیں ہو تم...... تم ارویشہ حیان فاروقی ہو بلکہ مسز حیان فاروقی'' وہ فخر سے بولا۔ اور یہ بات دنیا کی کوئی چیز بدل نہیں سکتی۔

''بس اِرویشہ...... میرا مان، میرا بھروسہ کبھی ٹوٹنے مت دینا اگر اب یہ ٹوٹا تو حیان مر جائے گا...... پہلے نہ جانے کیسے جی گیا میں اب نہیں جی پاؤں گا مر جاؤں گا۔'' وہ بولا:

ارویشہ مسکرائی۔ اس نے حیان کے ہاتھ تھامے اور محبت سے بولی۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں ثابت کروں گی کہ عورت بے وفا نہیں ہوتی بلکہ اگر وفا کرنے پر آئے تو جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتی وہ...... میں مانتی ہوں شزا جیسی عورتیں بھی اسی دھرتی کا حصہ ہیں مگر ہمارے دین میں حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ جیسی عورتیں بھی ہیں جنہوں نے وفا کی تاریخ رقم کی ہے۔

میں وعدہ کرتی ہوں کہ حیان میں آپ کا مان ہرگز نہیں توڑوں گی۔'' وہ فخر سے بولی۔

''اور ہم دونوں مل کر ثابت کریں گے کہ بڑے بابا کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔''

''انشاللہ۔'' ارویشہ مسکرا دی

حیان نے ارویشہ کا ہاتھ چوم لیا۔

''تھینک یو سو مچ! تم نے مجھے پھر سے جینا سکھا دیا ہے۔ میں احسان مند ہوں۔''

Pleasur is all mine وہ گردن کو خم دے کر بولی۔

پھر دونوں ہی مسکرا دیے۔

دور کہیں آسمانوں میں بڑے بابا بھی مسکرا دیے۔ آخر کو ان کی خواہش بر آئی تھی۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کا سہارا تھے اور یہ ہی وہ چاہتے تھے۔

(ختم شد)

ترتیب: ارم حمید

کس بات پر شکر کروں

کسی نے حکیم بوعلی سینا سے پوچھا۔
''آپ کے دن کیسے گزر رہے ہیں؟''
جواب دیا: ''گناہ گار ہونے کے باوجود اللہ کی نعمتیں مجھ پر برس رہی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کس بات پر اللہ کا شکر ادا کروں، نعمتوں کی کثرت پر یا گناہوں کے درگذر کرنے پر۔

(غزالہ۔بحرین)

بے مثال

☆...... کمال ہوتے ہیں وہ لوگ جو آپ کی آواز سے ہی آپ کی خوشی اور دکھ کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

☆...... اپنے خلاف باتیں خاموشی سے سنتے رہیں جواب دینے کا حق وقت کو سونپ دیں۔

☆...... رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے محبت کا اظہار بہت ضروری ہے۔ انہیں مان دینے کے لیے انہیں مطمئن کرنے کے لیے پھر چاہے وہ اظہار لفظوں سے ہو یا عمل سے۔

(سلمیٰ۔بحرین)

خاندانی تشدد

پاپا جیسے آپ مجھے مارتے ہیں کیا دادا بھی آپ کو اسی طرح مارتے تھے؟

باپ...... ہاں۔
بیٹا: تو پھر یہ بتایئے اس تشدد کا سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا۔

خاندانی تشدد

ایک خان صاحب ہر اتوار کو اپنے دوست کی دعوت کرتا اور اس کو خرگوش کا گوشت پکا کر کھلاتا تھا۔
ایک دن دوست نے کہا کہ تم بہت مزیدار خرگوش پکاتے ہو، کہاں سے لاتے ہو اتنے خرگوش؟
خان صاحب بولے: کہیں سے نہیں، خود ہی آجاتے ہیں میاؤں، میاؤں کرتے۔

(راحیلہ۔لاہور)

تیری سادگی پہ...

ایک دن ایک خان صاحب اپنا سارا سامان لے کر نیوز چینل کے دفتر پہنچ گئے اور کہا۔
''وہ عورت کہاں ہے جو کہتی ہے کہیں جایئے گا نہیں ہمارے ساتھ رہیے گا......'' مڑا ہم اس کے ساتھ رہنے آیا ہے۔

سکھ

کسی کے لیے سکھ ڈھونڈنے والے شخص کو سکھ ایسے ملتا ہے جیسے آسمان سے بارش برستی ہے۔
جب اللہ میرا حال جانتا ہے تو کوئی جانے یا نہ جانے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ٹھوکر

میں نے لوگوں کو نصیحت سے نہیں ٹھوکر سے سبق سیکھتے دیکھا ہے۔ نصیحت اکثر ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے مگر ٹھوکر سیدھی

دل پر لگتی ہے۔

☆☆☆

زِیر نہیں زَبر ہو جا
کیونکہ آگے پیش ہونا ہے
وقت کو پیدا کرنے والے کو وقت دے کر دیکھو
تمہارا وقت بھی بدل جائے گا۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے
تین رشتے بے نقاب ہو جاتے ہیں......
بڑھاپے میں اولاد
مصیبت میں دوست
غربت میں بیوی

بڑے کہہ گئے ہیں جہاں دلوں میں میل، طبیعت میں ضد اور باتوں میں مقابلہ آ جائے تو یہ تینوں جیت جاتے ہیں لیکن رشتے ہار جاتے ہیں۔

(ثمرہ۔ کراچی)

سائل

راز کی بات ہے سائل بظاہر لینے آتا ہے مگر درحقیقت وہ بہت کچھ دے کر جاتا ہے

زندگی کیا ھے ؟

زندگی کو بس اتنا ہی جانا
غم میں اکیلے اور خوشی میں
سارا زمانہ

عجیب لوگ

کچھ لوگوں سے انہی کے لہجے میں بات کر لی جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔

Sorry

ہر غلطی پر Sorry کہنا ٹھیک نہیں ہوتا بعض اوقات اپنے آپ کو ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔

(غزالہ رشید۔ کراچی)

غریب خانہ

ہمارے بابا جی کا حکم تھا کہ اپنے گھر کے لیے غریب خانے کا لفظ کبھی مت استعمال کیا کرو یہ بڑی ہیٹی کی بات ہے کہ آپ اپنے گھر کو غریب خانہ کہیں جس گھر میں اللہ کی رحمتیں ہیں، برکتیں ہیں، اولاد ہے، رزق ہے، روشنی ہے، چھت ہے تو وہ تو رحمت خانہ ہے۔ اشفاق احمد......

(سلمیٰ۔ بحرین)

عشق

کہیں عشق سجدے میں گر گیا
کہیں عشق سجدے سے پھر گیا
کہیں عشق درس وفا بنا
کہیں عشق حسن ادا بنا
کہیں عشق نے سانپ سے ڈسوایا
کہیں عشق نے نماز کو قضا کیا
کہیں عشق سیف خدا بنا
کہیں عشق شیر خدا بنا
کہیں عشق طور پر دیدار ہے
کہیں عشق ذبح کو تیار ہے
کہیں عشق نے بہکا دیا
کہیں عشق نے شاہ مصر بنا دیا
کہیں عشق آنکھوں کا نور ہے
کہیں عشق کوہ طور ہے
کہیں عشق تو ہی تو ہے
کہیں عشق اللہ ہو ہے

صوفیانہ شاعری

مجھے یہ شکوہ کہ تو روبرو کیوں نہیں
اسے یہ مان کے مجھے ڈھونڈ کے مل

☆☆☆

وحدت عشق کا تقاضہ ہے
ہر نظارے میں تو نظر آئے

(رضوانہ علی شاہ)

جلترنگ

1990 میں لڑکیاں ڈرتی تھیں کہ کیسی ساس ملے گی۔

2017ء میں ساس ڈرتی ہیں کہ نجانے بہو کیسی ملے گی۔

☆☆☆

بیگم ICU میں تھی...... شوہر باوجود کوشش کے اپنے آنسو نہیں روک پا رہا تھا۔

ڈاکٹرز سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح خاتون کی جان بچالی جائے مگر کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ ڈاکٹرز کو شک تھا کہ وہ کومے میں جا چکی تھی۔

شوہر نے یہ سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ''ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے میری بیوی کو بچالیں اس کی عمر ابھی صرف 30 سال ہے۔ مجھے اس کے بچوں کو اس کی شدید ضرورت ہے۔''

اچانک معجزہ ہوگیا۔ بے جان جسم میں حرکت ہوئی۔ ای سی جی مشین تیزی سے آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔ اس کے ہونٹ ہلے اور ہلکی سی آواز آئی۔ میں ''29 سال کی ہوں۔''

(سکینہ۔ جھنگ)

علامہ اقبال کہتے ہیں......

نکالا ہم کو جنت سے فریب زندگی دے کر
دیا پھر شوق جنت کیوں، یہ حیرانی نہیں جاتی

(ام ہانی۔ کراچی)

میرے ابو

ابو نے میسیج کیا کہ آج گھر جلدی آجانا۔
میں نے جلدی سے ''او کے جان'' لکھ دیا۔
اب بھائی کا میسیج آیا ہے کہ آج گھر مت آنا۔

ہائے یہ بیویاں

بیویاں دو طرح کی ہوتی ہیں

پہلی:
جو شوہر کی بات سنتی ہیں
اس کے خیالات کو سمجھتی ہیں
اس سے محبت سے پیش آتی ہیں
کبھی بے جا فرمائشیں نہیں کرتیں
شوہر کے غصے کو مسکرا کر جھیلتی ہیں

دوسری:
وہی...... جو سب کے پاس ہیں۔

☆☆☆

شوہر کا بہت خطرناک ایکسیڈنٹ ہوگیا۔

ہوش کھونے سے قبل اس نے بیوی کو فون کرکے اطلاع دی:

بیگم، سبرینہ مجھے اسپتال لے آئی ہے۔ بے شمار ٹیسٹ ہو چکے ہیں اور ڈاکٹرز کہتے ہیں میری حالت نازک ہے میری ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر ہے۔ الٹا ہاتھ ٹوٹ کر لٹک گیا ہے۔ چہرہ زخموں سے بھرا ہوا ہے اور یہ لوگ میری سیدھی ٹانگ بھی کاٹنے والے ہیں۔

بیوی: یہ سبرینہ کون ہے؟

(افشاں۔ یوکے)

محبت

محبت اگر عیب دیکھتی تو
اللہ ہماری طرف دیکھتا ہی نہیں۔

☆☆

چُپ

چپ، سے بڑی بددعا کوئی نہیں ہوتی
جب بندہ بولتا ہے تو قدرت خاموش رہتی ہے
اور جب بندہ خاموش ہو جاتا ہے تو...... قدرت انتقام لیتی ہے۔ اور اس کا انتقام بہت برا ہوتا ہے۔

(سعود خان۔ اٹک)

روزانہ کیجیے

روز 1 سیب...... ڈاکٹر دور
روز 5 بادام...... کینسر دور
روز 1 لیموں...... چربی دور

روز 1 گلاس دودھ...... ہڈیاں مضبوط
روز 12 گلاس پانی...... چہرہ تروتازہ
روز 4 کھجور...... کمزوری دور
روز 5 وقت کی نماز...... ٹنشن دور
روز تلاوتِ قرآن...... سکون ہی سکون

ٹوٹکے

چہرے کی شادابی کے لیے وضو کا پانی
جگر کی طاقت کے لیے تلاوتِ قرآن پاک
صحت وتندرستی کے لیے نماز
خوشی کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر

☆☆☆

I Love you: اللہ سے کہو
I Miss yuo: نماز سے کہو
I hate you: گناہ سے کہو
I belive you: قرآن سے کہو
I Trust yuo: رسولؐ سے کہو
I am muslim: فخر سے کہو

(اسماء۔اسلام آباد)

دیوان غالب

شب کہ ذوق گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخی وحشت سے افسانہ فسون خواب تھا
وہاں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد
ناخن غم یاں سرِ تار نفس مضراب تھا

میرا پیارا بچپن

چھٹی کے دن بھی کوئی یار نہیں آتا
کہ اب وہ بچپن والا اتوار نہیں آتا

(رحمت علی۔کوئٹہ)

خولہ عرفان کی ڈائری سے......

خود فراموشی کو میری قوم کی میرے خدا خود آگاہی سے بدل دے تو بھلا کیا بات ہے۔روشنی غماز کب ہے ...... کہ تو یہ سحر ہے کہ قوم کو یارب

بتادے دن نہیں یہ رات ہے۔ لکھنے سے تاریخ جد کی قد بڑا ہوتا نہیں خاک میں ملتا ہے انسان تو پنپتی ذات ہے جو عمل کے ہم دلوں کی لو ذرا اوپر ہاں میں منزلوں یہ پھر اندھیروں کو سمجھ لو مات ہے۔

شرافت

ہے عجب چیز یہ ''شرافت'' بھی
اس میں ''شر'' بھی ہے اور ''آفت'' بھی

حقیقت

چراغوں سے نہ پوچھو کہ باقی تیل کتنا ہے
ناہی ساعتوں سے یہ پوچھو کہ باقی کھیل کتنا ہے
پوچھو بس کفن میں سوئے ہوئے ان انسانوں سے
عمل ہو زندگی میں تو قبر میں چین کتنا ہے

معصومانہ سوال

ایک مرغی کے بچے نے ماں سے پوچھا
ماں انسان پیدا ہوتے ہی اپنا نام رکھ لیتا ہے،ہم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے؟
ماں نے کہا بیٹا اپنی برادری میں نام مرنے کے بعد رکھا جاتا ہے جیسے چکن تکہ، چکن چلی، چکن تندوری وغیرہ وغیرہ۔

مائیگرین کا علاج

سورۂ واقعہ کی آیت نمبر (۱۹)
روزانہ دن میں ایک بار مندرجہ بالا آیت' سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی پڑھنے سے کبھی مائیگرین کا درد نہیں ہوگا۔انشاءاللہ۔

(کاشف مجیب۔میر پور)

☆☆☆

سارے مسائل کی جڑ ہے کچھ لینا اور کچھ دینا۔
اگر ہم زندگی اس اصول پر گزاریں کہ بری باتیں بھول جائیں اور دکھ دینے والوں کو معاف کردیں تو زندگی بہت خوبصورت ہوجائے۔

(کرم شمس۔ناروے)

زمر نعیم کے قلم سے...

دل اس خیال سے بہل جاتا ہے
کہ... کوئی ایک دن!
ایسا بھی آنے والا ہے کہ...
جب ملے گی اپنے حوالے سے
اک سچی خوشی،
ملیں گی یادیں ہزار
بنیں گی زادِ سفر
زیست کٹ جائے گی اس تصور میں
کہ۔ کچھ تو اپنے حوالے سے اچھا ہے

خود کش

حامد علی سید

عجب وحشت ہے جسم و جاں پہ طاری
مرا سایہ بھی سہما سا ہوا ہے
مرے اطراف میں اک وسوسہ ہے
نہ جانے کب کوئی بارود میں لپٹا ہوا شخص
اچانک آ کے ٹکرائے جائے
مجھ سے

(مرسلہ بلال احمد، کراچی)

میرے بچپن کے دوست پھتے خان بتاتے ہیں کہ ان کے یہاں ایک ملازم تھا جو سوال بہت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اُسے بلایا اور کہا کہ
''ایک گلاس پانی لے آؤ۔''
''کیا پئیں گے؟''
''نہیں! نہاؤں گا۔'' میں نے کہا۔
وہ چلا گیا لیکن جاتے جاتے کئی مرتبہ مُڑ کر مجھے دیکھا۔
جب کچھ دیر ہوگئی اور وہ پانی نہیں لایا تو میں نے اُسے پھر پکارا۔
''میں نے تم سے پانی مانگا تھا۔''
''جی میں رکھ آیا ہوں۔''
''کیا مطلب ہے کہ رکھ آئے ہو، میں یہاں بیٹھا ہوں، تم کہاں رکھ آئے ہو۔''
''جی غسل خانے میں۔ کیا آپ یہاں نہائیں گے؟'' اس نے سوال کیا۔
(ایس ایچ جعفری کی کتاب ''آبشار سکوت'' سے اقتباس: مرسلہ عائشہ سلام، کراچی)

ڈارون کا نظریہ ارتقاء

تمام حیوانات ایک ہی خلیے سے ارتقا کر کے مختلف انواع کی شکل اختیار کر گئے اور خود انسان بھی بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور یہ کہ انسان اور اعلیٰ قسم کے بندر کے درمیان ارتقائی مراحل کے انواع موجود رہے ہیں یہ نظریہ بالکل غلط ہے نیز ڈارون کو وراثتی خصوصیت (جینز) کا علم ہی نہ تھا لیکن جینز کی دریافت کے بعد تو یہ طے ہو گیا کہ ایک نوع کا دوسرے نوع میں منتقل ہونا محال ہو گیا ہے۔ ہر خلیے یعنی نوع حیوان کے خلیے کے اندر ایسے جینز ہیں جو اسے اپنی نوع بدلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے یہ جینز اپنی نوعیت کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں لہٰذا بلی جس خلیے سے پیدا کی گئی ہے وہ بلی ہی رہی ہے اور اس کی صورت نوعیہ میں کسی مرحلے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی کتا کتا رہا ہے۔ بیل بیل رہا ہے، گھوڑا گھوڑا رہا ہے، بندر ہمیشہ بندر رہا ہے اور انسان انسان رہا ہے، جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کے اندر ترقی کرے یا زوال پذیر ہو۔ بہر حال ناممکن ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کو کراس کر کے دوسری نوع میں داخل ہو جائے۔ یہ بات ہے جو ڈارون کے نظریہ کی حقیقت ہی باطل کر رہی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے نظریات گھڑتے ہیں ان پر یقین کرتے ہیں لیکن یہ نظریات کسی دن باطل ہو جاتے ہیں۔
(فی ظلال القرآن ص ۲۹۸ مرسلہ: ریاض زیدی، سکھر)

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

بول میری مچھلی...

ڈاکٹر عامر لیاقت نے بول چینل بھی چھوڑ دیا۔ اختلافات کی اصل وجہ تو کوئی نہیں جانتا مگر

ڈاکٹر صاحب جس طرح شو کرتے تھے لگتا نہیں تھا

کہ وہ کبھی بھی بول چینل کو چھوڑیں گے ویسے ایسا اس وقت بھی لگتا تھا جب وہ جیو پر شو کیا کرتے تھے...... اِس وقت بھی لگتا تھا جب Express پر تھے۔ سنا ہے اس بار اختلافات کی وجہ اردو بولنے والوں کے خلاف ڈی جی رینجرز کی ہرزہ سرائی ہے۔ چلیں کم از کم اس سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ بول فوج کا چینل ہے۔ ہم پاک فوج کو اس قدر بہترین نیوز چینل لانچ کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو صبر ملے دعا گو ہیں۔

عیدی ہی عیدی

عیدالاضحیٰ! پر پاکستانی سنیما کی جانب سے شائقین کے لیے دو بڑی فلمیں پیش کی جارہی ہیں جن کا کافی عرصے سے سب کو انتظار تھا۔ 'نامعلوم افراد 2' اور 'میں پنجاب نہیں جاؤں گی' نامعلوم افراد اس سے پہلے بھی دیکھنے والوں نے بہت پسند کی تھی ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ فلم جو بہت مثبت پیغام بھی دیتی ہے ایسی فلموں کی ضرورت بھی ہے۔ میں پنجاب نہیں جاؤں گی میں ہمایوں سعید' مہوش حیات ہیں امید ہے کہ یہ فلم بھی بڑے پردے کے اعتبار سے بزنس کرے گی ورنہ ہمایوں سعید اور مہوش حیات فلم کے اداکار کم اور ڈرامہ آرٹسٹ زیادہ لگتے ہیں۔ وہ

جوڑی جو فلم بین سمجھتے ہیں کہ ہٹ جوڑی ثابت ہوگی

ان کو کم از کم کچھ عرصے کے لیے ڈراموں میں کام کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں فلمیں کیسا بزنس کرتی ہیں۔

Apple A Day
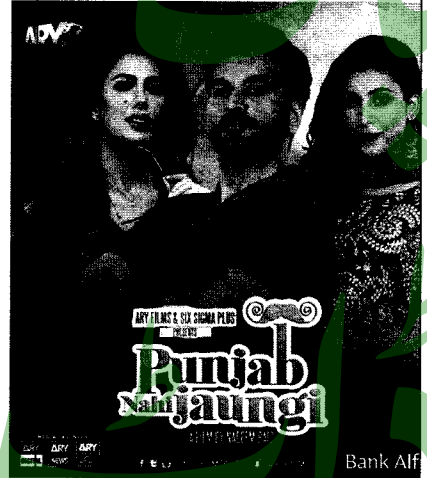
ڈاکٹر شائستہ لودھی کی بھی جیو پر واپسی ہوگئی ہے اور وہ بڑی دھوم دھام سے مارننگ شو پیش کررہی ہیں۔ کچھ عرصے قبل اختلافات کی بنیاد پر انہوں نے بھی چینل کو خدا حافظ کہا تھا مختلف ٹاک شوز میں بیٹھ کر برائی بھی کی مگر اب پھر جیو پر کافی چلبلی حرکات وسکنات کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کو دیکھ کر تو ہم قائل ہوگئے کہ 'بھئی سب سے بڑا روپیہ' اور جیو کے ذمہ داران کے لیے بھی ایک مخلصانہ مشورہ کہ ڈاکٹروں سے دور رہیں شاید میر شکیل الرحمان صاحب کے لیے ہی کہا گیا ہے۔

An Apple A Day Keeps A Doctor Away۔

ہائے تیری یہ شوخیاں

یقین نہیں آتا کہ کیپٹن صفدر فوج میں کپتان تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو شک ہوتا ہے کہ وہ کارٹون کا کردار ہیں جو کیپٹن Planet کے نام سے جانا جاتا

ہے۔ یہ تمہ فوج میں شمولیت کے لیے IQ ٹیسٹ پاس کرنا لازمی ہے مگر کیپٹن صفدر صاحب کا IQ تو

زیرو لگتا ہے۔ کچھ عرصے سے عجیب وغریب بیانات دینے کی وجہ سے خبروں میں رہتے ہیں۔ان کے بقول 1951ء میں جب لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا تب انہیں 9mm کی گولی ماری گئی اور بس ایک گولی سے اُن کا خاتمہ ہوگیا۔اب کیپٹن صاحب کو یہ کیسے بتائیں کہ اس زمانے میں 9mm تھی ہی نہیں' ہمارا تو کیپٹن صفدر کو مشورہ ہے کہ وہ اپنے سیاست دان ہونے کی لاج رکھیں نہ رکھیں اپنے ریٹائرڈ فوجی ہونے کی لاج ضرور رکھیں۔

جیوصاجیو

صبا قمر کے نئے فیشن شوٹ نے تہلکا مچادیا

ہے۔اس سے قبل صبا کی بھارتی فلم ہندی میڈیم نے بے حساب بزنس کر کے نقادوں کو حیران کردیا

جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی اداکار بھارت میں ناکام ہوگئے ہیں۔ باغی میں بھی صبا کا کردار بہت جاندار ہے یہ ڈرامہ دیکھنے والوں میں بہت پسند کیا جارہا ہے اوران سب کے بعد انڈین میگزین کے ٹائٹل پر صبا کی تصویر اور اندر کے صفحات پر موجود فیشن شوٹ نے تو دھما کا ہی کردیا ہے اور پاکستان سے جلنے والے بھارتی اپنی رائے بدلنے کا سوچ رہے ہیں۔ جیوصاجیو۔

☆☆......☆☆

مٹن اسٹو

اجزاء:
مٹن: ایک کلو
پیاز بڑی: چھ عدد
ادرک لہسن: ایک بڑا چمچہ
ثابت لال مرچ: 5 عدد
بڑی الائچی: 3 عدد
دار چینی: 2 عدد
تیز پات: ایک پتہ
نمک: حسبِ ذائقہ
دھنیا (پسا ہوا): ایک چائے کا چمچہ
ہلدی: ایک چٹکی
دہی: ایک کپ
ترکیب:
تمام مسالے کو گوشت میں شامل کر کے تیز آنچ پر 5 سے 7 منٹ بھونیں۔ پھر آنچ دھیمی کر کے گوشت کو گلنے دیں۔ جب گوشت اچھی طرح گل جائے تو ڈیڑھ چمچ مزید تیل ملا کر اچھی طرح بھون لیں۔ گرم گرم نان اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆☆

انڈے آلو کا سالن

اجزاء:
انڈے: 4 عدد ابلے ہوئے
آلو: دو بڑے
پیاز: ایک بڑی (پیس لیں)
نمک: حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ، ہلدی، دھنیا
ترکیب:
انڈے ابال کر ان پر چھری سے ہلکا سا کٹ لگا لیں تاکہ مسالہ اندر تک پہنچ سکے۔ تیل گرم کر کے اس میں پیاز شامل کر لیں اور ہلکی گلابی ہونے پر ثابت گرم مسالہ شامل کر لیں پھر ادرک لہسن پیسٹ، نمک، لال مرچ، دھنیا پاؤڈر، ہلدی اور سفید زیرہ شامل کر کے ایک منٹ تک بھونیں پھر دہی شامل کر کے بھوم لیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو کٹے ہوئے آلو شامل کر کے دو منٹ تک بھونیں پھر پانی ڈال کر آہستہ آنچ پر پکائیں۔ ابال آنے پر ڈھک دیں جب آلو گل جائیں اور شوربہ مناسب گاڑھا ہو جائے تب انڈے شامل کر لیں اور ہری مرچ پھر دو سے تین منٹ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ مزیدار سالن تیار ہے۔

☆☆☆

چکن ٹماٹو چلی

اجزاء:
مرغی: آدھا کلو
ادرک لہسن پیسٹ: ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس: ایک چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ

لال کٹی مرچ
ٹماٹر کا گودا
ہری مرچ
کالی مرچ (ثابت)
ہرا دھنیا
تیل
ترکیب:
تمام مسالے لگا کر مرغی کو ڈھانک کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔
پھر تیل گرم کر کے اس کو اچھی طرح ڈیپ فرائی کرلیں اور ٹشو پیپر پر نکال کر رکھ دیں۔ اب دیگچی میں تیل گرم کریں اس میں کٹی ہوئی ہری مرچ، کالی مرچ، ایک ٹماٹر کا گودا اور چکن ملا کر پانچ منٹ فرائی کریں۔ چکن ٹماٹو چلی تیار ہے' ہرا دھنیا ڈال کر گارنش کریں۔

☆☆☆

Stove Pizza

اجزا:
آٹا
خمیر
چینی
نمک
زیتون کا تیل
گرم پانی
برائے ساس: ادرک، ٹماٹر لہسن، پیاز، چلی ساس، چینی، نمک۔
ترکیب:
سب سے پہلے آٹے کو اچھی طرح گوند کر تین سے چار گھنٹوں کے لیے رکھ دیں تاکہ وہ پھول جائے۔
اب فرائی پین میں زیتون کا تیل گرم کریں۔
اس میں چاپ کر کے ادرک، لہسن اور پیاز ڈالیں۔
گرم ہونے پر چلی ساس ڈال کر بھونیں۔ گاڑھا سا ساس تیار ہوگا اس کو ٹھنڈا کر کے اچھی طرح بلینڈ کرلیں اب مرغی کے گوشت کو کیوبز کی شکل میں کاٹ لیں۔
شملہ مرچ، پیاز، مشروم ٹماٹر سب کو چوکور کاٹ کر الگ رکھ لیں۔ مرغی کو ادراک لہسن، نمک، کالی مرچ ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ اب تمام سبزیاں ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں اور تیز آنچ پر پانچ منٹ بھونیں۔
بڑی دیگچی چولہے پر رکھ کر خوب گرم کرلیں۔
دیگچی کے اندر 4-5 درمیانے سائز کے پتھر بھی رکھ دیں اب پیزا کی روٹی کو بیل کر آملیٹ پر رکھیں اور یہ پلیٹ ان پتھروں پر رکھ کر ڈھانپ دیں آنچ درمیانی رکھیں دس منٹ کے بعد پیزا پلٹ باہر نکال کر روٹی کو پلٹ کر دیکھیں تیار ہے تو پھر اس پر مرغی چیز، ساس اور سبزیاں ڈال کر دوبارہ دیگچی میں رکھ دیں مزید پندرہ منٹ چولہے پر رکھیں پھر اتار لیں مزیدار پیزا تیار ہے۔

☆☆☆

دَم کا قیمہ

اجزاء:
گائے یا بکری کا قیمہ: ایک کلو بنا چربی
پیاز: تین عدد گولڈن براؤن کر کے اخبار پر پھیلا دیں۔
دہی: ایک پیالی
ادرک لہسن پیسٹ: ایک کھانے کا چمچہ
خشخاش: ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ: ثابت چھ عدد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لونگ: چار عدد

بادام: بھنے ہوئے دس عدد

لیموں: چار عدد

ہری مرچ: تین عدد باریک کٹی ہوئی

کچا پپیتہ چھلکے سمیت دو بڑے چمچ

لال مرچ: ایک کھانے کا چمچہ

نمک: حسب ذائقہ

سفید زیرہ: ایک چائے کا چمچ

سیاہ زیرہ: ایک چائے کا چمچ

چھوٹی الائچی: آٹھ عدد

بھنے چنے: دو کھانے کے چمچ

پودینہ: ایک گڈی باریک کٹی ہوئی

تیل: ایک پیالی

ترکیب:

سب سے پہلے تمام خشک مسالے ایک ساتھ پیس لیں۔ ایک دیگچی میں قیمہ، دہی، ادرک، لہسن، لال مرچ، ہری مرچ، پودینہ، کچا پپیتا اور پسے ہوئے سارے مسالے اور گھی ڈال کر قیمہ کو اچھی طرح گوندھ لیں۔ پھر لیموں کا رس ڈال کر چند منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب ہلکی آنچ پر دیگچی چڑھا دیں اور ڈھکن ڈھانپ کر پکنے دیں جب پانی خشک ہو جائے تو ایک کھانے کا چمچ گھی ڈالیں اور کوئلہ دہکا کر رکھ دیں۔ ڈھکن بند کر دیں اور دیگچی کو توے کے اوپر رکھ دیں پانچ منٹ تیز آنچ پھر ہلکی آنچ پر قیمہ پکنے دیں جب قیمے کا رنگ ہلکا براؤن ہو جائے تو قیمہ تیار ہے لیموں والی پیاز، ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ کے ساتھ گارنش کریں۔

☆☆☆

رشین سلاد

اجزاء:

آلو: دو عدد (ابلے ہوئے)

سیب: دو عدد

چکن کیوبز

پنیر: ایک کپ

فریش کریم، دہی، میونیز، ایک ایک کپ

نمک: حسب ذائقہ

ترکیب:

آلو اور سیب چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ چکن کے باریک باریک ریشے کر لیں اب کریم، دہی، میونیز، نمک ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس کے بعد اس میں Beans، آلو، سیب، چکن ڈال کر مکس کر لیں۔ خوب ٹھنڈا کر کے کھائیں

☆☆☆

لوکی کا حلوہ

اجزاء:

لوکی: آدھا کلو

دودھ: ایک کلو

گھی: ایک کپ

چھوٹی الائچی: تین عدد

چینی: ایک کپ

کھویا: ایک کپ

پستہ، بادام

ترکیب:

لوکی کو کدوکش کر لیں۔ فرائی پان میں تیل گرم کریں اور پسی ہوئی الائچی ملا لیں جب خوشبو آنے لگے تب کدوکش کی ہوئی لوکی ملا لیں اب دودھ شامل کریں۔ دھیمی آنچ پر پکائیں اور چمچ چلاتے جائیں جب دودھ مکس ہو جائے تب چینی ملائیں۔ جب چینی کا پانی خشک ہو جائے اور تیل نظر آنے لگے تب کھویا، بادام، پستہ ملا لیں اور دم پر رکھ دیں۔